طلسماتِ فرنگ

سفرنامہ



علی سفیان آفاقی

لندن کا ہیتھرو ائرپورٹ ہمارے لئے کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ ہم بار بار ہیتھرو سے گزرے تھے۔ اس کے بہت سے گوشے ہمارے دیکھے بھالے تھے۔ مگر اس روز ہمیں اندازہ ہوا کہ ہیتھرو تو بہت دور تک پھیلا ہوا ہے اس روز ہماری بعض ایسے علاقوں میں بھی رسائی ہو گئی جہاں ہمارے قدم اس سے پہلے نہیں پہنچ سکے تھے۔ ہم چونکہ ٹرانزٹ میں تھے اس لئے ائرپورٹ کی عمارت کے اندر ہی اندر گھوم رہے تھے۔ یہ اطلاع کہ ہماری ٹورنٹو جانے والی فلائیٹ رخصت ہو چکی ہے۔ ہم سب کے لئے ایک پریشان کن خبر تھی۔ اگلی فلائیٹ میں پورے چوبیس گھنٹے کا وقفہ تھا۔ ہمارے ساتھ ایک دو آدمی نہیں ایک چھوٹا سا قافلہ تھا۔ یہ سب لوگ سامان سے لدے پھندے تھے۔ ان سب کے لئے چوبیس گھنٹے کا طویل وقت گزارنا ایک مسئلہ تھا۔ اس خبر نے سب لوگوں کو خاصا متفکر کر دیا تھا۔ جو پہلی بار سفر کر رہے تھے ان کی پریشانی کی تو کوئی انتہا نہیں تھی۔

ایک صاحب بولے "سر! ہم تو نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ ہمارا تو یہاں لندن میں کوئی جاننے والا بھی نہیں ہے۔ اب ہم پاکستان کیسے واپس جائیں گے؟"

ہم نے کہا "بھائی آپ کو پاکستان نہیں کینیڈا جانا ہے۔ وہاں فلم کا یونٹ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

"مگر ہم کینیڈا کیسے جائیں گے؟ ہمارا تو جہاز ہی نکل گیا۔"

ہم نے کہا "ساری دنیا میں صرف ایک ہی ہوائی جہاز تو نہیں۔ دوسرے ہوائی جہاز بھی ہیں۔"

بولے "مگر ہمارا ٹکٹ تو ایک ہی جہاز کا ہے اور وہ چلا گیا ہے۔"

اب بتائیے۔ اگر ایسے اناڑی ہم سفر ہوں تو قافلے کا سالار کیا کرے؟

بہت سے لوگ ان بچوں کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ جو کراچی سے کوپن ہیگن تک مسلسل روتے رہے تھے۔ "بس نحوست پھیلا دی انہوں نے۔۔۔۔۔ جس سفر کا آغاز ہی رونے دھونے سے ہو وہ بھلا کیسے کامیاب ہو سکتا ہے؟"

"ٹھیک تو ہے۔ ساری گڑبڑ ان کوپن ہیگن کی سواریوں نے پھیلائی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو ہم وقت پر لندن پہنچ جاتے۔"

ہم نے کہا "دیکھو بھائی! بلا وجہ دوسروں کو الزام دینے کی ضرورت نہیں۔ آپ جس ہوائی جہاز میں آئے ہیں اسے ہر صورت میں کوپن ہیگن جانا تھا۔ یہ انٹرنیشنل فلائٹ کا ہوائی جہاز ہے۔ بھاٹی لوہاری سواریاں لے جانے والا تانگہ نہیں ہے کہ جس جگہ کی سواریاں زیادہ ہو گئیں ہمارا تانگہ بھی اس طرف ہی چل پڑا۔ ہوائی جہازوں کے انٹرنیشنل روٹ ہوتے ہیں۔"

کہنے لگے "ہوتے ہوں گے، مگر آپ یہ بتائیں کہ ہمیں تو لندن آنا تھا۔ پھر بلا وجہ کوپن ہیگن کے راستے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا کیا فائدہ جب ہمیں کوپن ہیگن دیکھنے بھی نہیں دیا۔"

خیر وہ سب اپنی جگہ درست تھے۔ مگر ہماری اولین ضرورت قیام و طعام کا بندوبست کرنا تھا۔ لہٰذا ہم نے کہا "اب آپ لوگ اپنا اپنا سامان اٹھائیں اور ہمارے ساتھ آجائیں۔"

"ہم کہاں جائیں گے؟"

"برٹش ائر کے کاؤنٹر پر جا کر کچھ بندوبست کریں گے۔"

"مگر یہاں تو کوئی قلی بھی نظر نہیں آرہا۔"

"سامان آپ لوگوں کو خود اٹھانا پڑے گا۔"

"اوہ مر گئے۔" شاہ جی نے آس پاس دیکھ کر ٹرالی تلاش کرنے کی کوشش کی۔

ہم نے کہا شاہ جی! ٹرالی کی فکر چھوڑ دیں۔ یہاں پر ٹرالی لانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ سامان ہم سب کو خود ہی اٹھانا پڑے گا۔"

ایک صاحب نے مشورہ دیا "ایسا کرتے ہیں کہ سامان یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ ابھی یہ انگریزوں کا ملک ہے۔ یہاں چوری کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

مگر ہمارے گھورنے پر چپ چاپ اپنا اپنا سامان سمیٹ لیا۔ مشکل یہ تھی کہ شوٹنگ کا کچھ سامان بھی ہم لوگوں کے ساتھ تھا، جس کی وجہ سے وزن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ہمارے ساتھ بھی سامان کچھ کم نہیں تھا کیونکہ ایک خاتون اور ایک بچی بھی ہمارے ہمراہ تھیں اور ہماری بیگم نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ عورتوں اور بچوں کا سامان زیادہ ہوتا ہے چنانچہ یہ سامان اٹھانا بھی ہمارے حصے میں آیا۔ ظاہر ہے ہم سب لوگ سامان سے لدے پھندے برٹش ائر کے کاؤنٹر کی تلاش میں چل پڑے۔ فلائیٹ کا وقت گزر چکا تھا۔ اور رات بھی کافی ہو گئی تھی اس لئے ہمیں اندرونی دفتر جانا تھا۔ ہمارا تجربہ کام آیا اور ہم مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے ایک تہہ خانے نما ہال میں پہنچ گئے۔ برٹش ائر کے کاؤنٹر پر ایک موٹے سے صاحب اور ایک سمارٹ سی خوب صورت خاتون موجود تھے اور بالکل فراغت سے تھے۔

ہم نے انہیں صورت حال سے مطلع کیا تو انہوں نے ہمارے ٹکٹ اور پاسپورٹ بہت غور سے دیکھے۔ خاتون سے مشورہ کیا پھر ہم سے مخاطب ہوئے "معاف کیجئے جناب! آپ لوگ کیونکہ پی آئی اے کے مسافر ہیں اس لئے آپ کے قیام کا بندوبست کرنا پی آئی اے کے ذمے ہے۔"

ہم نے کہا "تو پھر پی آئی اے کا دفتر بتا دیجئے۔"

انہوں نے ہمیں پی آئی اے کے دفتر کا راستہ بتا دیا۔ ہم نے اپنے اہلِ قافلہ سے کہا "آپ لوگ اپنا سامان اٹھا کر ہمارے ساتھ آ جایئے۔ آپ کو ہیتھرو ائرپورٹ کی سیر کرا دیں۔"

ائرپورٹ کی سیر کا شوق تو سب کو تھا مگر ایک تو رات بہت گزر چکی تھی۔ اور سب تھکے ہوئے تھے۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ ائرپورٹ پر اتنی رات گئے رونق بھی نہیں تھی۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا ہم ان کے قائد تھے، قافلہ سالار تھے اور ہماری بات مانے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ایک بار پھر ہم مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے ایک اور زیر زمین ہال میں پہنچ گئے۔ ایک کاؤنٹر پر ہمیں پی آئی اے کا نام بھی لکھا ہوا نظر آگیا۔ کاؤنٹر پر پی آئی اے کی سبز یونیفارم میں ملبوس جو گوری چٹی، صحت مند اور خوب صورت خاتون تشریف فرما تھیں ان کے بال سنہرے تھے، آنکھیں نیلی تھیں اور رنگ گورا بھبوکا تھا۔ وجہ یہ تھی

کہ وہ انگریزی میم تھیں۔ جب ان سے بات چیت ہوئی تو ان کے خالص برطانوی لب و لہجے نے ہمارے خیال کی مزید تصدیق کر دی۔ ہم نے اپنے قافلے کو ہال کے ایک کونے میں بیٹھنے کی ہدایت کی اور کاؤنٹر پر پہنچ گئے۔ ان خاتون نے ایک خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ انگریزوں کا یہ طریقہ ہمیں بہت اچھا لگتا ہے کہ وہ ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان میم صاحب ہی کو دیکھ لیجئے۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا وقت تھا ہم سے ان کی شناسائی بھی نہیں تھی۔ پھر بھی نظریں ملتے ہی انہوں نے مسکرانا شروع کر دیا تھا۔

"کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" انہوں نے خندہ پیشانی سے پوچھا۔

ہم نے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بڑی ہمدردی اور توجہ سے ہماری کہانی سنتی رہیں۔ پھر پوچھا "آپ کے ساتھی کہاں ہیں؟"

پارو اور للّی تو ہمارے ساتھ ہی تھیں مگر دوسرے لوگ ہال کے دوسرے کونے میں ستا رہے تھے۔ انہوں نے یہ لمبا چوڑا قافلہ دیکھا تو بولیں۔ ان سب کو ٹھہرانے کا بندوبست کرنا پڑے گا؟"

ہم نے کہا "ظاہر ہے یہ سب اس فلائیٹ پر سفر کرنے والے تھے۔"

انہوں نے ایک لمحے غور کیا پھر ذرا آگے کو جھکیں اور سرگوشی میں کہنے لگیں

"آپ یہ تو جانتے ہوں گے کہ پی آئی اے کی انتظامیہ ان معاملات میں ذرا کنجوس ہے۔"

ہم نے کہا "بہت اچھی طرح جانتے ہیں کیونکہ ان سے ہمارا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔"

وہ بہت زور سے ہنسیں۔ پھر کہنے لگیں "آپ جس مسئلے سے دو چار ہیں اس سے براہ راست میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں آپ کو متعلقہ شخص سے ملوا دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک عقبی دروازے پر گڑاپ سے غائب ہو گئیں۔ چند لمحے بعد نمودار ہوئیں تو ایک افسر نما صاحب ان کے ہمراہ تھے۔ افسر نما سے مراد یہ ہے کہ ہمارے پاکستانی ہم وطن اپنی افسرانہ شان کی وجہ سے ہزاروں میں الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ائرلائن عوامی خدمت کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس شعبے میں افسری کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی۔ مگر وہ پاکستانی ہی کیا جو افسری ظاہر کرنے کا معمولی موقع بھی ہاتھ سے گنوا دے۔ چنانچہ ایک

خالص پاکستانی کی مانند یہ صاحب بھی بڑی شان سے ٹھوڑی اوپر اٹھائے ہماری جانب بڑھے آرہے تھے۔ ان کے تیور دیکھ کر ہم پہلے ہی آنے والی افتاد مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

"فرمایئے؟" انہوں نے اردو میں ہمیں ڈانٹا۔ ڈانٹنے کے لئے کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی لمبا چوڑا فقرہ درکار ہے۔ خاص طور پر ایک پاکستانی افسر تو ان چیزوں کا بالکل محتاج نہیں ہوتا۔ مگر اتفاق سے ہم بھی ایک پاکستانی تھے اور افسر شاہی سے ہمارا روزانہ واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اس لئے دوبدو مقابلے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

ہم نے انہیں ایک بار پھر اپنی کتھا سنائی۔ وہ پیشانی پر بل ڈالے ہوئے بڑی بے زاری اور بے صبری سے سنتے رہے۔ ان کا بس چلتا تو ہماری بات کاٹ دیتے' مگر اخلاق بھی آخر کوئی چیز ہے۔ پھر ہم نے بھی انتہائی مختصر اور موزوں الفاظ میں انہیں یہ داستان سنائی تھی۔ اس لئے مجبور تھے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ سب کچھ سننے کے بعد ڈپٹ کر بولے "تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"وہی جو آپ کو کرنا چاہئے۔" ہم نے عرض کی۔

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ ہم سب کے لئے کسی ہوٹل میں قیام کا بندوبست کر دیجئے۔"

انہوں نے ایک لمحے کے لئے ہمیں گھور کر دیکھا۔ پھر میز کی دراز ایک جھٹکے سے ھولی۔ ہم تو سمجھے کہ شاید ہمیں شوٹ کرنے کے لئے پستول وغیرہ نکال رہے ہیں مگر خیر لزری۔ انہوں نے میز کی دراز میں سے ایک پائپ نکال کر اپنے منہ میں لگایا۔ پتلون کی ب میں سے ایک ماچس تلاش کر کے ایک تیلی جلائی اور پائپ سلگانے کے بعد تیزی سے ـ کرنے لگے۔ جب دو چار گیلن دھواں منہ سے خارج کر چکے تو ازراہ کرم انہوں نے پ منہ سے نکالا اور بھوئیں اونچی کر کے ہم سے یوں خطاب فرمایا "دیکھئے' آپ مجھے ھے لکھے آدمی لگتے ہیں۔"

ہم نے کہا "شکریہ۔ شاید آپ نے کوٹ پتلون سے اندازہ لگا لیا۔ ورنہ ابھی تک نے انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں بولا ہے۔"

بولے "بہرحال' آپ نے خود ہی بتایا ہے کہ آپ لوگوں کو برٹش ائر کی فلائیٹ سے ٹورنٹو جانا تھا جو مس ہو چکی ہے۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ آپ کے قیام وغیرہ کا بندوبست کرنا بھی برٹش ائر کے ذمے ہے۔ یہ تو ایک بچہ بھی جان سکتا ہے۔" ہماری برداشت کا کوٹہ اب ختم ہو رہا تھا۔ ان کی بد مزاجی اور کہاں تک برداشت کرتے۔ اس لئے ہم نے کہا "آپ نے ٹھیک فرمایا' مگر جو بات ایک بچہ جان سکتا ہے' حیرت ہے کہ وہ ایک پی آئی اے کا افسر نہیں جانتا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بنیادی طور پر تو ہم پی آئی اے کے مسافر ہیں۔ ان ٹکٹوں کی رنگت دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ ٹکٹ کراچی سے ٹورنٹو تک کے لئے ہمیں پی آئی اے نے جاری کئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری یہ فلائیٹ مس ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ پی آئی اے کی فلائیٹ لندن دیر سے پہنچی تھی۔ اگر وہ بروقت پہنچ جاتی تو ہماری اگلی فلائیٹ مس نہ ہوتی۔"

انہوں نے پھر پائپ کے کش لینے شروع کر دیئے۔ شاید کوئی مناسب جواب سوچ رہے تھے۔

ہم نے کہا "مزید یہ کہ اب رات کے ڈیڑھ بج چکے ہیں اور ہم ساری رات یہاں بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ اس لئے فوری طور پر ہمیں ہوٹل پہنچانے کا بندوبست کر دیجئے۔"

کہنے لگے "میں کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ میری ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے۔"

"تو پھر آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"بس میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے مڑے ہم نے کہا

"مگر اب آپ نہیں جا سکتے۔ جب تک کہ ہم لوگ یہاں موجود ہیں۔"

"آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟ آپ میرا کیا بگاڑ لیں گے؟"

"میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ جب تک ہم لوگ یہاں موجود ہیں آپ کو بھی ہمارے ساتھ ہی رہنا پڑے گا۔"

"ورنہ آپ کیا کریں گے؟" غصے کے مارے ان کی آواز کانپنے لگی۔

ہم نے کہا "ہم جو کریں گے وہ کل کے اخبار میں شائع ہو جائے گا۔" یہ

نے ہال کے دوسرے گوشے میں منتظر لوگوں کی طرف دیکھا اور انہیں اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ تین چار رضا کار فوری طور پر ہمارے پاس پہنچ گئے۔

افسر صاحب نے قدرے پریشانی سے انہیں دیکھا۔ اس عرصے میں انگریز میم خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جب معاملہ بگڑتے ہوئے پایا تو اس نے اپنے ساتھی سے انگریزی میں پوچھا "کیا مسئلہ ہے؟"

انہوں نے انگریزی میں جواب دیا "یہ لوگ بلا وجہ زبردستی کر رہے ہیں۔"

میم نے ہماری طرف دیکھا اور مسکرائی۔ ہم کو بھی جواب میں مسکرانا پڑا ہماری مسکراہٹ نے جادو کا اثر دکھایا۔ وہ اپنے ساتھی سے کہنے لگی "میری بات سنو۔ تم انہیں ٹکس اپ کیوں نہیں کرتے؟ بلا وجہ بحث کیوں کر رہے ہیں؟"

انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "میری! تم نہیں جانتیں......"

اس نے بات کاٹ کر کہا "میں سب جانتی ہوں۔ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں' یہ ان لوگوں کا حق ہے۔ تمہیں کیا اعتراض ہے۔ انہیں ہوٹل میں ٹھہرانا پی آئی اے کی ذمے داری ہے اور پھر یہ لوگ بہت لمبا سفر کر کے آئے ہیں' تھکے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔"

ایک لمحے کے لئے تو وہ صاحب دم بخود رہ گئے۔ پھر انہوں نے بڑے غصے سے پائپ کے دس بارہ کش لگائے اور بولے "جو تمہارا جی چاہے کرو۔ میں تو آف ڈیوٹی ہوں' گڈ نائٹ۔"

میم نے مسکرا کر کہا "میں تم سے پہلے آف ہو چکی ہوں۔ مگر ہمیں مسافروں کی دیکھ بھال کرنے کی ہی تنخواہ ملتی ہے۔"

"اوکے' اوکے' تم اپنا کام کرو۔" یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گئے۔

میم کے چہرے پر ناخوشی کا ایک تاثر بھی نمودار نہ ہوا۔ وہ بدستور مسکراتی رہی۔ ان کے دروازے میں غائب ہو جانے کے بعد اس نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور پھر ہماری جانب دیکھا "معافی چاہتی ہوں۔ آپ لوگوں کو بہت دیر ہو گئی۔ لائیے اپنے ٹکٹ مجھے دیجئے۔" شاید اسے ہر روز اسی قسم کے تماشے دیکھنے پڑتے ہوں گے۔

ا نے ٹکٹوں کا ڈھیر ان کے سامنے رکھ دیا اور انہوں نے فارم پُر کرنے شروع کر

دیئے۔ ساری کارروائی مکمل کرنے کے بعد کاغذات ہمارے ہاتھ میں تھمائے۔ فون اٹھا کر کسی سے بات کی اور پھر ایک اور کوپن بنا کر ہمیں دے دیا۔ "آپ کو باہر ایک وین ملے گی۔ یہ کوپن دیں گے تو وہ آپ کو ہوٹل پہنچا دیں گے۔ یہ رہی آپ کی ہوٹل کی بکنگ کل شام سات بجے ہماری گاڑی آپ لوگوں کو لینے پہنچ جائے گی۔ تاخیر کے لئے پھر معذرت چاہتی ہوں۔"

ہم نے کہا "معذرت تو ہمیں کرنا چاہئے۔ آپ کو ہماری وجہ سے دیر ہوئی۔"

ہنس کر کہنے لگی "جی نہیں' یہ تو روز کا معمول ہے۔ میری ڈیوٹی گیارہ بجے تک ہے' مگر ہر روز ایک ڈیڑھ بج جاتا ہے۔"

ہم کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس غریب کو اتنی دیر تک کیوں کام کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے جب اس کے پاکستانی ساتھی کام نہیں کریں گے تو اسی کو کام کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ وہ پاکستانیوں سے زیادہ پاکستان کی محبِ وطن تھی۔ وہ بے چاری تو اپنی عادت اور فطرت کے ہاتھوں مجبور تھی۔

شاہ جی کافی دیر سے خاموش تھے۔ جب یہ ساری کارروائی ختم ہو گئی تو بولے "شکر ہے کہ ہمیں یہ میم مل گئی ورنہ ہمارے پاکستانی بھائی نے تو ہمیں سپردِ خدا ہی کر دیا تھا۔"

ہوٹل ایئرپورٹ سے چار پانچ منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ یہ ایک دو منزل یو شکل کی عمارت تھی۔ خاصا پر سکون اور آرام دہ معلوم ہوتا تھا۔ بس سے اترتے ہی استقبالیہ میں پہنچ گئے۔ ایک شوخ و شنگ قسم کی صاحب زادی نیلا بلاؤز اور سفید اسکرٹ پہنے وہاں تشریف فرما تھیں۔ ہم سب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ یوں خوش آمدید کہا جیسے آج تک وہ یہاں ہمارے انتظار میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں اور آج ان کی جنم جنم کی جستجو ختم ہو گئی ہے۔ ان کی خوش اخلاقی دیکھ کر شاہ جی نے ہم سے کان کے نزدیک منہ لا کر پوچھا "پرانی واقف معلوم ہوتی ہے؟"

ہم نے کہا "ایمان سے قسم لے لیں۔ آج پہلی بار دیکھا ہے۔"

کہنے لگے "پہلی ملاقات میں یہ حال ہے تو آگے کیا ہو گا؟ اللہ جانے۔"

اتنی دیر میں اس دوشیزہ نے ہر ایک کے پاسپورٹ دیکھنے شروع کر دیے تھے اور ضروری معلومات کے سلسلے میں سوالات کر رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہاں ایک خامشی تھی ہر اک کے جواب میں۔ ہم نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں اور مترجم کے فرائض سرانجام دیے۔ شاہ جی کہنے لگے "میری طرف سے بھی بات چیت کر لیں۔ مجھے آپ پر بھروسا ہے۔"

لڑکی نے ہم سب کو کمروں کی چابیاں دے کر راستہ بتا دیا اور ہم برآمدوں میں سے گزرتے ہوئے اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔ یہ قدرے پرانے انداز کی عمارت تھی مگر یہ غنیمت ہے کہ عملہ انہوں نے نئے انداز کا رکھا ہوا تھا۔ ہم نے ہر ایک کو کمرے کے قفل کھول کر دکھایا۔ پھر روشنیاں جلانے کا طریقہ سمجھایا اور پھر اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ خاصا آرام دہ اور کشادہ کمرا تھا۔ ہمارے اندر پہنچتے ہی لبنیٰ نے یہ خوش خبری سنائی،

کہ پتلون پر استری کرنے کا آرام ہو گیا ہے۔ ہم نے پوچھا "آپ کو کس نجومی نے بتایا ہے؟"

بولیں "جی نہیں، یہ سامنے پریسر رکھا ہوا ہے۔"

سامنے ایک عجیب و غریب شکل کی چیز رکھی ہوئی تھی جسے نہ میز کہہ سکتے تھے، نہ کھڑکی، نہ ہی استری۔ اس میں ایک بجلی کا پلگ بھی لگا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پارو نے فوراً ہمیں سمجھایا۔ پاپا یہ دیکھئے پتلون اس میں اس طرح تہہ کر کے لٹکا دیتے ہیں۔ پھر سوئچ آن کر دیتے ہیں۔ اس طرح بس تھوڑی دیر میں خود بخود پتلون پر استری ہو جاتی ہے۔ ہم نے فوراً ایک پتلون سوٹ کیس کے اندر سے نکالی اور اس آلے میں لٹکا دی۔ پارو نے سوئچ آن کر دیا اور ایک دو منٹ کے بعد اس میں سے بھاپ اٹھنے لگی۔ پتلون کو نکال کر دیکھا تو بہترین استری ہو چکی تھی۔ یہ تو بڑے کام کی چیز تھی۔ ہمیں بہت پسند آئی اور حیرت بھی ہوئی۔ ہوٹلوں کے کمروں میں عموماً کوئی ایسا ساکٹ بھی نہیں ہوتا جس میں آپ اپنی ذاتی استری لگا کر استعمال کر سکیں۔ مگر یہاں پتلون پر استری کرنے والی مشین مفت میں موجود تھی۔ بہت تھکے ہوئے تھے اس لئے انگریزوں کی عقلمندی کی داد دیتے ہوئے سو گئے۔ صبح ہماری آنکھ دروازے پر زور دار دستکوں سے کھلی۔ یوں لگا جیسے کوئی قرض خواہ قرض وصول کرنے آیا ہے۔ دروازہ کھولا تو یونٹ کے ایک چھوٹے قد کے صاحب کھڑے ہوئے تھے۔

"بھئی کیا بات ہے۔ صبح صبح دروازہ کیوں پیٹ رہے ہو؟"

گھبرا کے بولے "سر جی فوراً چلئے چھوٹے کا ہاتھ مشین نے پکڑ لیا ہے۔"

ان کے کمرے میں جا کر دیکھا تو ایک صاحب پتلون پر استری کرنے والی مشین کے پاس کھڑے کراہ رہے تھے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ انہوں نے استری گرم کرنے والا سوئچ آن نہیں کیا تھا ورنہ ان کا ہاتھ سچ مچ استری شدہ ہوتا۔ ہم نے فوراً ان کا ہاتھ باہر نکالنے کے لئے ایک بٹن دبایا اور ان کا بازو آزاد ہو گیا۔ انہوں نے اسے دبا کر محسوس کر کے دیکھا اور مطمئن ہو کر ہمارا شکریہ ادا کرنے لگے ان کے روم میٹ بولے "بڑی خیریت ہو گئی سر جی! اگر انہوں نے اپنا دایاں بازو اس میں ڈال دیا ہوتا تو کیا ہوتا؟"

ہم نے کہا "پھر بھی یہی ہوتا جو کہ اب ہوا ہے۔"

وہ صاحب چند لمحے تو سہمے ہوئے رہے۔ اپنا بازو سہلاتے رہے۔ جب اطمینان ہو گیا کہ بازو صحیح سلامت ہے تو ان کی زندہ دلی عود کر آئی۔ کہنے لگے "سر! آپ نے سردار جی کا لطیفہ سنا ہے؟"

ہم نے انکار میں سر ہلایا اور کہا "مگر اس وقت سردار جی کے لطیفے کا کیا موقع ہے؟"

بولے "سر بازو والی بات سے یاد آ گیا۔ ایک سردار جی بہت دن کے بعد دوستوں کو نظر آئے تو ان کا بایاں بازو غائب تھا۔ دوستوں نے پوچھا: سردار جی کیا ہو گیا؟ کہنے لگے۔ بس جی مشین میں آ کر کٹ گیا۔

دوستوں نے بہت افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا سردار جی واہگورو کی مہربانی ہے کہ آپ کا دایاں بازو مشین میں نہیں آ گیا۔

سردار جی فخریہ انداز میں بولے "اب میں آپ کو کیا بتاؤں مشین میں تو میرا دایاں بازو ہی آیا تھا مگر میری ہوشیاری دیکھو کہ میں نے فوراً دایاں بازو نکال کر فٹ سے بایاں بازو اس میں ڈال دیا۔ اس طرح کم سے کم دایاں بازو تو بچ گیا نا۔"

ہم ان کی زندہ دلی کے مظاہرے سے بہت خوش ہوئے۔ دراصل فلم کے لوگ ایسے ہی ہنس مکھ اور زندہ دل ہوتے ہیں۔ مصائب، محنت اور پریشانیوں سے مطلق نہیں گھبراتے۔ اتنی دیر میں ایک "میڈ" بھی شور سن کر کمرے میں آ گئی۔ انہوں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ پھر پوچھا "کیا بات ہے۔ شور کیوں مچ رہا تھا سب خیریت تو ہے نا؟"

ہم نے کہا "اب تو خیریت ہی ہے۔ ورنہ آپ کے ہوٹل پر ہرجانے کا مقدمہ ہو جاتا۔"

حیران ہو کر پوچھنے لگیں "مگر کیوں؟"

ہم نے کہا "آپ لوگوں نے پتلون پر استری کرنے والی مشین تو یہاں رکھ دی ہے مگر نہ تو اس کا تعارف موجود ہے اور نہ ہی ترکیب استعمال۔ اب یہ بتائیے کہ اگر ہمارے آدمی کا بازو جل جاتا تو آپ کے ہوٹل کو کتنا بھاری جرمانہ دینا پڑتا؟"

وہ بہت حیران ہوئیں۔ کہنے لگیں "مگر بازو کا اس مشین سے کیا تعلق ہے۔ یہ تو صرف پتلون استری کرنے کے لئے ہے۔"

ہم نے کہا "مگر دیکھنے میں تو ایسی نہیں لگتی۔"

کہنے لگیں "چلئے مان لیا کہ ہوٹل والوں کی غلطی ہے مگر ان صاحب نے بازو اس میں ڈالا کیوں تھا؟"

یہ سوال ہمیں بھی نہیں سوجھا تھا۔ ہم نے چھوٹے سے پوچھا "بھائی تم نے بلا وجہ اپنا بازو اس میں ڈالا کیوں تھا؟"

کہنے لگے "سر میں سمجھا تھا کہ شاید شیو کرنے والی مشین ہے۔ بس ذرا ہاتھ اندر ڈال کر چیک کر رہا تھا۔"

میڈ جس تیزی سے آئی تھی۔ اسی تیزی سے واپس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد آئی تو اس کے ساتھ ہوٹل کا پورا اسٹاف تھا۔ زیادہ تعداد جوان اور خوب صورت لڑکیوں کی تھی۔ ایک بڑی بی تھیں مگر بہت فیشن ایبل۔ ایک بڑے میاں بھی تھے جو پائپ پی رہے تھے اور ایک کش لگانے کے بعد دو منٹ تک کھانستے تھے۔ انہوں نے کھانستے کھانستے ہم سب کو بغور دیکھا۔ اور پھر پوچھا "ان میں سے مجرم کون ہے؟"

میڈ نے چھوٹے کی جانب اشارہ کر دیا۔ بڑے میاں نے پائپ کا لمبا کش لیا اور پھر آگے بڑھ کر چھوٹے کا بازو چیک کیا۔ پھر انہوں نے استری کرنے والی مشین کو دیکھا اور پھر کہنے لگے "ینگ مین میں تمہاری جستجو اور تحقیق کی داد دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے چھوٹے سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد وہ اپنے ساتھ آنے والوں سے مخاطب ہوئے۔ "دیکھا ایسے من چلے ہی نئی نئی ایجادیں کرتے ہیں اور نئی دنیائیں دریافت کرتے ہیں۔"

ان سب نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چھوٹے کو دیکھا اور پھر باری باری رخصت ہو گئے۔

ہال کمرے میں آشنا "بفے" تھا۔ یعنی ایک بہت بڑی میز پر ناشتے کے لئے ڈھیر ساری چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ آپ پلیٹ اٹھائیں اور اپنی پسند کی ہر چیز اس میں بھر لیں۔ یہ بھی پابندی نہیں ہے کہ ایک ہی بار پلیٹ بھریں۔ اللہ توفیق دے تو آپ بار بار یہی عمل دہرا سکتے ہیں۔ وہاں فلم یونٹ کے تمام افراد موجود تھے۔ چھوٹے کو دیکھا کہ کریز کے بغیر پتلون پہنے ہوئے تھے۔ پوچھا "بھئی پتلون پر استری کیوں نہیں کی؟"

بولے "ڈر لگتا ہے جی۔ مشین کا معاملہ ہے۔ اس کا کیا بھروسا؟"

ناشتے میں ہم تو ایک چھوٹی سی پلیٹ میں ایک انڈا اور ٹوسٹ لے کر ایک طرف بیٹھ گئے مگر دوسرے تمام لوگ دل کھول کر "داد ناشتا" دے رہے تھے۔ ہم پاکستانی تو خیر اپنی خوش خوراکی کے لئے دور دور تک مشہور ہیں مگر اس روز ہم نے پہلی بار جاپانیوں کو بھی خوش خوراکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا۔ چار جاپانیوں پر مشتمل ایک گروہ ہال میں سب سے نمایاں تھا۔ ایک تو اپنی شکل و صورت کے باعث اور دوسرے اپنے کھانے کی وجہ سے۔ ان میں دو مرد تھے اور دو عورتیں۔ مرد تو خیر نارمل سائز کے تھے مگر عورتوں کا یہ عالم تھا کہ ایک کرسی میں سمانا مشکل تھا' بلکہ ہمیں تو حیرت یہ تھی کہ وہ کرسی کے اندر داخل کیسے ہو گئیں؟ کیونکہ وہ بار بار اٹھنے سے معذور تھیں اس لئے ان کے ہمراہی نہایت مستعدی اور تیزی کے ساتھ ان کی خالی پلیٹیں لے کر میز کی طرف جاتے اور وہاں سے انواع و اقسام کی چیزیں بھر کر لے آتے۔ میز پر موجود کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو انہوں نے نہیں کھائی۔ صرف پلیٹیں' پیالیاں اور چمچے اس سے محفوظ تھے۔ اگر میز پر کھانے کی مقدار اتنی زیادہ نہ ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ وہ پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لئے وہ بھی کھا لیتے۔

اردو زبان میں ایسے موقعوں کے لئے ایک محاورہ ہے کہ کھڑے کھڑے تمام کھانا ڈکار گئے۔ ان لوگوں کو دیکھا تو اس محاورے کی صداقت پر یقین آگیا۔ فرق یہ تھا کہ یہ لوگ تو ڈکار بھی نہیں لے رہے تھے۔ میزوں پر چائے' کافی' دودھ اور اوولٹین بھی موجود تھا مگر انہوں نے سوائے دودھ کے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بڑے بڑے مگوں میں دودھ بھر کر اس میں اوولٹین ڈالی اور ایک ہی سانس میں صاف کر دیا۔ جاپانی ہم نے اس سے پہلے بھی دیکھے تھے مگر ایسے بلا نوش جاپانی دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کھانے کا سارا سامان میز پر سے ختم ہو گیا۔ شاہ جی ہم سے کہنے لگے "پتا نہیں ان بے چاروں کا پیٹ بھرا یا نہیں؟"

ہم نے کہا "کیا اتنا کھا لینے کے بعد بھی پیٹ نہیں بھرا ہو گا؟"

جواب میں انہوں نے ہمیں "پیٹ بھروں" کا لطیفہ سنایا وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک شخص کے گھر چار حضرات مہمان آئے۔ انہوں نے دعوت کا اہتمام کیا۔ کھانا میز پر لگایا گیا تو مہمان آستین چڑھا کر میز پر پل پڑے۔ اب یہ ہوا کہ میزبان کھانا لا لا کر تھک

گئے مگر مہمان کھانے سے نہیں تھکے۔ کافی دیر کے بعد اچانک ایک دھماکے کی آواز آئی۔ سہمے ہوئے میزبانوں نے دیکھا کہ ایک مہمان کا پیٹ پھٹ گیا تھا اور وہ کرسی سے نیچے گر گئے تھے، مگر کیا مجال جو باقی تین مہمانوں نے اس طرف توجہ دی ہو۔ کچھ دیر بعد ایک اور دھماکہ ہوا اور دوسرا مہمان بھی پیٹ پھٹنے کے بعد کرسی سے نیچے لڑھک گیا۔ گھر والے خوف زدہ ہو کر دیکھ رہے تھے۔ مگر باقی ماندہ دو مہمان اپنے ساتھیوں کے انجام سے بالکل بے خبر تھے۔ اب کھانا بھی ختم ہو چکا تھا بلکہ میزبان نے آس پاس کے پڑوسیوں سے مانگ مانگ کر جو کھانا منگایا تھا وہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ آخر ایک میزبان ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور کھانے میں مصروف مہمانوں سے مخاطب ہو کر بولا ؟اب تو آپ کا پیٹ بھر گیا ہو گا؟"

انہوں نے سامنے فرش پر گرے ہوئے دو مہمانوں کی جانب اشارہ کیا اور کہا "پیٹ بھرے وہ رہے۔ ہمارے لئے تو اور کھانا منگاؤ"

ناشتے کے بعد گھوم پھر کر دیکھا تو پتا چلا کہ ہوٹل خاصا وسیع اور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ غالباً یہ عام طور پر ہم جیسے "ناگہانی مسافروں" کے استعمال میں رہتا ہو گا کیونکہ تمام دن بسیں بھر بھر کر مسافروں کی ٹولیاں آتی رہیں اور جاتی رہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے لوگ، طرح طرح کی شکلوں اور حلیوں کے خواتین و حضرات سامان سے لدے پھندے، آمد و رفت میں مصروف تھے۔ ہمارے ساتھ کے بعض لوگوں کو لندن دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ یہ ہوٹل تو ائرپورٹ کے نواح میں اور شہری آبادی سے دور تھا اس لئے لندن جانے کے لئے پچیس تیس میل کا فاصلہ طے کرنا ضروری تھا۔ ٹیکسی کے ذریعے جانے پر کافی زرمبادلہ خرچ ہو جاتا جو بہت کم یاب تھا۔ انڈر گراؤنڈ ٹرین سے جانے کے لئے سب سے پہلے تو ائرپورٹ جانا ضروری تھا۔ اس کے بعد وہاں سے زیر زمین ٹرین میں سوار ہو کر لندن جا سکتے تھے مگر اس مقصد کے لئے کسی تجربے کار شخص کا ہمراہ ہونا لازمی تھا جو ہمارے سوا کوئی اور نہیں تھا اور ہم اتنے بڑے قافلے کو اس طرح لندن لے جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ وقت کس طرح گزارا جائے؟ ہم نے کہا "آپ لوگ ہوٹل کی لابی میں اور باہر لان میں جا کر دیکھئے، کیسے کیسے لوگ آ رہے ہیں۔ اتنے بہت سے انگریز اور گوری میمیں تو آپ نے ساری زندگی میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔"

سب نے ہمارے مشورے سے اتفاق کیا اور دوپہر کو لنچ کے وقت یہ عالم تھا کہ ہر ایک کو تقاضے کر کے بلانا پڑ رہا تھا۔ جسے دیکھئے وہ میموں کا تماشہ دیکھنے میں محو تھا۔ یہاں تک کہ ان کی بھوک پیاس بھی غائب ہو چکی تھی۔ ہم تو خاصے پریشان ہوئے مگر شاہ جی کا خیال تھا کہ اللہ جو بھی کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ ہماری فلائیٹ مس ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ ان لوگوں کو گورے انگریز اور میمیں دیکھنے کی پریکٹس ہو گئی۔ ورنہ اگر ایک دم ٹورنٹو جا کر نظارہ کرتے تو بہت ممکن ہے ان میں سے بعض حضرات ہوش و حواس ہو کھو بیٹھتے۔ ہم نے غور کیا تو ان کی بات بہت معقول لگی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم پاکستانی اب غیر ملکیوں کو دیکھنے کے عادی نہیں رہے ہیں۔ یورپین خواتین تو انہیں بالکل ہی نظر نہیں آئیں۔ ہم لوگ تو گھیردار شلوار، ڈھیلے ڈھالے کرتے اور دوپٹے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایسے میں اگر اچانک بے شمار گوری گوری بے حد خوب صورت میمیں برائے نام لباس میں ملبوس نظر آ جائیں تو اندازہ کیجئے کہ ان بے چاروں پر کیا گزرے گی؟ اول تو گوری میم ہی اب ہم پاکستانیوں کے لئے نایاب ہو چکی ہے، بلکہ عنقا ہو گئی ہے۔ پھر ہم لوگ ایک ہی قسم کے زنانہ ملبوسات کو دیکھتے دیکھتے یہ بھول ہی گئے ہیں کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں خواتین کس قسم کے لباس پہنتی ہیں۔ یہ صورت حال خاصی تشویشناک ہے۔ حکومت کو اس طرف توجہ دینی چاہئے اور تھوڑے تھوڑے عرصے بعد ریفریشر کورس کے طور پر غیر ملکی خواتین کی آمد و رفت کا خصوصی بندوبست کرنا چاہئے۔ مشکل یہ ہے کہ سیاحت کا شعبہ تو ہمارے ملک میں قریب قریب ختم ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر سیاح آتے رہتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ سیاح کیوں نہیں آتے؟ یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

ہم نے بڑی مشکل سے سب کو کھانے کے لئے بلایا اور ساتھ ہی یہ بھی یقین دلایا کہ آپ لوگ جہاں جا رہے ہیں وہاں دوران قیام ایسے ہی لوگوں کو دیکھنے کا موقع ملتا رہے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ ذرا صبر و تحمل سے کام لیں اور اپنے ہوش و حواس قابو میں رکھیں۔ کھانے پر بھی "بفے" کا انتظام تھا۔ جاپانی گروپ اس موقع پر موجود نہیں تھا۔ خدا جانے وہ اپنی فلائیٹ پر چلے گئے تھے یا بسیار خوری کے باعث بیمار ہو کر اسپتال پہنچ گئے تھے۔ بہرحال ان کی کمی شدت سے محسوس ہوئی کیونکہ کافی کھانا بچ رہا تھا۔ کھانے پر بھی بہت میمیں موجود تھیں اس لئے یونٹ کے ارکان کو تسلی تھی۔ ان میں سے بعض

حضرات نے انگریزی بولنے کی مشق بھی شروع کر دی تھی۔ مثلاً سوری، تھینک یو۔ شاہ جی نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ آج کے لئے اتنی ہی انگریزی کافی ہے۔ کسی بھی چیز کی زیادتی اچھی بات نہیں ہے۔ ہم لنچ سے فارغ ہو کر لبنیٰ اور پارو کے ساتھ ہوٹل کے خوب صورت لان میں ٹہلنے چلے گئے مگر ہمارے یونٹ کے لوگوں نے کھانے کا حال نہ چھوڑا۔ جب تک کہ وہاں ایک بھی میم موجود رہی وہ وہیں ڈیرہ ڈالے رہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر ان حضرات کی تھوڑی سی بریفنگ ہو جائے تو بہتر ہے چنانچہ انہیں باغ میں اکٹھا کیا اور انہیں سمجھایا کہ دیکھو بھائی، کراچی سے لندن تک تو آپ پی آئی اے کی فلائیٹ میں آ گئے ہیں لیکن اب آگے برٹش ائر کی فلائیٹ ہے جس میں سارا عملہ انگریز ہو گا اور وہ لوگ پی آئی اے والوں کی طرح ہماری بدنظمی اور بدتہذیبی کے عادی بھی نہیں ہیں۔ اس لئے ملکی وقار کا تقاضا یہ ہے کہ سب لوگ خاموشی، تہذیب اور ڈسپلن کے ساتھ سفر کریں۔ بلا ضرورت ائر ہوسٹس کو بار بار نہ بلائیں۔ شور نہ مچائیں، غسل خانوں میں گندگی نہ پھیلائیں وغیرہ وغیرہ۔ دراصل جو پاکستانی پہلی بار ملک سے باہر جاتے ہیں ان کے لئے اس قسم کی بریفنگ یا مختصر کورس بہت ضروری ہے۔ بدقسمتی سے نظم و ضبط اور تہذیب و شائستگی کے ہم لوگ اپنے ملک میں تو عادی ہی نہیں ہوتے۔ نہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ صاف ستھرا ماحول کیا ہوتا ہے۔ سفر کرنے کے کیا آداب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ پاکستانی بھی جب ملک سے باہر قدم نکالتے ہیں تو ہر چیز کو بڑی حیرانی اور بے یقینی کے ساتھ دیکھتے ہیں اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو اپنے ملک میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ پھر جو لوگ گاؤں، دیہات یا چھوٹے قصبوں سے اٹھ کر سیدھے لندن، امریکہ اور یورپ کا سفر اختیار کرتے ہیں ان کی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خرم نے اس سلسلے میں ہماری بہت پر جوش انداز میں امداد کی۔ مثلاً اس نے ہمارے کان میں کہا "انکل ان سے یہ پوچھئے کہ سیٹ بیلٹ کیسے باندھتے ہیں؟"

ہم نے کہا "یہ تو بہت فضول سا سوال ہے۔ ہر ایک جانتا ہے کہ سیٹ بیلٹ کس طرح باندھی جاتی ہے۔"

اس نے کہا "پھر بھی پوچھنے میں کیا حرج ہے؟"

ہم نے ایک صاحب سے پوچھا "آپ کو سیٹ بیلٹ باندھنی تو آتی ہو گی۔ بہت آسان ہے اور پھر ائر ہوسٹس نے اردو میں بھی بتایا تھا۔ اب اس پرواز میں آپ لوگوں کو اردو میں کچھ نہیں بتایا جائے گا۔"

انہوں نے جواب دیا "یہ تو بلا وجہ کے نخرے ہیں ان انگریزوں کے، سیٹ بیلٹ باندھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

ہم نے کہا "بہت خطرہ ہوتا ہے۔ جھٹکے لگتے ہیں اور چوٹ بھی لگ سکتی ہے۔"

انہوں نے فرمایا "مجھے تو کچھ نہیں ہوا دیکھ لیجئے آپ کے سامنے موجود ہوں۔ آفاقی صاحب! یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔ میں نے تو آج تک پتلون میں بیلٹ نہیں لگائی۔"

ہم نے کہا "بھائی پتلون کی بیلٹ اور ہوائی جہاز کی سیٹ بیلٹ میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

وہ بولے "آپ کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں آپ کی کتنی عزت کرتا ہوں۔" یعنی وہ ہم پر ذاتی احسان کر رہے تھے۔ کچھ دیر ہم یوں ہی وقت ضائع کرتے رہے۔

شاہ جی نے ہم سے کہا "چھوڑیں آفاقی صاحب! یہ کچھ سیکھے بغیر اتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ بس یہ تو اپنا کام ہی جانتے ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ آپ بلاوجہ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ انہیں سپرد خدا کر دیں۔" چنانچہ ہم نے ان کے مشورے کے مطابق انہیں سپرد خدا کر دیا۔ سچ ہی تو کہا تھا انہوں نے جن لوگوں کی تربیت ماں باپ نے نہیں کی۔ استادوں نے نہیں کی، معاشرے نے نہیں کی اور وہ اتنے بڑے بڑے ہو گئے تو پھر اتنے مختصر عرصے میں انہیں کوئی کیا تربیت دے گا؟ واقعی، انہیں تو سپرد خدا کر دینا ہی بہتر ہے۔ چار بجے ہماری بس آ گئی۔ سب نے اپنا اپنا مختصر ہاتھ کا سامان سمیٹا اور بس میں سوار ہو گئے۔ سامان اٹھانا ہی ہم لوگوں کے لئے بڑا مسئلہ ہے۔ ہمارے ہاں سبھی لوگ تھوڑا سا سامان اٹھوانے کے لئے بھی قلی پر انحصار کرتے ہیں۔ امیر ہو یا غریب، مجال ہے جو اپنا سامان خود اٹھا لے۔ اس کے مقابلے میں یورپ کے ملکوں میں ہر شخص اپنا سامان خود اٹھانے کا عادی ہوتا ہے۔ واپسی بھی اسی راستے سے ہوئی جس سے ہم ہوٹل گئے

تھے۔ ایسی صاف شفاف' کشادہ اور ہموار سڑکیں ہمارے ساتھیوں نے بھلا کب دیکھی ہوں گی' اس لئے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ سرنگوں کے اندر سے گزرتی ہوئی جگمگاتی سڑکیں بھی انہیں بہت پسند آئیں۔ پھر جب دیکھا کہ ایک سڑک پر سے دوسری اور تیسری سڑک بھی گزر رہی ہے تو وہ انگریزوں پر ایمان لے آئے۔

ایک صاحب کہنے لگے "ایمان کی بات یہ ہے کہ لندن شہر کا جواب نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "ابھی آپ نے لندن شہر دیکھا ہی کہاں ہے؟ شہر کی ایک جھلک تک تو دیکھی نہیں۔"

وہ بولے "صاحب جی' دیگ کا ایک چاول دیکھ کر دیگ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بس ہمیں بھی لندن کا اندازہ ہو گیا ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ بہت غضب کا شہر ہے' یعنی دیکھنے سے پہلے ہی انہوں نے لندن کے بارے میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

ائرپورٹ پر برٹش ائر کے کاؤنٹر پر پہنچے تو ہمیں خیال آیا کہ ہم سب ٹکٹوں کے بغیر ہی تھے۔ ہمارے ٹکٹ گزشتہ رات نئی بکنگ کرانے کے لئے پی آئی اے کی انگریز خاتون نے لے لئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ ہمیں ہوٹل پر ٹکٹ پہنچا دیں گی۔ مگر اب فلائیٹ کا وقت نزدیک تھا اور ان کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آج پھر ہمیں لندن میں ہی رہنا پڑے گا۔" ایک صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ انگریزوں پر بھروسا نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ نے خواہ مخواہ ٹکٹ اس میم کو دے دیئے۔"

"میرے خیال میں ہمیں پی آئی اے کے کاؤنٹر پر چلنا چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جہاز ہمارے بغیر ہی اڑ جائے۔"

بھانت بھانت کی بولیاں تھیں اور ہم تھے۔ یہاں تک کہ پارو بھی فکر مند ہو گئی۔ کہنے لگی "پاپا' کیا ہم بغیر ٹکٹ کے کینیڈا جا سکتے ہیں؟"

ہمارے انکار پر کہنے لگی "تو پھر اب ہم کیسے جائیں گے۔ ہمارے ٹکٹ تو وہ مس صاحبہ لے گئی ہیں۔ آپ انہیں تلاش کیوں نہیں کرتے؟"

"بے بی ٹھیک کہہ رہی ہے سر!" چھوٹے نے مشورہ دیا "ان انگریز میموں کا کوئی پتا

نہیں ہے۔ وہ ہمارے ٹکٹوں پر کسی اور کو نہ بھیج دیں؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

اس اثنا میں برٹش ائر کے کاؤنٹر پر جوق در جوق مسافر آ رہے تھے اور اپنے اپنے بورڈنگ کارڈ لے کر مسکراتے ہوئے امیگریشن لاؤن کی جانب جا رہے تھے۔ فلائیٹ میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تو ہمیں بھی کچھ تشویش ہونے لگی۔ پی آئی اے کا کاؤنٹر بھی سامنے ہی تھا اور ہم وہاں سے ان خاتون کے بارے میں پوچھ گچھ کر آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ آج تو ان کی چھٹی کا دن ہے۔ لیجئے ایک اور مصیبت' اب تو ہمیں بھی پچھتاوا ہونے لگا کہ ہم نے ان کا فون نمبر معلوم کر کے دن کے وقت ان سے رابطہ کیوں نہیں قائم کیا۔ اگر آج ان کا آف ڈے ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں سیرو تفریح کے لئے چلی گئی ہوں اور ہمارا مسئلہ ان کے ذہن سے نکل گیا ہو۔

شاہ صاحب نے ایک سرد آہ بھری اور بولے "آج تو ہوٹل کی بکنگ بھی نہیں ہے۔ شاید یہیں فرش پر سونا پڑے گا۔ ہمارے پاس تو ہاتھ کے بیگوں کے علاوہ دوسرا سامان بھی نہیں ہے۔ سر! بس ہمارا سامان تو سپرد خدا ہو گیا سمجھو۔"

یکایک کسی خاتون کی اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ کی آواز گونجی اور دوسرے لمحے ایک جانب سے پی آئی اے والی میم آتی ہوئی نظر پڑیں۔ رات کو تو وہ پی آئی اے کی وردی میں ملبوس تھیں مگر اس وقت جینز اور سفید ریشمی قمیض پہن کر آئی تھیں۔ بال بہت احتیاط اور سلیقے سے شانوں پر بکھرائے تھے۔ ہلکے میک اپ میں وہ بہت نو عمر' سمارٹ اور خوب صورت نظر آ رہی تھیں۔ شروع میں تو ہم انہیں پہچانے ہی نہیں تھے پہلے ان کی اونچی ہیل کی آواز نے سب کو ان کی جانب متوجہ کر دیا تھا۔ مگر جب دیکھا کہ وہ خوب صورت عورت مسکراتی ہوئی ہماری جانب بڑھی آ رہی ہے تو دوبارہ غور کیا اور انہیں پہچان لیا۔ وہ تیزی سے ہماری جانب آئیں۔ تیز رفتاری کے باعث ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ آتے ہی انہوں نے علیک سلیک کرتے ہوئے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو ہمارا آدھا غصہ تو ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ پھر وہ بڑی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ بولیں

"معافی چاہتی ہوں' مجھے دیر ہو گئی۔ دراصل راستے میں ایک جگہ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں آپ لوگوں کی فلائیٹ ہی مس نہ ہو

جائے۔"

ہم نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ ادھر اسی وقت کال سسٹم پر ٹورنٹو جانے والی برٹش ائر کی فلائیٹ کا پہلا اعلان نشر ہونے لگا۔ ہمارے چہرے کی پریشانی دیکھ کر وہ معنی خیز انداز میں مسکرائیں اور بولیں "فکر نہ کیجئے' آپ لوگوں کی سیٹیں کنفرم ہو گئی تھیں۔ سامان بھی بک ہو چکا ہے۔ یہ رہے آپ کے بورڈنگ کارڈز۔" انہوں نے اپنے بڑے سے پرس میں سے ٹکٹ اور بورڈنگ کارڈ نکال کر ہمارے حوالے کر دیئے۔ ہم نے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ گزشتہ رات ہماری مشکل کشائی نہ کرتیں تو ہم سب کو بہت پریشانی اٹھانی پڑتی۔ یوں سمجھئے کہ وہ فرشتہ بن کر ہمارے لئے بھیجی گئی تھیں۔ ان کا انکسار ملاحظہ ہو کہ وہ الٹی ہم سے معذرت کر رہی تھیں کہ ہم لوگوں کو خواہ مخواہ پریشانی اٹھانی پڑی۔ ان سے رخصت ہو کر ہم لوگ چیک ان ہونے کے لئے روانہ ہوئے تو ہمارے کانوں میں ایک آواز آئی۔ "کیا بات ہے جی ان انگریزوں کی۔ بہت کھرے لوگ ہوتے ہیں۔"

دوسرے نے کہا "میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ وہ میم ہمیں دھوکا نہیں دے سکتی۔"

لیجئے' دیکھتے ہی دیکھتے ہر شخص کی رائے تبدیل ہو گئی۔

فلائیٹ سے پہلے خرم نے اپنے ساتھیوں سے کہا "آپ کو پتا ہے کہ اب ہمارا ہوائی جہاز سمندر کے اوپر سفر کرے گا۔"

"کیا کہا! سمندر کے اوپر اور وہ بھی رات کے وقت؟"

ایک صاحب کے منہ سے نکلا اور ان کا چہرہ فق ہو گیا۔

"تو پھر کیا ہوا؟"

"کمال کرتے ہیں جی آپ بھی۔ اتنی اندھیری رات ہے۔ سمندر میں تو لالٹین بھی نہیں ہوتیں۔ اگر جہاز کو کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا؟"

ہم نے کہا "اور اگر دن کے وقت خشکی کے اوپر سفر کرتے ہوئے جہاز کو کچھ ہو جائے تو کیا ہوتا ہے؟"

ایک آواز آئی "جہاز زمین پر گر کر تباہ ہو جاتا ہے۔ سمندر میں تو پھر بھی بچنے کا امکان ہوتا ہے۔"

"ایسی منحوس باتیں تو زبان سے نہ نکالیں جی' یہ اچھا شگون نہیں ہوتا' مجھے تو تیرنا بھی نہیں آتا۔"

"ورنہ آپ تیر کر ٹورنٹو پہنچ جاتے؟"

"یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے سر! مجھے پہلے کسی نے نہیں بتایا۔"

"اگر بتا دیتے تو کیا کرتے؟"

"یہ کم سے کم نہانے کا لباس ہی اپنے ساتھ لے آتے۔"

"مذاق کی بات نہیں ہے۔ اب بتائیں میں کیا کروں؟"

خرم نے بڑی سنجیدگی سے کہا "انکل' اب تو ایک ہی ترکیب ہو سکتی ہے کہ آپ

ائر ہوسٹس کی باتیں ذرا غور سے سنیں اور وہ جو بھی بتائے وہ اچھی طرح یاد کرلیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ آپ جب سمندر میں گریں گے تو صحیح طرح جیکٹ پہن کر گریں گے اور کم سے کم ڈوب کر نہیں مریں گے۔"

"بچ جائیں گے؟" وہ خوش ہو کر بولے۔

"جی ہاں کم از کم ڈوبنے سے تو بچ جائیں گے اور جب تک مچھلیاں نہیں کھائیں گی اس وقت تک بچے رہیں گے۔"

وہ ناراض ہو کر بڑبڑانے لگے "یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے۔ پہلے نہیں بتایا کہ رات کے وقت سمندر پر سفر کرنا پڑے گا۔"

"اگر معلوم ہو جاتا تو آپ کیا کرتے۔ خشکی کے راستے کینیڈا جاتے؟ یا پانی کے جہاز میں سفر کرتے؟"

"میں جاتا ہی نہیں۔ جو لوگ کینیڈا نہیں جاتے وہ بھی تو زندہ رہتے ہیں۔"

یہ غنیمت ہے کہ فلائیٹ کے دوران موسم بہت اچھا رہا۔ پرواز اس قدر ہموار تھی کہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ ہم لوگ ہوائی جہاز پر سوار ہیں۔ ویسے بھی آج کل کے ہوائی جہاز اتنے بڑے سائز کے ہوتے ہیں کہ ان پر مکانوں کا گمان گزرتا ہے۔ پھر اب تو اس کی بالائی منزل بھی ہونے لگی ہے جو بچوں کے لئے بہت زیادہ دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے' بشرطیکہ انہیں عملے کی جانب سے اوپر جانے کی اجازت مل جائے۔

پرواز سے پہلے ائر ہوسٹس نے مسافروں کو انگریزی میں ضروری ہدایات دیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہے؟"

"کوئی نئی بات نہیں بتا رہی۔ وہی کہہ رہی ہے جو پی آئی اے والی نے کہا تھا مگر آپ نے توجہ نہیں دی تھی۔"

"مگر یہ سب ایک ہی بات کیوں کہتے ہیں؟"

"اس لئے کہ سب جہاز ایک جیسے ہوتے ہیں اور سب ایک ہی طرح حادثوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لئے مسافروں کے ہلاک ہونے کا طریقہ بھی ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔"

"لاحول ولا قوت۔ آدمی کا منہ اچھا نہ ہو تو کم از کم بات تو اچھی کرے۔"

ائر ہوسٹس کے اردو ترجمے کی کمی اس کی خوبصورتی نے پوری کر دی تھی۔ خوب صورتی بھی کیا۔ یوں سمجھئے گوری رنگت' سنہرے بال' نیلی آنکھیں' متناسب جسم اور اس پر اسکرٹ اور بلاؤز۔ دراصل لباس بھی شخصیت پر بہت اثر انداز ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ شلوار قمیص والی ائر ہوسٹس اور اسکرٹ بلاؤز والی ائر ہوسٹس میں کتنا نمایاں فرق ہوتا ہے۔ کم از کم ہم پاکستانیوں کے لئے جو خواتین کو کسی دوسرے لباس میں دیکھنے کے عادی نہیں رہے ہیں۔ ائر ہوسٹس کافی اسمارٹ اور خوب صورت تھیں۔ اس معاملے میں ہماری پی آئی اے کی ائر ہوسٹس بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ بس ذرا لباس سے مار کھا جاتی ہیں۔ ہماری نفسیات یہ ہے کہ گوری میمیں ہمیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ان کی ہر بات اور ہر ادا نہیں بھاتی ہے۔ خرم صاحب تو "آنٹی آنٹی" کہہ کر ان سے باتیں کرتے رہے۔ بعض دوسرے حضرات نے انہیں میم صاحب کا خطاب دیا۔ پرواز کے بعد ہی ڈنر کا بندوبست شروع کر دیا گیا تھا۔ ہم نے کھانے کے بارے میں کوئی خاص ہدایات نہیں دی تھیں۔ دراصل گزشتہ روز کی بھاگ دوڑ میں نہ تو اس کا موقع ملا تھا اور نہ ہی اتنا وقت تھا' مگر اتفاق سے کھانا مرغ اور چاول پر مشتمل تھا اس لئے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد فلم شروع ہو گئی جسے دیکھتے ہوئے اکثر مسافر نیند کی آغوش میں سو گئے۔ ہوائی جہاز کی قریب قریب تمام سیٹیں پر تھیں اس لئے بہت سے لوگ اپنے برابر والے مسافروں کے کاندھوں سے سر لگائے ہوئے سو رہے تھے۔ بین الاقوامی پرواز کے دوران میں اگر رات ہو جائے تو یوں سمجھئے کہ ہم پاکستانیوں کی عید ہو جاتی ہے۔ ان پروازوں پر سفر کرنے والوں کی اکثریت بھی مغربی ہوتی ہے۔ اور مشرقی خواتین کے برعکس مغربی عورتیں زیادہ کشادہ نظر اور کھلے دل کی ہوتی ہیں اور بڑی بے تکلفی سے اپنے ہم سفروں کے شانوں پر اپنا سر ٹیک کر سو جاتی ہیں۔ جو بہت سے مسافروں کے لئے ایک "اضافی" سہولت ہوتی ہے۔ ہمارے بھائی بندوں کے لئے یہ کسی اعزاز سے کم نہیں ہوتی اور وہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اس آزمائش سے گزرتے ہیں۔ چاہے ساری رات بیت جائے مگر کیا مجال جو وہ خاتون کو بیدار کرنے یا ان کا سر اپنے شانے پر سے ہٹانے کی غلطی کریں۔ ایسے مواقع ہماری زندگی میں بھی پیش آتے رہے ہیں۔ اس سفر میں ہماری بیگم اور چھوٹی بچی ہمراہ تھی اور ہمارے دونوں شانے ان کے لئے وقف تھے اس لئے ہم اس

سعادت سے محروم رہے۔ بلکہ ہمارے نزدیک جو موٹے سے صاحب تشریف فرما تھے انہیں خراٹے لینے کی بیماری تھی۔ ہم نے بہت سے خراٹے لینے والے دیکھے ہیں۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اگر آپ انہیں بیدار کر دیں تو ان کے خراٹے بند ہو جاتے ہیں۔ مگر ان صاحب کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ ہم نے ایک دو بار ان کو بیدار کرنے کے لئے تھپ تھپایا تو انہوں نے بیدار ہو کر آنکھیں کھول کر ہمیں دیکھا اور مسکرانے لگے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ خراٹے بدستور ان کے منہ سے بلند ہو رہے تھے۔ جب ہم نے دیکھا کہ ان کے جاگنے یا سونے سے خراٹوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو پھر انہیں جگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ اس وقت تک خراٹے لیتے رہے جب تک کہ ہوائی جہاز کی میزبانوں نے ناشتا پیش نہیں کیا۔ جاگنے کے بعد بھی وہ کچھ دیر تک خراٹے لینے میں مصروف رہے بلکہ آدھا ناشتا بھی انہوں نے اسی عالم میں کھایا۔ ہمارا تو خیال تھا کہ شاید وہ خراٹے لیتے ہوئے ہی ائرپورٹ کے باہر نکلیں گے مگر ہوائی جہاز سے باہر قدم رکھنے سے پہلے ہی ان کے خراٹے بند ہو چکے تھے۔ ہمارا جی تو چاہا کہ ان سے دریافت کریں کہ جناب خراٹے لینے کے علاوہ آپ اور کیا کرتے ہیں مگر موقع نہیں ملا۔

ٹورنٹو ائرپورٹ پر ہمیں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی۔ وجہ یہ تھی کہ پرویز ملک صاحب نے کینیڈا کی حکومت سے باقاعدہ رابطہ قائم کرنے کے بعد فلم بنانے کی تجویز منظور کرائی تھی اور اسلام آباد میں ویزا آفس نے بڑی چھان بین کے بعد ویزے جاری کئے تھے۔ اس لئے ائرپورٹ پر کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ دراصل ہمیں "کامیابی" کی فلم بندی کے لئے ایک سال پہلے ہی ٹورنٹو پہنچ جانا چاہئے تھا۔ ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں مگر اسلام آباد سے ویزا لینے کے بعد پرویز ملک صاحب لاہور واپس آ رہے تھے کہ کار کا حادثہ پیش آ گیا اور ان کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ تین چار مہینے تک وہ پلاسٹر میں رہے۔ اس طرح موسم کے خیال سے فلم کی شوٹنگ ایک سال کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ ہم آپ کو "آب و دانہ" کے فلسفے کے بارے میں پہلے بتا چکے ہیں۔ ہم لوگوں کی قسمت میں کینیڈا کا دانہ پانی نہیں تھا اس لئے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ اب ہم کینیڈا کا پانی پینے اور دانہ کھانے کے لئے ٹورنٹو پہنچ گئے تھے۔ پرویز ملک صاحب ائرپورٹ کی عمارت کے اندر ہی امیگریشن آفیسر کے کمرے میں موجود تھے۔ بہت خلوص سے ملے۔ ٹورنٹو والوں کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ پاکستان سے ایک فلم یونٹ شوٹنگ کے لئے وہاں پہنچا تھا۔ فن کاروں کی مغربی ملکوں میں بڑی آؤ بھگت کی جاتی ہے اور فلم والوں کو تو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ شوبزنس سے تعلق رکھنے والے ان کے لئے وی آئی پی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پرویز صاحب کو بطور خاص عمارت کے اندر آنے کی اجازت دے دی تھی۔ میگریشن آفیسر صاحب کافی دیر سے ان سے گپ شپ لگا رہے تھے اور پاکستانی فلموں کے ارے میں معلومات حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ یونٹ کے ارکان سے بھی انہوں نے پوچھ گچھ نہیں کی یہاں تک کہ کسٹم والوں نے بھی کسی کا سامان کھول کر دیکھنے کی

ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاہ جی بار بار کسٹم کی طرف جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم نے کہا "شاہ جی! اب تو غلطی ہو گئی۔ اگر معلوم ہوتا کہ یہاں کسٹم والے ہماری اتنی توقیر کریں گے۔ اور ہم پر اندھا بھروسا کریں گے تو سوٹ کیس میں دو چار کلو کوئی چیز ڈال کر لے آتے۔"

اس کے جواب میں شاہ جی نے بہت سنجیدگی سے ہمیں ایک لیکچر پلا دیا "کتنے افسوس کی بات ہے۔ ہم پاکستانیوں کے لئے۔ پہلے یہ لوگ ہم پر بھروسا کرتے تھے۔ اب تو بھروسا ہی اٹھ گیا ہے ہم پر سے۔ لوگ ہرے رنگ کے پاسپورٹ پر ہی شبہ کرنے لگتے ہیں۔ اسکا کوئی بندوبست ہونا چاہئے۔"

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ اس قدر جذباتی ہو جائیں گے۔ ہم نے تو چھیڑنے کے لئے ذرا سا مذاق کیا تھا اور وہاں یہ عالم تھا کہ اک ذرا چھیڑیئے' پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

فلم کا یونٹ اتنا مختصر تھا کہ کینیڈا والوں کو حیرت ہو رہی تھی۔ انہوں نے تو' ہالی ووڈ اور مغربی ملکوں کے فلم یونٹ دیکھے تھے جو سینکڑوں افراد پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہم تو اسی طرح کام کرتے ہیں۔ اپنی جیب کے مطابق فلم کا بجٹ بناتے ہیں۔ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں۔ مگر دوسروں کے سامنے اپنے ملک کی ہیٹی ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لئے ہم نے انہیں بتایا کہ ہمارے یونٹ کے بہت سے لوگ پہلے آچکے ہیں۔ کچھ آنے والے ہیں اور بہت سے لوگوں کی خدمات ہم یہیں سے حاصل کر لیں گے۔ اس طرح کچھ لیپا پوتی کر کے بات بنائی۔ باہر نکلے تو دیکھا کہ اپنے واجد صاحب بازو پھیلائے مسکرا رہے ہیں۔ واجد صاحب کے بارے میں ہم نے چودھری ثناء اللہ اور پرویز ملک کو بتا دیا تھا اور پرویز صاحب شوٹنگ کا اہتمام کرنے کے سلسلے میں ٹورنٹو گئے تھے تو واجد صاحب سے بھی ان کی ملاقاتیں رہی تھیں اور اب واجد صاحب فلم "کامیابی" میں شریک فلم ساز تھے۔ چوہدری ثناء اللہ کے داماد جاوید چوہدری بھی فلم سازوں میں شامل تھے۔ انہوں نے اپنے سرکاری دفتر سے چھٹی لے لی تھی اور اب شوٹنگ کے انتظامات میں مصروف تھے۔

بغل گیر ہو کر علیک سلیک کرنے کے بعد واجد صاحب نے ہمیں بتا دیا کہ فلم ساز و ہدایت کار ایس 'ایم' یوسف ان دنوں یہیں پر ہیں اور جب سے آپ کی خبر سنی ہے منتظر

بیٹھے ہیں۔ ان کا یہ پیغام ہے کہ آپ فوراً ان سے رابطہ قائم کریں۔ یہی پیغام امیگریشن آفس میں ہمیں پرویز ملک صاحب بھی پہنچا چکے تھے۔ جاوید چوہدری صاحب نے بھی خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد یہی کہا کہ ایس ایم یوسف صاحب آپ کے منتظر ہیں۔ گویا تین پیغامات تو ہمیں ائرپورٹ پر ہی موصول ہو گئے۔ اس کے بعد بھی ہمیں جو شخص بھی ملا اس نے یہی کہا کہ یوسف صاحب سے آپ پہلی فرصت میں بات کر لیں۔ ہم یوسف صاحب کے مواصلاتی سسٹم کے قائل ہو گئے۔

یونٹ کے قیام کے لئے ٹورنٹو کے نواح میں بندوبست کیا گیا تھا۔ اس علاقے کا نام مارکھم ہے۔ یہاں ایک بہت اونچی بیس منزلہ عمارت میں ہم لوگوں کو قیام کرنا تھا۔ ندیم اور شبنم پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ ہم لوگوں کے پہنچنے کے بعد شوٹنگ شروع ہوئی تھی۔ اداکار ننھا کو بعد میں آنا تھا۔ چائلڈ اسٹار خرم ہمارے ساتھ ہی گئے تھے۔ باقی ماندہ اداکاروں کے لئے مقامی طور پر بندوبست کرنا تھا۔ گویا پرویز ملک صاحب کام شروع کرنے کے لئے پر تول رہے تھے۔

بیس منزلہ وسیع و عریض عمارت دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے آس پاس سبزہ زار تھے۔ کچھ فاصلے پر دوسری عمارتیں اور شاپنگ سینٹر وغیرہ تھے۔ بہت پر فضا اور شاندار جگہ تھی۔ اس عمارت کی پارکنگ عقب میں تھی جہاں بڑے فٹ بال کے میدان کے سائز کا پارکنگ لاٹ اس عمارت کے مکینوں کی کاروں کے لئے مخصوص تھا۔ عمارت کے اندر داخل ہونے کا راستہ عقب سے بھی تھا اور سامنے سے ایک خاصی بڑی لابی تھی اور تین جہازی سائز کی لفٹیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ ہم نے جاتے ہی لفٹوں کا جائزہ لیا۔ کہانی میں ایک اہم منظر یہ بھی تھا کہ ندیم صاحب اپنے بیٹے خرم کو اپنے ہمراہ لے کر دفتر جاتے ہیں اور انہیں لابی میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ خرم صاحب نچلے نہیں بیٹھ سکتے۔ وہ ایک لفٹ میں داخل ہو جاتے ہیں اور مختلف قسم کے بٹن اتنی تیزی سے دباتے ہیں کہ لفٹ پھنس کر رہ جاتی ہے۔ ساری عمارت میں پریشانی پھیل جاتی ہے' فائر بریگیڈ آجاتا ہے' لفٹ کے کاریگر پہنچ جاتے ہیں' لابی میں ایک ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ مختلف لوگ خرم کو مختلف قسم کی ہدایات جاری کر رہے ہیں کہ فلاں بٹن دباؤ فلاں بٹن نہ دباؤ۔ پنکھا چلا دو۔ سانس زیادہ زور سے نہ لو۔ وغیرہ وغیرہ خرم پریشانی کے عالم میں مزید

حماقتیں کر رہے ہیں۔ ادھر ندیم صاحب اوپر کی منزل میں اپنی گرل فرینڈ سے گپ شپ میں مصروف ہیں۔ جب عمارت میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں اور افراتفری مچ جاتی ہے تو وہ بھی لابی میں جا کر دیکھتے ہیں کہ ایک ہنگامہ برپا ہے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے کہ یہ حرکت ان کے لختِ جگر خرم کی ہے۔ اچانک انہیں اپنے بیٹے کا خیال آتا ہے۔ وہ خرم کو اردو میں ضروری ہدایات دیتے ہیں جس کی مدد سے لفٹ کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ ہجوم ایک دوسرے سے سوالات کرنے میں مصروف ہے اور خرم صاحب لوگوں کی ٹانگوں کے بیچ سے نکلتے ہوئے چپکے سے عمارت کے باہر پہنچ جاتے ہیں۔ ہم یہ اندازہ لگانا چاہ رہے تھے کہ کیا یہ سین اس لفٹ میں فلمایا جا سکتا ہے؟ بعد میں یہ منظر اس جگہ فلمایا گیا اور خوب ہنگامہ رہا فائر بریگیڈ والے بھی تھے' سیکورٹی پولیس بھی تھی اور بجلی والے بھی موجود تھے۔ جب لابی میں ہجوم اکٹھا ہوا تو وہ لوگ یہی سمجھے کہ سچ مچ کوئی بچہ اندر پھنس گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آس پاس بھی یہ خبر پہنچ گئی اور ان لوگوں نے پولیس اور فائر بریگیڈ کو فون کرنے شروع کر دیے کہ فلاں عمارت میں ایک بچہ لفٹ میں پھنس گیا ہے۔ ہم لوگ ابھی وہ منظر فلمانے میں مصروف تھے کہ اچانک سائرن بجنے شروع ہو گئے اور مختلف محکموں کی کاریں شور مچاتی ہوئی ہماری بلڈنگ کے سامنے جمع ہو گئیں۔ ان میں پولیس کاریں بھی تھیں' فائر بریگیڈ کی کاریں بھی تھیں اور ایمبولینس کاریں بھی شامل تھیں۔ فائر بریگیڈ والوں نے تو پہنچتے ہی عمارت پر اوپر چڑھنے کی جگہیں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ لمبی لمبی آٹومیٹک سیڑھیاں کاروں سے باہر نکل کر عمارت کی اونچی منزلوں تک پہنچ گئیں۔ عملے کے کچھ لوگوں نے جال بھی کھول کر لگا دیا تاکہ اگر کوئی ادھر سے چھلانگ لگائے تو فرش پر گر کر ہلاک یا زخمی نہ ہو جائے بلکہ جال پر گرے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بلڈنگ کے سامنے والی بڑی سڑک پر مختلف محکموں اور شہریوں کی گاڑیوں کا مجمع لگ گیا۔ ہر شخص پریشان اور متفکر تھا اور قیامت کا سماں تھا۔ ان لوگوں کی پھرتی' مستعدی اور کارکردگی دیکھ کر ہم تو حیران رہ گئے۔ سب سے پہلے تو ہم نے باہر کے فائر بریگیڈ والوں کو بتایا کہ یہ سیڑھیاں اور جال وغیرہ ہٹا لیجئے۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بچہ لفٹ میں پھنس گیا ہے۔ انہوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا پھر لفٹ کی جانب دوڑے۔ ہم نے بہت مشکل سے انہیں روکا اور کہا کہ ادھر جانے کی ضرورت نہیں ہے

کیونکہ دراصل یہ سب ایک فلم کے منظر کا حصہ ہے جس کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ لابی میں جو لوگ اکٹھے ہو گئے تھے وہ سب کے سب لفٹ کے پاس جا کر بچے سے باتیں کرنا چاہتے تھے تاکہ اس کا دل بہل جائے۔ انہیں روکنے میں بہت مشکل پیش آ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے سین مکمل ہوا۔ خرم صاحب لفٹ سے باہر نکلے تو لابی میں منتظر خواتین و حضرات محبت سے ہاتھ پھیلا کر ان کی جانب بڑھے مگر وہ سین کی ضرورت کے مطابق چپکے سے غائب ہو گئے۔ مگر ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ ایک معمولی سے حادثے پر سرکاری محکمے اور عام لوگ کس قدر پریشان ہو گئے تھے۔ ہمارے ملک میں تو اگر لفٹ میں کوئی پھنس جائے تو گھنٹوں کوئی اس کی خبر ہی نہیں لیتا اور سرکاری محکمے کا تو کوئی فرد وہاں پہنچتا ہی نہیں ہے۔

یہ دراصل بعد کی باتیں ہیں مگر اب ذکر چل نکلا ہے تو اس کا کچھ اور بیان ہو جائے۔ فلم کی کہانی کے بارے میں آپ کو بتا چکے ہیں کہ ندیم صاحب بیوی کی وفات کے بعد پاکستان سے کینیڈا جا کر وہاں آباد ہو گئے ہیں۔ اور کسی طرح واپس لوٹنے کا نام نہیں لیتے۔ وہاں وہ ایک بے فکرے اور کھلنڈرے نوجوان جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس عمر میں یورپ اور امریکہ نوجوانوں کو بہت اچھا لگتا ہے۔ وہاں کی رنگینی' چمک دمک' خوب صورتی' حسن و جمال کی فراوانی اور ہر قسم کی آزادی ایسی نعمتیں ہیں جو انہیں اپنے ملک میں حاصل نہیں ہوتیں۔

وہ ان ترغیبات کے فریب میں آ جاتے ہیں۔ بھٹک جاتے ہیں اور غلط فیصلے کر لیتے ہیں۔ اکثر نوجوان جوانی کے جوش اور حسن و جمال کی طلب میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ وہیں کی لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں مگر جب جذبات کا چڑھا ہوا دھارا اترتا ہے اور حالات معمول پر آتے ہیں تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ اس ماحول میں خوش و خرم نہیں رہ سکتے۔ مغربی بیویاں ان کے طرز فکر اور انداز معاشرت سے بیگانہ ہوتی ہیں۔ پھر اولاد کی پرابلم ہے جسے انگریز ماں کی گود میں وہی تربیت ملتی ہے جو ان کے معاشرے میں عام ہے۔ اس طرح محرومی' مایوسی اور پچھتاوے کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ خاندان برباد ہو جاتے ہیں۔ بچے نہ مشرق کے رہتے ہیں' نہ مغرب کے۔ دونوں میں سے کوئی تہذیب بھی پوری طرح انہیں نہیں اپناتی اور نہ ہی وہ خود ان میں سے کسی ایک انداز زندگی کو اپناتے

ہیں۔ اس طرح وہ وطن میں رہ کر بھی بے وطن اور خاندان کے ہوتے ہوئے بھی لاوارث، تنہا اور بے سہارا رہ جاتے ہیں۔ انہیں یہ احساس شدت سے ہونے لگتا ہے کہ جس طرح ہر پودا ہر موسم اور ہر مٹی میں نہیں اگ سکتا اس طرح انسانوں کے لئے بھی ان کے مزاج کے مطابق سرزمین، کلچر اور ماحول لازمی ہے۔ فلم "کامیابی" اسی موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔

کہانی کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ خرم جس نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے باپ کو نہیں دیکھا، صرف اس کی تصویر ہی دیکھی ہے اپنے باپ کا نادیدہ عاشق ہے۔ جب وہ دادا دادی کی باتیں سن کر یہ اندازہ لگاتا ہے کہ اس کا باپ پاکستان آنے سے گریز کرتا ہے تو وہ بذات خود ندیم کے پاس کینیڈا جانے کی خواہش ظاہر کرتا ہے اور پوتے کی ضد کے آگے دادا اور دادی مجبور ہو کر خرم کو کینیڈا بھیجنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ندیم کو بذریعہ تار خرم کی آمد کی اطلاع دی جاتی ہے مگر وہ تار ندیم کو نہیں ملتا کیونکہ وہ چھٹی منانے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ خرم ٹورنٹو کے ائرپورٹ پر اس توقع سے گیا ہے کہ اس کا باپ وہاں اسے ریسیو کرے گا مگر ابا جان کا دور دور تک پتا نشان نہیں ہے۔ ایک اجنبی ملک، انجانا شہر اور بے سہارا نو عمر بچہ۔ وہ تو شکر ہے کہ ایک پاکستانی صاحب خرم کی جناح کیپ دیکھ کر اس سے مخاطب ہو جاتے ہیں اور ندیم کے پتے پر اسے اپارٹ منٹ پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ تو بچے کو چھوڑ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ خرم فلیٹ کی گھنٹیاں بجا بجا کر تنگ آجاتا ہے مگر کوئی موجود ہو تو جواب دے۔ بے چارہ ایک گیلری میں سامان سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ رات گئے ندیم صاحب اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ واپس آتے ہیں۔ وہ کینیڈا میں رہ کر مغرب کے رنگ میں مکمل طور پر رنگے جا چکے ہیں۔ ابھی دم بھی نہیں لینے پاتے کہ کال بیل بجتی ہے۔ دروازہ کھولتے ہیں تو سامنے ایک آٹھ نو سال کا لڑکا، جناح کیپ پہنے ہوئے کھڑا ہے۔ انہوں نے تو اپنے بچے کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اور اس کی آمد کے بارے میں کوئی گمان تک نہ تھا۔ حیران ہو کر دیکھتے ہیں۔ بچہ اپنے ڈیڈی کو پہچانتا ہے۔ خوش ہو کر آگے بڑھتا ہے۔

ندیم پریشانی سے "کیا بات ہے، کون ہو تم؟"

بچہ۔ "ارے ڈیڈی آپ مجھے نہیں پہچانے؟ میں خرم ہوں۔"

ندیم: "خرم (سوچتے ہوئے) کون خرم؟"

بچہ: ارے؟ مجھے نہیں پہچانتے آپ کا بیٹا خرم۔"

ندیم: "میرا بیٹا؟ یہاں کیسے آگیا؟"

بچہ: "پی آئی اے سے آیا ہوں اور آپ مجھے لینے ائرپورٹ کیوں نہیں آئے۔"

ندیم: "ائرپورٹ؟"

بچہ: "آپ کو دادا جان نے تار بھی دیا تھا کہ میں آرہا ہوں۔ مجھے ائرپورٹ سے لے لیں۔"

ندیم: "تو تم وہ والے خرم ہو۔ میرے بیٹے۔"

بچہ: "جی ہاں، وہی خرم ہوں۔ اب مجھے اندر تو آنے دیں۔"

اب ندیم صاحب کا مسئلہ یہ ہے کہ اندر ایک گرل فرینڈ موجود ہے اور دروازے پر ا کھڑا ہے۔ بہرحال مجبوراً اسے اندر لے جاتے ہیں اور دبی زبان میں بگڑتے ہیں نہیں آنے کو کس نے کہا تھا؟"

بچہ "دادا دادی نے۔"

ندیم: "اچانک منہ اٹھا کر چلے آئے۔ یہ کیا طریقہ ہے؟"

بچہ: "اچانک نہیں آیا۔ چار دن پہلے آپ کو تار دیا تھا مگر آپ تو سیر سپاٹے کر ے ہیں۔"

اسی دوران میں گرل فرینڈ اوپر سے آجاتی ہے۔ بچے کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ے"

"یہ کون بچہ ہے؟"

اب ندیم صاحب کی مشکل یہ ہے کہ انہوں نے کسی کو یہ نہیں بتایا ہے کہ وہ وے ہیں اور ان کا ایک بچہ بھی ہے۔ بات بنانے کی کوشش کرتے ہیں مگر بچہ بھانڈا ڑ دیتا ہے جس کے نتیجے میں گرل فرینڈ 'فریبی دھوکے باز' کہتی ہوئی اپنا سامان سمیٹ کر جاتی ہے۔ اس طرح کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ اب خرم کی خواہش یہ ہے کہ باپ کو ے ساتھ پاکستان لے کر جائے اور ندیم کا کہنا ہے کہ چند روز یہاں گھوم پھر لو پھر تمہیں ں بھیج دوں گا۔ بچے کو مغربی طور طریقے بالکل پسند نہیں ہیں۔ باپ سے اسے بے انتہا

پیار ہے مگر وہ جس رنگ میں رنگا جا چکا ہے وہ خرم کو ناپسند ہے۔ اس طرح روز اول ہی سے باپ اور بیٹے کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور کافی دلچسپ واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ندیم کی مشکل یہ ہے کہ مغرب میں چھوٹے بچے کو نہ تو گھر میں تنہا چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ ہی اپنے ساتھ لے کر کام کاج پر جا سکتے ہیں۔ ندیم صاحب ایک روز بچے کو گھر پر چھوڑ جاتے ہیں تو وہ خاصی پرابلمز پیدا کر دیتا ہے۔ اسے ڈانٹتے اور ناراض ہو کر پکڑنے کے لئے دوڑتے ہیں تو وہ شور مچا دیتا ہے اور ندیم صاحب پڑوسیوں کے ڈر سے خاموش ہو جاتے ہیں۔ بچے کو نہ تو بے جا ڈانٹ سکتے ہیں نہ مار پیٹ سکتے ہیں کہ قانون کا ڈر ہے۔ بچے کے اصرار پر ایک دن اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تو وہ اتنی پرابلمز پیدا کر دیتا ہے کہ ندیم صاحب مشکل میں پھنس جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ گرفتار کر لئے جاتے ہیں۔ ان کے ایک ڈاکٹر دوست ضمانت دیتے ہیں کہ آئندہ یہ بچے کا بہت زیادہ خیال رکھیں گے۔ محکمے والے بچے سے بھی کہتے ہیں کہ ہم تم سے پوچھتے رہیں گے اگر ڈیڈی تمہیں نظ انداز کریں یا مناسب توجہ نہ دیں تو ہم انہیں پھر پکڑ لیں گے۔ لفٹ کے واقعے کے بعد خرم صاحب باپ کی ناراضی کے ڈر سے بھاگ کر سڑک پر چلے جاتے ہیں۔ کافی بھاگ دوڑ ہوتی ہے یہاں تک کہ نوبت پولیس اور جیل تک پہنچ جاتی ہی۔ اب ندیم صاحب سنجیدگی سے سوچتے ہیں کہ آخر اس مسئلے کا حل کیا ہو؟ بیٹا باپ کے بغیر واپس جانے کو تیا نہیں ہے۔ باپ اسے اپنے ہمراہ رکھنے پر آمادہ نہیں ہے۔ باپ کا بس نہیں چلتا کہ بیٹے کو فوراً واپس بھیج دے۔ آخر باپ بیٹے میں یہ تصفیہ ہوتا ہے کہ بیٹا باپ کو تنگ نہیں کرے گا۔ اس کے معمولات میں دخل نہیں دے گا۔ اچھا بچہ بن کر رہے گا تو آزمائش کے طو پر اسے وہاں چھٹیاں گزارنے کی اجازت مل جائے گی۔

فلم کے کچھ اور کردار بھی باری باری کہانی میں نمودار ہوتے ہیں۔ ایک پاکستا ڈاکٹر صاحب ہیں جو ایک مقامی لڑکی سے شادی کر کے پچھتا رہے ہیں ایک اور پاکستا صاحب ہیں جنہوں نے ایک میم سے شادی کر رکھی ہے۔ ان کا ایک نو عمر بیٹا بھی ہے۔ صوبہ سرحد کے ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ گاؤں میں ان کا بوڑھا باپ تنہا رہ گیا وہ اپنے باپ کو کینیڈا بلوا لیتے ہیں۔ اب خان صاحب کی مشکل یہ ہے کہ وہ ساری زند صوبہ سرحد کے ایک گاؤں میں رہے ہیں اور خالص پٹھان ہیں۔ انگریزی سے بالکل نابل

ہیں۔ اردو بھی پٹھانوں کے لب و لہجے میں بولتے ہیں۔ کہاں سرحد کا گاؤں اور کہاں ٹورنٹو شہر۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ خان صاحب کو ایک شکایت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے پوتے کی بات نہیں سمجھتے اور پوتا ان کی زبان نہیں سمجھتا۔ بہو سے بات چیت کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ان کی زندگی وبال جان ہو گئی ہے مگر پوتے کی محبت سے مجبور ہو کر واپس بھی نہیں جانا چاہتے۔ اپنے بیٹے سے کہتے رہتے ہیں کہ واپس اپنے وطن چلو۔ یہ کردار ننھا نے بہت خوب صورتی سے کیا تھا۔ فلم کا ایک اور مرکزی کردار شبنم ہیں جو تعلیم کے سلسلے میں کینیڈا پہنچی تھیں۔ وہ ایک خالص مشرقی لڑکی ہیں اور اپنے کاموں سے فارغ ہو کر بلا تاخیر واپس پاکستان جانا چاہتی ہیں۔ ندیم صاحب ایک دل پھینک آدمی ہیں۔ ہر خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر ریشہ خطمی ہو جاتے ہیں۔ اور ہر ایک سے ان کی گفتگو کا آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے کہ مجھے تم جیسی لڑکی کی تلاش تھی۔ لڑکی کے چہرے مہرے کی مناسبت سے اس کے فقرے میں تبدیلی بھی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً نیلی آنکھوں والی لڑکی سے کہیں گے: نیلی آنکھیں میری کمزوری ہیں۔ سنہرے بالوں والی سے کہیں گے: سنہرے بال میری کمزوری ہیں' چنانچہ شبنم کو دیکھ کر بھی انہوں نے حسب معمول اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ شروع میں تو فلرٹ کرتے رہے اور جھوٹ بولتے رہے۔ مگر جب شبنم کی ملاقات خرم سے ہوئی تو اسے ان کا سارا کچا چٹھا معلوم ہو گیا۔ دل لگی رفتہ رفتہ دل کی لگی میں بدل گئی۔ اب یہ کشمکش پیدا ہو گئی کہ شبنم واپس پاکستان جانا چاہتی ہے اور ندیم صاحب مغرب کی زندگی سے کنارہ کش ہونے پر آماد نہیں ہیں۔ یہ کہانی کا خلاصہ اس لئے پیش کیا گیا ہے تاکہ آئندہ پیش آنے والے واقعات اور شوٹنگ کی تفصیل بیان کی جائے تو پس منظر سے آگاہی ہو۔

ہماری اپارٹمنٹ بلڈنگ بہت بڑی اور شاندار تھی۔ ہر منزل پر بے شمار اپارٹ منٹ تھے اور عمارت بیس منزلوں پر مشتمل تھی۔ فلیٹوں میں مختلف قسم کے افراد اور خاندان رہتے تھے مگر سب اپنے کمروں کی چار دیواری کے پیچھے۔ گیلری لابی یا لفٹ میں آتے جاتے اگر ملاقات ہو جاتی تو مسکرا کر ایک دوسرے کو "وش" کر لیتے۔ اس کے سوا یہاں رہنے والوں کا ایک دوسرے سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ بلکہ کوئی یہ تک نہیں جانتا تھا کہ برابر والے اپارٹ منٹ میں کون رہتا ہے۔ کس وقت آتا ہے' کس وقت جاتا ہے۔ اور کیا کرتا ہے۔ بعض لڑکیاں اپنی بائسکلیں لے کر لفٹ کے ذریعے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آتی جاتی رہتی تھیں۔ نگاہ ملنے پر مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ہو جاتا تھا اور بس۔ یورپ کی لڑکیوں کو اگر بہت غور سے نہ دیکھو اور ان کے باہمی فرق کو یاد نہ کرو تو بظاہر ان میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا اور پھر ان کی پہچان تو اور بھی مشکل کام ہے۔ کم از کم ہمارے لئے۔ چنانچہ کئی بار جب ہمیں سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر سائیکلیں چلاتی ہوئی دو شیزاؤں نے مسکرا کر دیکھا اور جوش و خروش سے ہاتھ بھی ہلائے تو ہم ٹورنٹو میں اپنی مقبولیت سے بہت خوش ہوئے۔ یہ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ یہ وہی لڑکیاں ہیں جو ہماری بلڈنگ میں رہتی ہیں اور جن سے اکثر ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ سائیکل چلانا اور اسکیٹنگ کرنا یہاں کے لڑکے لڑکیوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ آپ فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں یا کہیں جا رہے ہیں کہ اچانک ہوا کے جھونکے کی مانند ایک لڑکی آپ کے پاس سے یوں گزر جائے گی جیسے فضا میں تیرتی ہوئی جا رہی ہو۔ مگر یہ پرواز نہیں کرتی بلکہ اسکیٹنگ کر رہی ہے۔ اس کی پرواز کا راز اس کے پیروں میں ہے۔ اسی طرح سائیکل پر سوار لڑکیاں بھی خوش رنگ تتلیوں کی مانند فضا میں پرواز کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ گرد غبار سے پاک ماحول'

سبزہ' خوب صورت عمارتیں' قد آور درخت' پھولوں کے تختے' خوشبوئیں' دمکتے حسین چہرے' فضا پر پرواز کرتی ہوئی تتلیاں۔ ہر چیز میں سلیقہ' شائستگی اور نظم و نسق یہ وہ چیزیں ہیں جو مغربی شہروں میں بہت نمایاں طور پر نظر آتی ہیں اور متاثر بھی کرتی ہیں۔ کاش ہمارے ہاں بھی ایسا ہو سکے۔

لفٹ پر سوار ہوتے ہوئے ہماری جان نکل جاتی ہے۔ ہم نے لوگوں کو گھنٹوں لفٹ میں بند' عمارتوں میں معلق لٹکے ہوئے دیکھا ہے۔ شکر ہے کہ خود ہمارے ساتھ کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا مگر ہم لفٹ میں بند ہونے سے بھی اتنا ہی ڈرتے ہیں جتنا کہ پانی میں ڈوبنے سے اس لئے ہماری کوشش ہوتی ہے کہ لفٹ نہ استعمال کی جائے۔ پانچ چھ منزلہ عمارتوں پر تو ہم بلا جھجک سیڑھیوں کے راستے چڑھ جاتے ہیں اگر نو دس منزلیں ہوں تو مجبوراً سیڑھیوں کا راستہ اختیار کرتے ہیں لیکن بیس منزل عمارت میں اگر آپ انیسویں منزل پر مقیم ہوں تو سیڑھیوں کے ذریعے اوپر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے لفٹ میں قدم رکھا اور اپنا دھیان بٹانے کے لئے واجد صاحب اور جاوید صاحب سے باتیں کرتے رہے مگر نگاہیں وہیں جمی ہوئی تھیں جہاں گزرتی ہوئی منزلوں کے نمبر نمودار ہو رہے تھے۔ پلک جھپکنے میں ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ لفٹ انتہائی تیزی رفتاری سے چلتی ہے۔ ہم دراصل اپنے ملک کی لفٹوں کے عادی ہیں۔ جہاں اکثر تو لفٹ خراب ہی رہتی ہے اور اگر درست بھی ہو تو بیل گاڑی کی رفتار سے ہچکولے کھاتی ہوئی ایسے چلتی ہے جیسے لفٹ نہ ہو جھولا جھلانے کی مشین ہو۔ جن ملکوں میں عمارتیں بہت بلند ہوتی ہیں وہاں لفٹیں بھی تیز رفتار ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ تو ہونے سے رہا کہ کسی کو پانچویں منزل پر جانا ہے تو وہ لفٹ میں داخل ہونے کے بعد آرام سے لیٹ کر سو جائے کہ کبھی نہ کبھی تو منزل پر پہنچ جائیں گے۔

انیسویں منزل پر پہنچ کر انسان کا معیار زندگی بھی خود بخود بلند ہو جاتا ہے۔ ہمارے اپارٹمنٹ کا نمبر انیس سو سترہ تھا۔ بہت آرام دہ اور کشادہ جگہ تھی۔ دو بیڈ روم' داخل ہوتے ہی سامنے سٹنگ روم' اسی میں ایک جانب کھانے کی میز' برابر میں باورچی خانہ جس میں کھانا پکانے کا تمام سامان موجود رہتا ہے۔ فریج' بجلی کا چولھا' کراکری' برتن یہاں تک کہ استری کرنے کے لئے آئرن بھی موجود۔ اس قسم کے اپارٹمنٹ مغربی ملکوں میں تو عام

ہیں مگر اب جن ایشیائی ملکوں میں سیاحت نے ترقی کرلی ہے وہاں بھی یہی دستور ہو گیا ہے۔ یہ اپارٹمنٹ ہر لحاظ سے ہوٹل سے بہتر ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ کرایہ ہوٹل کے مقابلے میں بہت کم۔ دوسرے یہ کہ گھر کا تمام آرام' جو چاہے جب چاہے پکائیں اور جب جی میں آئے کھائیں۔ جب چاہیں لیٹیں اور جب چاہیں بیٹھیں۔ دلچسپی کے لئے ٹیلی ویژن بھی موجود ہے۔ اس وقت تک پاکستان میں ریموٹ کنٹرول ٹیلی ویژن زیادہ عام نہیں ہوا تھا۔ مگر ہمارے کمروں میں ایسے ہی ٹیلی ویژن موجود تھے۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ ہم تو پاکستان میں لے دے کر ایک پی ٹی وی کے چینل پر گزارہ کر رہے تھے۔ وہاں درجنوں بلکہ سینکڑوں چینل آپ کی نگاہ التفات کے محتاج و منتظر ہیں۔ ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبائیں تو امریکہ' کینیڈا کا کوئی بھی چینل دیکھ لیں اور ہر جگہ سے مختلف قسم کے دلچسپ پروگرام ہر وقت جاری رہتے ہیں۔ کہیں سے فلم دکھائی جا رہی ہے تو کہیں ذہنی آزمائش کا مقابلہ ہے۔ کہیں کھیل کود ہو رہا ہے۔ کسی جگہ کامیڈی چل رہی ہے۔ اس قدر دلچسپ اور رنگین کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بیک وقت کیا کیا دیکھیں اور کیا کیا نہ دیکھیں۔ ہمیں تو ذاتی طور پر زیادہ چینل والا سسٹم پسند ہی نہیں ہے یا پھر ایسا ہو کہ پروگرام ہمارے پی ٹی وی کی طرح ہوں کہ کبھی اتفاق سے کوئی دلچسپ پروگرام آگیا تو آگیا ورنہ بیٹھے بور ہوتے رہیں۔ اور جمائیاں لیتے رہیں۔

ہم اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو پرویز ملک صاحب کی بیگم اور بچی نادیہ وہاں موجود تھیں۔ نادیہ ہماری بیٹی پارو کی طرح چھ سات سال کی ہو گی۔ ان دونوں نے تو فوراً ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ہمارے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ مناسب سمجھیں تو الگ اپارٹمنٹ میں چلے جائیں۔ یا دل چاہے تو اسی جگہ پرویز صاحب کے ساتھ رہیں۔ ہم نے پرویز صاحب کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی مگر بعد کے تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ ہماری بہت سنگین غلطی تھی۔ ایک تو ضروری بات چیت اور مشوروں کے لئے ہر وقت یونٹ کے لوگ یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ یونٹ والوں کا کھانا بھی اسی باورچی خانے میں تیار ہوتا تھا۔ ناشتا تو وہ لوگ اپنے اپنے اپارٹمنٹ میں بنا لیتے تھے مگر کھانا یہیں سے پک کر جاتا تھا لیکن بعد میں کئی لوگوں نے سرکاری مطبخ سے کھانا لینے کے بجائے خود اپنی پسند کا کھانا اپنے ہی باورچی

خانوں میں پکانا شروع کر دیا۔ ہم نے ایک خالی بیڈ روم میں اپنا سامان رکھا اور ہاتھ منہ دھو کر چائے پینے کے لئے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ وہاں واجد صاحب بھی موجود تھے۔ پرانی باتیں اور یادیں دہرائی گئیں۔ چائے کا دور تو وہاں ہر وقت چلتا ہی رہتا تھا۔ بات یہ ہے کہ اگر چائے بنانا ایسا ہی آسان ہو جائے تو پھر کون ہے جو چائے نہیں پیئے گا۔ پانی ایک منٹ میں تیار ہو جاتا تھا۔ اب آپ کا کام صرف اتنا ہے کہ کچن سے ایک مگ اٹھایا ۔ اس میں اپنی پسند کی چینی ڈالی۔ چائے کا ایک بیگ ڈالا اور لیجئے چائے تیار ہو گئی۔ اس آسانی کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ خواہ مخواہ باتیں کرتے کرتے بے دھیانی میں بھی چائے بنا کر پیتے رہتے تھے۔ کمرے میں پرویز صاحب ٹیلی ویژن کا ریموٹ کنٹرول لئے بیٹھے تھے۔ دس بارہ بٹن دبانے کے بعد انہیں ایک چینل پر ایک من پسند فلم نظر آگئی۔

فلم واقعی بہت اچھی تھی اور کافی عرصے بعد ٹیلی ویژن پر دوبارہ یہ فلم دیکھنے کا لطف ہی اور تھا۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور پرویز صاحب نے فون اٹھا لیا۔ دروازے پر کال بیل کی آواز سن کر ہم دروازے پر چلے گئے۔ وہاں ندیم کھڑے مسکرا رہے تھے۔ خوب زور شور سے علیک سلیک ہوئی۔ حال احوال پوچھا گیا۔ اب جو کمرے میں واپس گئے تو معلوم ہوا کہ ہم جو فلم دیکھ رہے تھے وہ غائب ہے اس کی جگہ پہلوانی کے مقابلے ہو رہے ہیں' ہم بہت حیران ہوئے کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا؟ ماجرا یہ ہوا تھا کہ نادیہ اور پارو کھیلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئیں تو انہوں نے بھی شغل کے طور پر ریموٹ کنٹرول اٹھا کر بٹن دبانے شروع کر دیے۔ ہم لوگوں نے بہت کوشش کی بہت تلاش کیا مگر وہ چینل دوبار نہیں ملا۔ اگر ٹیلی ویژن پر زیادہ چینل ہوں اور ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول بھی ہو تو پھر اس قسم کے "حادثات" پیش آنا لازمی ہے۔ بعد میں یہ اکثر ہوتا رہتا تھا کہ اچھا خاصا کوئی پروگرام دیکھ رہے ہیں' اچانک کسی نے آکر ریموٹ کنٹرول کے بٹن دبانا شروع کر دیے اور چینل گم ہو گیا۔ بعد میں ہم نے تو یہ ترکیب نکالی تھی کہ کسی وقت ٹی وی کے سامنے سے چند لمحے کے لئے ہٹنا پڑتا تو ریموٹ کنٹرول اپنے ساتھ ہی لے جاتے تھے۔ پرویز صاحب فون سن کر آ گئے تھے اور یہ بتا رہے تھے کہ ایک صاحب نے ایس ایم یوسف صاحب کا پیغام دیا ہے کہ وہ آپ کے منتظر ہیں۔ جیسے ہی اپارٹمنٹ پر پہنچیں ان سے رابطہ

قائم کریں۔ دس پندرہ منٹ کے اندر ہمیں اس قسم کے پندرہ پیغام مل گئے۔ ہم نے بہتری اسی میں سمجھی کہ یوسف صاحب سے فون پر بات کرلی جائے۔ نمبر ملا دیا تو دوسری طرف سے یوسف صاحب ہی نے فون اٹھایا۔ آواز سنتے ہی بولے "آپ اتنی دیر میں ٹورنٹو کیوں آئے ہیں۔ آپ کو تو تین دن پہلے آنا چاہئے تھا۔"

ہم نے بتایا کہ لندن میں چوبیس گھنٹے کی تاخیر ہوگئی۔

فرمایئے کیا حکم ہے؟

بولے "آپ فارغ کب ہوں گے میرے پاس آجائیں یا پھر مجھے وقت بتائیں تو میں آجاؤں۔"

ہم نے عرض کی "یوسف صاحب ابھی تو ہم کمرے میں داخل ہوئے ہیں پروگرام کا کچھ علم نہیں ہے۔ جیسے ہی ابتدائی کاموں سے فرصت ملی ہم خود آپ کے پاس آجائیں گے۔"

کہنے لگے "بس میں آپ کے انتظار میں ہی بیٹھا ہوں۔ کہیں نہیں جاؤں گا۔"

ندیم کے ساتھ گپ شپ ہوتی رہی۔ ان کے ساتھ گپ شپ عموماً یک طرفہ ہوتی ہے کیونکہ وہ بہت کم بولتے ہیں۔ زیادہ تر ہنستے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں۔ بیچ بیچ میں کوئی ایک فقرہ بول دیتے ہیں۔ ہم سب کی بیویاں ان کی بیوی پر رشک کرتی ہیں کہ گھر میں بولنے کا سو فیصد موقع انہی کو ملتا ہوگا حالانکہ جتنا ہم نے دیکھا ہے فرزانہ ندیم بھی زیادہ بولنے کی عادی نہیں ہیں۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے گھر میں میاں بیوی کی مختصر سی گفتگو کے بعد جو وقت بچ رہتا ہے اس میں کون بولتا ہوگا؟

ندیم نے کچھ فلمیں دیکھی تھیں، کچھ کتابیں پڑھی تھیں جس سے وہ کافی متاثر تھے۔ ندیم ہماری فلمی صنعت میں غالباً واحد ہیرو ہیں جو باہر کی فلمیں بھی باقاعدگی سے دیکھتے ہیں اور شام کو سوشل تقاریب میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو سوچنے سمجھنے کے لئے کافی وقت مل جاتا ہے۔ جب کہ ان کے دوسرے ہم عصروں کو شوٹنگ سے یا دوسری فضول قسم کی مصروفیات سے فرصت نہیں ملتی۔ جس کی وجہ سے ان کی اداکاری منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی دوران میں شبنم کا ٹیلی فون بھی آگیا وہ ہم سے نیچے والی منزل پر مقیم تھیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ "بیٹھک" اس کمرے میں ہو رہی

ہے تو وہ اور روبن گھوش بھی وہیں چلے آئے۔ روبن اور شبنم بہت اچھا اور مثالی جوڑا ہیں۔ ہنس مکھ، خوش اخلاق اور فیاض، کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ 1960 سے لے کر 1982 تک کا عرصہ پاکستان کی فلمی صنعت میں گولڈن دور تھا۔ ایسے لوگ، ایسے فن کار، ایسا ماحول اور ایسی فلمیں تو بس اب خواب و خیال بن گئے ہیں اور جیسے لوگ اب فلمی صنعت میں جلوہ گر ہو رہے ہیں انہیں دیکھ کر تو یوں لگتا ہے جیسے وہ دور اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ شبنم اور ندیم جہاں اکٹھے ہو جائیں وہاں ان میں نوک جھونک اور فقرے بازی ضرور ہوتی ہے۔ شبنم کو یہ پرابلم تھی کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ زبانی مکالمہ بازی میں ندیم سے ہار نہیں مانتی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی ندیم سے کہا "ارے بیگ صاحب! آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟"

"کیوں اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

"آپ نے اپنے ڈائیلاگ یاد کرلئے ہیں کیا؟"

"آپ کو میرے ڈائیلاگ کی فکر کیوں پڑی ہوئی ہے؟"

"کیوں نہ پڑے۔ جب آپ ڈائیلاگ بولتے ہیں تو مشکل تو مجھے ہی پڑ جاتی ہے۔"

پھر وہ پرویز صاحب سے کہنے لگیں "دیکھئے پرویز صاحب، آپ اپنے آرٹسٹوں کو بولئے کہ ڈائیلاگ یاد کئے بغیر سیٹ پر نہ آیا کریں۔"

پرویز صاحب ہنسنے لگے "شبنم کیسی باتیں کرتی ہو۔ ہمارے آرٹسٹ ڈائیلاگ نہیں بھولتے روبن نے پوچھا، اور ندیم صاحب، آپ ایسا کیسے کرلیتے ہیں؟"

ندیم نے مسکرا کر کہا "روبن! ڈائیلاگ تو میں بھی بھول جاتا ہوں۔ مگر کیونکہ یہ میری اپنی زبان ہے اس لئے اپنی طرف سے لگا کر پورا کرلیتا ہوں۔"

"دیکھا آپ نے کیسے چالاک ہیں؟" شبنم نے کہا۔

"فلموں کے ہیرو تو چالاک ہی ہوتے ہیں۔ ہاں ہیروئنیں البتہ سیدھی سادی اور بے وقوف ہوتی ہیں۔"

"آپ ہمارا انسلٹ کر رہے ہیں۔"

"بھئی آپ تو بہت چالاک ہیروئنیں ہیں۔ میں تو دوسری ہیروئنوں کی بات کر رہا تھا مگر مجھے کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ روبن کو کیا ہو گیا تھا؟"

"کیا ہو گیا تھا؟"

"بھئی آپ ہیں موسیقار اور گلوکار' اور بیوی ایسی پسند کر لی جو گانا سنتے ہوئے بھی بے سری ہو جاتی ہے۔"

سب ہنسنے لگے۔ خود شبنم بھی ہنس پڑیں۔ پرویز صاحب کی بیگم ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لئے بیٹھی تھیں اور کھٹ کھٹ کھٹ کر کے بہت تیزی سے چینل تبدیل کر رہی تھیں۔ پرویز صاحب نے ان سے کہا "بیگم اگر آپ امریکہ اور کینیڈا کے سارے چینل چیک کر چکی ہیں تو ان غریبوں کو چائے بھی پلوا دیں۔"

شاہین بھابی سادگی سے کہنے لگیں "میں تو بچے والی فلم تلاش کر رہی ہوں۔ پتا نہیں کس چینل پر تھی۔"

پرویز صاحب نے کہا "اتنی دیر میں تو وہ بچہ بڑا بھی ہو چکا ہو گا۔ آپ بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ ہم آپ کو ایک اور بچے والی فلم ڈھونڈ دیں گے۔"

چائے کے دوران میں فلم کی شوٹنگ اور لوکیشنز کے بارے میں بات چیت ہوئی اور پھر رات کے کھانے پر ملنے کا وعدہ کر کے سب لوگ رخصت ہو گئے۔ ہم نے واجد صاحب سے کہا کہ سب سے پہلے تو آپ ہمیں یونٹ کے دوسرے ممبروں کے اپارٹمنٹ دکھائیے۔ اس کے بعد آس پاس کی سیر کرائیے انہوں نے گائیڈ کے فرائض سرانجام دیے اور ہم مختلف منزلوں پر اپنے ساتھیوں سے ملاقات کر آئے۔ نئے شہر اور نئے ماحول میں سبھی خوش تھے۔ مسائل تو کام شروع ہونے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور پھر جب آٹھ دس دن گزر جاتے ہیں تو پھر سب کو گھر یاد آنے لگتا ہے اور وہ اداس ہو جاتے ہیں۔ ہم نے شاہ جی کو اداس دیکھا تو بہت حیرت ہوئی۔ ریاض بخاری ایسے شخص کا نام ہے جو کبھی اداس نہیں ہوتا۔ ہر وقت ہنستے کھیلتے کام میں مصروف رہنا ہی ان کی زندگی ہے۔

"کیا بات ہے شاہ جی۔ آپ ابھی سے اداس ہو گئے؟ ابھی تو ایک دن بھی نہیں گزرا یہاں آئے ہوئے۔"

شاہ جی نے سنجیدگی سے کہا "بات یہ ہے کہ اس وقت میرے پاس تھوڑا سا وقت خالی تھا سوچا اداس ہو جاؤں۔ ورنہ بعد میں جب کام شروع ہو گا تو اداس ہونے کا وقت ہی نہیں ملے گا۔" واقعی ترکیب بہت اچھی تھی۔

ایک کمرے میں لوگ نہا دھو کر تازہ دم بیٹھے چائے پی رہے تھے اور تاش کھیل رہے تھے۔ خرم برابر والے کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اس وقت وہیں موجود تھے۔ واجد صاحب نے دیکھا تو کہا "بھئی یہ کیا کرتے ہیں آپ لوگ۔ اس ماحول میں تو بچہ خراب ہو جائے گا۔ آپ لوگوں کو دیکھ کر تاش کھیلنا سیکھ لے گا۔"

خرم نے کہا "انکل تاش کھیلنا تو پہلے ہی مجھے آتا ہے۔"

زلفی ایڈیٹر بولے "سر! ہم اس کی بہت اچھی تعلیم و تربیت کریں گے' آپ فکر نہ کریں' آپ نے وہ تعلیم والا لطیفہ تو سنا ہو گا؟"

"نہیں سنا' اب سنا دو۔"

"بات یہ ہے کہ ایک گھر میں دو میاں بیوی رہتے تھے۔ مطلب یہ کہ ایک میاں ور ایک بیوی دونوں کام کرتے تھے۔ صبح گھر سے نکلتے تھے تو رات کو واپس لوٹتے تھے۔ س عرصے میں ان کے بچے کی دیکھ بھال نوکروں کے ذمے تھی۔ جو ظاہر ہے کہ بچے کو چھی باتیں نہیں سکھا سکتے تھے۔ ایک دن میاں بیوی میں جھڑپ ہوئی تو دونوں کو بچہ یاد کیا اور انہوں نے ایک دوسرے کو الزام دینا شروع کر دیا کہ آپ کی بے پروائی اور عدم جہ کی وجہ سے بچہ دو کوڑی کا ہو گیا ہے۔ اتنی دیر میں بچہ بھی نوکر کے ہمراہ آگیا۔ باپ نے کہا۔ اسے کوئی پڑھاتا بھی ہے یا ہر وقت نوکروں کی صحبت میں خراب ہوتا رہتا ہے۔"

بیٹے نے کہا "ابو مجھے تو گنتی بھی آتی ہے۔"

"اچھا سناؤ"

"سنئے۔ ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ' سات' آٹھ' نو' دس' غلام' بیگم' بادشہ' یکہ۔

بچے نے فخریہ انداز میں گنتی سنا دی۔

زلفی نے کہا "آپ فکر نہ کریں سر! جب یہ گھر واپس جائے گا تو اسے بیگم' بادشہ ہ تک کی گنتی ضرور آجائے گی۔"

ہم نے کہا "خرم! تم ہر وقت ان کے کمرے میں بیٹھے تاش نہ دیکھتے رہنا۔"

"نہیں انکل میں ساتھ والے کمرے میں بھی جا کر تاش دیکھ لیا کروں گا۔"

"اور ڈائیلاگ کس وقت یاد کرو گے؟"

"جب تاش ختم ہو جایا کریں گے۔" اس نے بڑی سعادت مندی سے جواب دیا۔

واجد صاحب بولے ”آفاقی صاحب! آپ اس کی فکر نہ کریں، یہ بہت تیز بچہ ہے، اپنا کام خوب سمجھتا ہے۔“

اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ جب شوٹنگ شروع ہوئی تو خرم کو سارے ڈائیلاگ فر فر یاد تھے۔ سامنے والے اداکار کبھی بھول جاتے تھے مگر خرم نے ایک بار بھی ری ٹیک نہیں کرائی۔

ہم بلڈنگ سے باہر نکلے۔ لابی میں ایک اونچے لمبے خوب صورت سے انگریز کو دیکھ کر واجد صاحب نے بہت گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ پھر ہمارا تعارف بھی کرایا۔ ان صاحب کا نام کلنٹ، کلفٹ یا کچھ اسی قسم کا تھا۔ یہ اس بلڈنگ کے منیجر تھے۔ وہ ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ بہت شاندار کمرا تھا۔ اس کے برابر ہی ایک فلیٹ میں ان کی رہائش تھی جہاں وہ اکیلے ہی رہتے تھے۔ بیگم انہیں داغ مفارقت دے گئی تھیں۔ مطلب یہ نہیں کہ اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں بلکہ ایک اور انگریز کو پیاری ہو گئی تھیں۔ کلنٹ صاحب نے ہمیں جو قصہ سنایا وہ یہ تھا کہ انہوں نے ایک خاتون سے محبت کی شادی کی تھی۔ وہ صاحبہ پہلے سے شادی شدہ تھیں اور ان کی وہ شادی بھی محبت کی شادی تھی، بلکہ اس سے پہلے انہوں نے جو دو شادیاں کی تھیں وہ بھی محبت ہی کی شادیاں تھیں۔ محبت کی اتنی بہت سی ناکام شادیاں ان کے علاوہ شاید ہی کسی خاتون کی ہوں گی۔ مطلب یہ کہ جتنی بار محبت کی اتنی ہی بار شادی کی اور اتنی ہی بار شادی ناکام بھی ہوئی۔ یہ سن کر ہمارا تو محبت کی شادی پر سے اعتبار ہی اٹھ گیا۔ ایسی محبت کس کام کی اور ایسی شادی کا بھلا کیا فائدہ جو چند ماہ کے اندر ہی اندر ناکام ہو جائے۔ ان کی محبتوں اور شادیوں پر ہمیں حفیظ جالندھری کا شعر یاد آگیا ہے۔

جب کبھی ہم نے کیا عشق پشیمان ہوئے
زندگی ہے تو ابھی اور پشیماں ہوں گے

یعنی عاشق کی مستقل مزاجی ملاحظہ فرمائیے کہ بارہا آزما چکے ہیں کہ عشق میں آخر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا سوائے پشیمانی کے۔ مگر وہ پشیمانیوں ہی کے عادی ہو گئے حفیظ صاحب سے کسی نے پوچھا تھا کہ حضرت، جب پتا ہے کہ حاصل پشیمانی کے سوا کچھ

نہیں ہے تو پھر مزید عشق کرنے کا فائدہ؟

جواب دیا "آپ نہیں جانتے۔ پشیمانیوں کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

خیر یہ تو شاعر کے خیالات و جذبات ہیں مگر کلنٹ صاحب کی شرافت ملاحظہ ہو کر اس کے باوجود اپنی بھاگ جانے والی بیوی کی حمایت میں تقریریں کر رہے تھے اور انہیں بے قصور قرار دے رہے تھے' کہنے لگے "میرا خیال ہے کہ شاید میں اسے خوش نہیں رکھ سکا۔ میرے اندر ہی کوئی خامی ہو گی۔ ورنہ وہ تو بہت اچھی تھی۔"

ہم نے کہا "آپ کا مطلب ہے صورت شکل کے لحاظ سے؟"

بولے "ہر لحاظ سے۔ وہ ہزاروں میں ایک تھی بلکہ اب بھی ہے۔"

مسٹر کلنٹ نے ہمیں وہسکی پیش کی کہنے لگے "ویسے تو وہسکی کا وقت نہیں ہے مگر آپ ہمارے مہمان ہیں اس لئے بے وقت پیش کش کر رہا ہوں۔"

ہم نے کہا "سوری اگر آپ بر وقت بھی آفر کرتے تو ہم معذرت کر لیتے۔ ہم شراب نہیں پیتے۔"

وہ ہمدردی سے پوچھنے لگے "کوئی بیمار وغیرہ ہیں؟ ڈاکٹر نے منع کیا ہے؟"

ہم نے بات مختصر کرنے کے خیال سے ہاں کہہ دیا۔ انہوں نے اپنی بلڈنگ کی خوبیاں بیان کرنی شروع کر دی۔ ہم نے کہا "شاید ہمیں تھوڑی سی شوٹنگ بھی یہاں کرنی پڑے گی آپ کو اعتراض تو نہیں ہو گا؟" وہ بولے اگر آپ یہاں شوٹنگ نہیں کریں گے تب اعتراض ہو گا اور بہت سخت اعتراض ہو گا۔ معلوم ہوا کہ ان کا تعلق ٹیلی ویژن سے بھی رہ چکا ہے اور شو بزنس کے دلدادہ ہیں۔ کہنے لگے "جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہماری اپارٹمنٹ بلڈنگ میں فلم کا یونٹ ٹھہرے گا مجھے تو بہت خوشی ہوئی ہے۔" پھر آنکھ مار کر بولے "آپ فلم کے رائٹر ہیں۔ کوئی کیریکٹر میرے لئے بھی لکھ دیں۔ بڑی اسکرین پر ہماری تصویر بھی آجائے گی۔"

خاصے شگفتہ مزاج اور دلچسپ آدمی تھے۔ بہت جلد گھل مل گئے۔ مغرب میں ایسے لوگ خال خال ہی ملتے ہیں امریکہ اور کینیڈا میں یورپ کے مقابلے میں زیادہ گرم جوش اور خوش مزاج لوگ مل جاتے ہیں۔ پھر بھی مسٹر کلنٹ پہلی ملاقات ہی میں شیرو شکر ہو گئے جو بہت غیر معمولی بات تھی۔ انہوں نے ہمیں پیش کش کی کہ اگر کوئی مسئلہ ہو تو بلا

تکلف ان سے رابطہ قائم کریں۔ اگر دفتر کا وقت نہ ہو تو بے شک رہائش گاہ پر آجائیں۔ رات اور دن کا کچھ خیال نہ کریں کیونکہ ...... فی الحال تو کوئی بیوی بھی نہیں ہے۔

واجد صاحب نے پوچھا۔ "بیوی کے سلسلے میں آپ کیا کر رہے ہیں؟"

بولے "ایک نئی محبت شروع کی ہے۔ کچھ دن بعد شادی ہو جائے گی اور اس کے بعد علیحدگی۔" یہ کہہ کر بہت زور سے قہقہہ مار کر ہنسے۔

یوں تو یورپ اور امریکہ کے لوگ سبھی معاملات میں جذبات و احساسات سے عاری ہوتے ہیں مگر شادی بیاہ کے معاملے میں تو یوں کہنا چاہئے کہ حد کمک گئی ہے۔ یعنی جس وقت چاہا شادی کر لی' جب چاہا چھوڑ دیا اور پھر پلٹ کر ایک دوسرے کی خبر تک نہیں لی۔ جذباتی تعلق نام کی کوئی چیز تو ان لوگوں کو چھو کر بھی نہیں گزری ہے شاید۔

ابھی ہم مسٹر کلنٹ کے کمرے میں بیٹھے تھے کہ شاہ جی بھی ہماری تلاش میں وہیں آگئے۔ واجد صاحب نے فوراً ان کا آپس میں تعارف کرایا۔ مسٹر کلنٹ نے شاہ جی کو سر سے پیر تک دیکھا اور شاید انہیں یقین نہیں آیا کہ وہ عکاس بھی ہو سکتے ہیں۔ پوچھنے لگے۔ کیا یہ فلموں کی عکاسی کرتے ہیں؟

ہم نے بتایا کہ یہ ہمارے ملک کے مایہ ناز عکاس ہیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات کہہ رہے تھے کہ لگتے تو نہیں۔

کہنے لگے "فلموں میں سب سے زیادہ اہمیت کیمرا مین کی ہوتی ہے۔ بڑی سے بڑی ہیروئن بھی اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی چہرے کو بگاڑنا یا سنوارنا کیمرا مین ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔" اس کے بعد انہوں نے کیمرا مینوں اور ہیروئنوں کے کچھ لطیفے سنائے۔ مثلاً ایک یہ تھا کہ ایک ہیروئین بہت نک چڑھی تھی۔ فلم ساز کی لاڈلی بھی تھی۔ ہدایت کار پر بھی مہربان تھی اس لئے یونٹ کے کسی اور ممبر کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ ایک طویل شوٹنگ اسپیل کے بعد جب سب لوگ رش پرنٹ دیکھنے بیٹھے تو ہیروئین بہت بد شکل نظر آئی۔ وہ اتنی ناراض ہوئی کہ اٹھ کر چلی گئی۔ فلم ساز نے کیمرا مین کو بلایا اور کہا "بھئی یہ تم نے ہیروین کی شکل کیسی کر دی ہے۔"

کیمرا مین نے کہا "سر آپ تو انہیں اپنی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے کیمرے کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ انہیں ہر کوئی تو آپ کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔"

فلم ساز نے کہا "مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟"

بولے "یہ تو میں سوچ کر بتاؤں گا۔"

فلم ساز کے کہنے پر ہیروئین نے عکاس کو کھانے پر بلایا۔ بہت خاطر مدارار تحفے تحائف بھی پیش کئے۔ اگلی شوٹنگ کے رش پرنٹ دیکھی تو ہیروئن پری آئی۔ فلم ساز نے عکاس سے کہا "بھئی تمہارے کیمرے کی آنکھ کو اب کیا ہو گیا"

عکاس نے کہا "جناب اس بار میں نے انہیں اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔"

تھوڑی دیر میں مسٹر کلنٹ نے اپنی خوش مزاجی اور لطیفہ گوئی سے شاہ بھی موہ لیا۔ ادھر مسٹر کلنٹ کو شاہ جی بہت پسند آ گئے۔ انہوں نے شاہ جی کو پینے کی دعوت دے دی۔

انہوں نے کہا "یہ وقت کھانے پینے کا نہیں ہے۔ یہ تو فرصت کی باتیں

مسٹر کلنٹ ان کی اصول پرستی سے بے حد متاثر ہوئے اور کہا "کاش ملک کے عکاس بھی ایسے ہی اصول پسند ہو جائیں۔ ان کا کیا پوچھتے ہیں' یہ تو بلا بلا نوش۔ ان کے لئے رات دن' صبح' دوپہر سب یکساں ہیں۔"

ابھی تک مسٹر کلنٹ انگریزی میں باتیں کر رہے تھے اور شاہ جی پنجابی یا رہے تھے۔ جس کا ترجمہ ہم مسٹر کلنٹ کے سامنے فوراً پیش کر دیتے تھے۔ ہم سے کہا "شاہ جی اب آپ انگریزی بولنی کب شروع کریں گے۔ جس دن کے رکھی تھی اب تو وہ بھی آ گیا ہے۔"

بولے "بس آج رات سے انگریزی بولنا اسٹارٹ۔ آپ اس گورے کو م سے رات کے کھانے کی دعوت دے دیں۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ "اتنی جلدی؟ میرا مطلب ہے پہلی میں دعوت اور پھر اس گورے کے لئے کھانا کہاں سے آئے گا؟"

بولے "ہم خود پکائیں گے سر! یہ گورا بھی کیا یاد کرے گا۔"

ہم نے فوراً شاہ جی کی جانب سے دعوت نامہ مسٹر کلنٹ کی خدمت میں دیا۔ مارے حیرت سے ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ واقعی حیران ہونے کی بات بھ بے چارے خالص امریکن' کینیڈین انگریز تھے۔ شاہ جی کے لفظوں میں سینٹ

ورے تھے۔ ان لوگوں میں ملاقاتیوں کو دعوت دینے کا رواج ہی نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو عو کریں گے بھی تو کسی کاروباری یا پیشہ وارانہ مصلحت سے۔ ورنہ کھانے کے لئے پوچھتے بھی نہیں۔ یہ لوگ تو اپنے حقیقی ماں باپ اور بہن بھائیوں تک کو دعوت نہیں دیتے۔ بھی سال دو سال میں ان سے ملاقات ہوتی ہے تو چائے کافی پر ٹرخا دیتے ہیں۔ مگر یہاں تو شاہ جی نے پہلی ملاقات ہی میں دعوت دے ڈالی تھی۔ دراصل یہ ٹھاٹ تو ہم مشرق والوں تک ہی محدود ہیں اور مشرقی میزبانی مغربی ملکوں میں جا کر بہت عجیب اور نرالی سی چیز محسوس ہوتی ہے۔

مسٹر کلنٹ کو شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تو مزید تصدیق کے لئے پوچھنے لگے "کیا واقعی ان کا یہی مطلب ہے۔ آپ مجھے کھانے پر مدعو کر رہے ہیں؟"

ہم نے شاہ جی کی جانب سے مزید تصدیق کر دی۔ مسٹر کلنٹ نے تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور جھک کر شاہ جی کو سلام بھی کیا۔ شاید وہ اپنی آنے والی نسلوں کو بھی بتائیں گے کہ کس طرح ایک پاکستانی عکاس نے پہلی ہی ملاقات میں انہیں کھانے کی دعوت دے ڈالی تھی۔

شاہ جی جوش جذبات میں آ کر دعوت تو دے بیٹھے مگر جب ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اس کی قباحتیں نظر آنے لگیں۔ سب سے بڑی بات تو "بات چیت" کی تھی۔ مسٹر کلنٹ خالص امریکن لہجے میں انگریزی بولتے تھے جسے سمجھنا خود انگریزوں کے لئے بھی آسان نہیں ہے۔ ادھر شاہ جی پنجابی اور اردو کے لہجے میں انگریزی بولتے تھے۔ اس کا سمجھنا بھی کم از کم کسی انگریز کے بس کی بات تو نہ تھی۔

ہم نے کہا "شاہ جی دعوت کی تو خیر ہے مگر آپ دونوں ہی اکیلے ہوں گے تو ایک دوسرے کی بات کیسے سمجھیں گے؟"

شاہ جی کہنے لگے "یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس گورے کی انگلش بہت غلط ہے۔"

ہم نے پوچھا "لفظ بہ لفظ آپ کی سمجھ میں آ جاتی ہے؟"

بولے "لفظ بہ لفظ تو سمجھ میں نہیں آتی ورنہ میں اور زیاہ غلطیاں نکالتا۔"

ہم نے کہا "تو پھر اب کیا ہو گا؟"

کہنے لگے "پھر تو آپ لوگوں کا موجود ہونا بھی ضروری ہے آپ واجد صاحب اور پرویز صاحب بھی رات کو آٹھ بجے آجائیں۔" گویا طفیلی کے طور پر مگر کار ثواب تھا۔ یعنی دو اجنبی حضرات کے مابین محبت اور خلوص کا رشتہ قائم کرنا جو کسی نیک کام سے کم نہیں ہے۔ اس لئے ہم سب نے خندہ پیشانی سے یہ دعوت قبول کرلی۔

وقت مقررہ سے کچھ دیر پہلے ہی ہم شاہ جی کے اپارٹ منٹ میں پہنچ گئے۔ انہوں نے تکے وغیرہ تیار کئے تھے۔ غالباً بریانی بھی بنائی تھی اور ہر چیز میں بہت زیادہ مرچیں تھیں۔ ہم نے کہا کہ وہ گورا اتنی مرچیں کیسے کھائے گا؟ کہنے لگے۔ "دیکھئے جب تک ہم اسے اپنا کھانا نہیں چکھائیں گے اسے دیسی اور انگریزی کھانے کا فرق کیسے معلوم ہو گا؟"

بات معقول تھی اس لئے ہم سب لاجواب ہو گئے۔ اب شاہ جی نے ہم لوگوں کے ساتھ انگریزی بولنے کی پریکٹس شروع کی۔ یہ مشورہ انہیں پرویز ملک صاحب نے دیا تھا کہ آپ مہمان کے آنے سے پہلے انگریزی پر ہاتھ صاف کرلیں۔ چنانچہ انہوں نے انگریزی پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ شاہ جی کا یہ قصہ تھا کہ کراچی سے ٹورنٹو پہنچنے تک انہوں نے انگریزی بولنے سے احتراز کیا تھا۔ یہاں تک کہ ائرہوسٹس' ویٹریس اور اس قسم کی دوسری البیلی خواتین کے ساتھ بھی انگریزی میں بات نہیں کی تھی۔ اس کا سبب انہوں نے یہ بتایا تھا کہ وہ اپنی انگریزی ٹورنٹو کے لئے سنبھال کر رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ساری انگریزی راستے ہی میں خرچ کر دی تو پھر شوٹنگ کے دوران میں کیا کریں گے؟ اب جب کہ وہ ٹورنٹو پہنچ چکے تھے اور شوٹنگ کا آغاز بھی ہونے والا تھا تو انہوں نے مناسب جانا کہ اپنی انگریزی "چھوڑ دیں۔"

مسٹر کلنٹ بالکل صحیح وقت پر پہنچ گئے۔ مکمل ڈنر کے لباس میں تھے۔ سیاہ سوٹ' سفید قمیص اور سیاہ بوٹائی میں وہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ویسے بھی وہ خوب صورت اور باوقار آدمی تھے۔ ہنس مکھ اور بااخلاق بھی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملنسار تھے جو یورپ اور امریکہ میں ایک نایاب صفت ہے۔ ادھر شاہ صاحب بھی ان کے استقبال کے لئے بالکل تیار تھے۔ نہا دھو کر انہوں نے سفید شلوار اور قمیص زیب تن کرلی تھی۔ بالوں میں کریم لگا کر سلیقے سے سنوارا تھا۔ شیو بھی غالباً دوبارا بنایا تھا۔ خوب چمک رہے تھے۔ باقی مہمان تو خیر تھے ہی طفیلی۔ اس لئے انہوں نے زیادہ اہتمام نہیں کیا تھا۔ مسٹر

لنٹ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی گفتگو اور خورد و نوش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آغاز ں تو شاہ جی ذرا لئے دیئے سے رہے مگر تھوڑی دیر بعد کھل گئے۔ اور بالکل بے تکلف گئے۔ یعنی مسٹر کلنٹ سے بھی اور انگریزی زبان سے بھی۔ منیجر صاحب کو اپنی انگریزی بہت ناز ہو گا مگر جب شاہ جی نے ٹھیٹ پنجابی لہجے میں انگریزی بولنا شروع کی تو مسٹر لنٹ کے ہوش ٹھکانے آگئے' ہمیں اونٹ کے پہاڑ تلے آنے کا محاورہ یاد آگیا۔ جہاں ب الفاظ اور گریمر کا تعلق ہے شاہ جی کی انگریزی بالکل درست تھی۔ اصل جھگڑا تلفظ ر لب و لہجے کا تھا۔ ہمارے ہاں عام اسکولوں میں پڑھانے والے اساتذہ صاحبان بھی ی اسکولوں میں پڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور آگے چل کر چاہے جتنی بھی ڈگریاں حاصل لیں ان کا انگریزی بولنے کا لہجہ اور تلفظ ویسی ہی رہتا ہے جو مڈل اور ہائی اسکولوں میں ں کے استادوں کا ہوتا ہے۔ یہ انگریزی ہم پاکستانیوں کی سمجھ میں تو آجاتی ہے مگر انگریزی رکی اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتے۔ ویسے یہ معاملہ دو طرفہ ہے۔ خود انگریزوں کا ب و لہجہ اس قدر ثقیل اور دقیق ہوتا ہے کہ ہمارے انگریزی دان بھی سمجھنے میں دقت وس کرتے ہیں۔ یہی حال امریکیوں کا بھی ہے۔ اگر ہم انگریزی الفاظ کے ٹکرے رے کر دینے میں کمال رکھتے ہیں تو امیریکیوں نے ناک میں بولنے اور الفاظ پر استری رنے کا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ وہ ہر لفظ کو لٹا دیتے ہیں۔ مثلاً ندیم کو کہیں گے نے ڈیم۔ یہ کو نے ڈیا۔ دوسرے تمام الفاظ کے ساتھ بھی وہ یہی سلوک روا رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان ی انگریزی بھی عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ندیم نے کہا کہ دیکھئے امریکیوں کی ریزی سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک خاص قسم کا ذوق پیدا کرنا پڑتا ہے۔ جیسے کہ ا سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک خاص قسم کا ذوق پیدا کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ ہر ں کافی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ بہرحال' مسٹر کلنٹ کی انگریزی ہمارے پلے تو پڑ ی تھی کیونکہ امریکی فلمیں دیکھ دیکھ کر ہم ان لوگوں کے تلفظ اور لب و لہجے سے واقف گئے تھے اور پھر کچھ عرصے امریکہ اور کینیڈا میں براہ راست ان کی انگریزی سنتے رہتے ۔ مگر شاہ جی کے لئے یہ اسی طرح تھی جس طرح کسی دیہاتی کے سامنے آپ غالب اور ال کے شعر سنانے بیٹھ جائیں۔ مشکل ہم بیچ والوں کی تھی۔ جب شاہ جی انگریزی کا قیمہ تے تو مسٹر کلنٹ بہت غور اور توجہ سے سننے کی کوشش کرتے اور پھر ہماری طرف

سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے۔ ہم فوراً شاہ جی کی بات کا ترجمہ انہیں سنا دیتے۔ کبھی اس خلاصہ سناتے اور کبھی تشریح اور تفسیر بھی پیش کر دیتے تاکہ وہ اس کا پس منظر بھی سمجھ لیں۔ شاہ جی نے اپنا ہاتھ فرط محبت سے مسٹر کلنٹ کے شانے پر رکھ دیا اور محبت بھر لہجے میں بولے "یو آر مائی انکل!" بہت آسان سا انگریزی فقرہ تھا مگر مسٹر کلنٹ کے ر کے اوپر سے گزر گیا۔

ہم سے پوچھنے لگے "یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟"

ہم نے کہا "یہ کہہ رہے ہیں آپ میرے انکل ہیں۔" مسٹر کلنٹ نے جوار میں اظہار تشکر فرمایا تو شاہ صاحب ہمارا چہرہ دیکھنے لگے۔ ہم نے ان کا ترجمہ شاہ جی کو دیا۔ جب کچھ دیر یہی سلسلہ جاری رہا تو شاہ جی مسٹر کلنٹ کے بار بار دریافت کرنے اکتا گئے اور ہم سے پنجابی میں یوں گویا ہوئے۔ "آفاقی صاحب آپ تو کہتے تھے کہ یہ انگ ہے؟"

ہم نے کہا "وہ تو ہے' کیا آپ کو کچھ شک ہے؟"

بولے "شک کی تو بات ہے۔ یہ کیسا انگریز ہے کہ انگریزی بھی نہیں سمجھتا۔"

ہم نے انہیں سمجھایا "دراصل یہ آپ کی انگریزی نہیں سمجھتا۔"

کہنے لگے "کیوں' کیا میں انگریزی نہیں بول رہا؟ یہ بھی تو انگریزی ہے' پنجابی فارسی تو نہیں ہے' مگر یہ بار بار آپ سے مطلب پوچھ رہا ہے۔ آپ اس کو بتائیں کہ نے ایسا انگریز آج تک نہیں دیکھا۔"

ہم نے اس کا ترجمہ مسٹر کلنٹ کو بتا دیا وہ بولے "میں نے بھی ایسی انگریزی بو والا پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ انگریزی انہوں نے کہاں سے سیکھی ہے؟"

ہم نے کہا "پاکستان سے اور کہاں سے؟"

حیران ہو کر بولے "کیا پاکستان میں سب ایسی ہی انگریزی بولتے ہیں؟"

ہم نے کہا "جی نہیں' ہر طرح کی انگریزی بول لیتے ہیں۔ دراصل ہمارے انگلستان کی انگریزی کا زیادہ رواج ہے۔ امریکن انگریزی ابھی نئی نئی شروع ہوئی ہے۔

اتنی دیر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ فون مسٹر کلنٹ کے لئے تھا۔ ان کی گرل فرینڈ ملنے کے لئے تشریف لائی تھیں۔ اب وہ بے چارے کشمکش میں پڑ گئے۔

رینڈ کو ٹکا سا جواب دے کر رخصت نہیں کر سکتے تھے اور شاہ جی کی محفل بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ قدرے پریشان ہو کر ہمیں دیکھنے لگے۔ ہم نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے اپنی پرابلم بیان کی۔ شاہ جی ہم سے پوچھنے لگے "کیا بات ہے' آپ لوگ آپس میں ہی اتیں کئے جا رہے ہیں کتنی بد اخلاقی ہے" ہم نے انہیں مسئلہ بتایا تو بولے "پریشانی کی کیا ات ہے ان سے کہئے کہ میڈم کو بھی یہیں بلا لیں۔ میری طرف سے دعوت ہے۔"

مسٹر کلنٹ کی تو خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ مغربی معاشرے میں تو اس قسم کی مہمانداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ کسی جگہ مدعو ہیں اور کوئی آپ کا ملنے والا آگیا ہے تو وہ بھی شریک دعوت ہو جائے۔ ہمارے ماحول میں یہ سب چلتا ہے اور اسے معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا بلکہ میزبانی کا ایک حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ غنیمت ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی وہ روایات باقی ہیں۔ چند لمحے بعد دروازے پر بل بجی اور مسٹر کلنٹ نے دروازہ کھولا تو سامنے بجلی سی چمک گئی۔ بلکہ شاہ جی پر تو بجلی گر ہی پڑی۔ ایک انتہائی جامہ زیب' خوش لباس اور طرح دار خاتون ہاتھ میں چھوٹے سے لمبے لمبے بالوں والے کتے کی زنجیر تھامے کھڑی تھیں۔ مسٹر کلنٹ کو دیکھا تو مسکرائیں۔ مسٹر کلنٹ نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ہونٹوں پر بوسہ دیا اور کمر میں ہاتھ ڈال کر کمرے میں لے آئے۔ شاہ جی حیرت سے منہ کھولے یہ تماشا دیکھتے رہے جب مسٹر کلنٹ نے ان کا تعارف کرانے کے لئے خاتون کو آگے بڑھایا تب کہیں جا کر شاہ جی کا انہاک ختم ہوا۔ انہوں نے بہت اہتمام سے اپنا ہاتھ رومال سے صاف کرنے کے بعد مصافحے کے لئے آگے بڑھایا۔ ابتدائی علیک سلیک بھی مناسب انداز میں ہوئی مگر مشکل اس وقت پیش آئی جب خاتون نے شاہ جی کا شکریہ ادا کرنا شروع کر دیا کہ میں نے آپ کی اس دعوت میں مداخلت کی مگر آپ نے ازراہ کرم مجھے بھی مدعو کر لیا۔ مگر میں زیادہ دیر تک نہیں رکوں گی۔ شاہ جی نے پھر مدد کے لئے ہماری جانب دیکھا اور ان کی گفتگو کا ترجمہ سننے کے بعد فرمایا کہ میں تو بہت خوش ہوں کہ آپ آگئیں۔ آپ کی وجہ سے محفل میں رونق آگئی ہے' آپ اسے اپنا ہی گھر سمجھئے۔

اس بار خاتون کی ہماری جانب دیکھنے کی باری تھی۔ ہم نے انہیں گفتگو کا ماحصل بتا دیا۔ وہ ممنونیت کا اظہار کرنے لگیں۔ مسٹر کلنٹ نے ان کا سب حاضرین سے تعارف

کرایا اور شاہ جی کے بارے میں بہت سے تعریفی جملے کہے۔ پھر بتایا کہ یہ میری دوست ہیں' انیتا ان کا نام ہے اور بہت خوش مزاج اور ذہین خاتون ہیں۔ جیسے ہی ہم دونوں کو طلاق حاصل ہوئی ہماری شادی ہو جائے گی۔ قصہ یہ تھا کہ مسٹر کلنٹ کی مسز انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں مگر ابھی تک ان میں باقاعدہ علیحدگی اور طلاق نہیں ہوئی تھی۔ ادھر مس انیتا اپنے شوہر کا گھر چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہو گئی تھیں اور طلاق کے انتظار میں تھیں' جب تک طلاق حاصل نہ ہو جائے شادی نہیں ہو سکتی۔ مگر میل ملاپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جب شاہ جی کو یہ تفصیل بتائی تو وہ بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے "ان لوگوں کا یہ طریقہ بہت اچھا ہے کہ بلا وجہ روگ نہیں پالتے۔ جب دل اکتا جاتا ہے ایک دوسرے کو سپرد خدا کر دیتے ہیں۔"

انیتا بہت جلد گھل مل گئیں۔ ایک تو پیار کا نشہ' اس پر سے وہسکی کا نشہ' گویا دو آتشہ۔ کچھ دیر بعد بے تکلفی کا ماحول ہو گیا تو ہم نے بھی ترجمہ کرنے کے فرض سے نجات چاہی اور کہا کہ آپ لوگ خود ہی ایک دوسرے سے نمٹ لیں۔ شاہ جی نے مرغ بہت اچھا بنایا تھا۔ مسٹر کلنٹ اور انیتا تو تعریفیں کرکرکے تھک گئے۔ کچھ دیر بعد ہم نے رخصت کی اجازت طلب کی تو وہاں کسی نے اس پر دھیان ہی نہیں دیا۔ وہ سب ایک دوسرے سے انگریزی بولنے میں مصروف تھے۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ انگریزی کی یہ مجلس رات گئے تک بجی رہی۔ مگر یہ دعوت ہمیں ہمیشہ یاد رہے گی۔ تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع تھا جب دو حضرات انگریزی زبان میں آپس میں باتیں کر رہے تھے اور ایک تیسرا شخص انکی انگریزی کا ترجمہ کرنے کا فرض سرانجام دے رہا تھا۔

اس طرح مسٹر کلنٹ سے ہم سب کی بہت پکی دوستی ہو گئی اور انہوں نے ہمیں ہر طرح کی سہولت فراہم کر دی۔ کبھی کبھی وہ پاکستانی کھانا کھانے بھی کسی کمرے میں چلے جاتے تھے۔ میل جول زیادہ بڑھا تو مترجم کی محتاجی بھی ختم ہو گئی۔ وہ ایک دوسرے کو اپنا مفہوم سمجھانے کا گر جان گئے تھے۔

اگلے دن پہلے تو ناشتے کا دور چلا پھر پروگرام کے مطابق شوٹنگ کے آلات اور سازو سامان حاصل کرنے کے لئے کمپنی میں جانے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ کیمرا اور کچھ سامان تو ہم لوگ ساتھ لے کر گئے تھے۔ مگر مزید سازو سامان کے لئے ایک مقامی ادارے سے رابطہ قائم کیا گیا۔ ایک بڑی سی ویگن میں سوار ہو کر ہم لوگ روانہ ہوئے۔ واجد صاحب ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ شاہ جی اور پرویز ملک صاحب کے علاوہ ان کی بیگم اور بچی نادیہ اور ہماری بیگم اور بچی پارو بھی ہمراہ تھیں۔ شبنم بھی ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں پرویز صاحب کو تو خیر کام تھا مگر خواتین سیر کے خیال سے ساتھ ہو گئی تھیں۔ جہاں ہم پہنچے۔ وہ کوئی باقاعدہ اسٹوڈیو تو نہیں تھا مگر شوٹنگ کے لئے جن چیزوں کی ضرورت پیش آسکتی ہے وہ سب یہاں سے حاصل ہو سکتی تھیں۔ پاکستان کے مقابلے میں کرائے زیادہ تھے مگر سامان بھی جدید ترین نوعیت کا تھا۔ شاہ جی اور پرویز صاحب نے اپنی ضرورت کے مطابق سامان دیکھا اور بتایا کہ ہم اگلے روز آکر لے جائیں گے۔ مغربی ملکوں میں یہ رواج ہے کہ سازو سامان کے ساتھ عموماً ہنرمندوں کی خدمات بھی حاصل کی جاتی ہیں۔ مگر ہماری ضرورت کے مطابق تمام لوگ ہمراہ تھے۔ ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہاں ٹیکنیشنز کے معاوضے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور نخرے اس سے بھی زیادہ وہ آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کرتے۔ کام کے دوران میں انہیں تمام آسانیاں فراہم کرنا ضروری ہے مثلاً ائر کنڈیشن رہائش' لنچ کا وقفہ' کافی کا وقفہ' ان کے کام کرنے کی رفتار کافی تیز ہوتی ہے مگر جہاں تک فلمی کارکنوں کا تعلق ہے ہمارے خیال میں پاکستانیوں سے زیادہ محنت اور تیز رفتار کارکن اور ہنرمند دنیا بھر میں کہیں نہیں مل سکتے۔ یہ لوگ دن رات کام کرتے ہیں اور اس قدر تیزی سے کام کرتے ہیں کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ پھر حالات اور

موقع محل کے مطابق فلم ساز کے ساتھ تعاون بھی کرتے ہیں۔ بعض اوقات لنچ کے لئے ایک گھنٹے کا وقفہ مناسب نہیں معلوم ہوتا تو یہ لنچ بریک کے بغیر ہی مصروف رہتے ہیں اور باری باری جسے ذرا سی فرصت ملتی ہے وہ کھانا کھا لیتا ہے۔ اداکاروں کا بھی یہی حال ہے۔ دن ہو یا رات' انہیں شوٹنگ کرنے میں ذرا بھی اعتراض نہیں ہوتا۔ سارے دن آؤٹ ڈور شوٹنگ میں مصروف رہنے کے بعد رات کو گھروں اور کمروں میں شوٹنگ جاری رہتی ہے مگر کیا مجال جو کوئی حرف شکایت زبان پر لائے۔ بھائی چارے اور دوستی کے ماحول میں سارے کام ہوتے رہتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بہت سے دوست پکنک منانے گئے لئے آئے ہوئے ہیں۔ کام کے سلسلے میں اختلافات' تلخیاں اور لڑائی جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں اور روٹھنے منانے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ مگر کام کی رفتار پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مجھے کئی بار یہ خیال آیا کہ پاکستان کے فلم یونٹ جس جذبے' لگن اور محنت کے ساتھ بیرون ملک فلموں کی شوٹنگ کرتے ہیں اگر ہمارے ملک کے اندر بھی سب لوگ اسی طرح کام کرنے لگیں تو ہمارے ملک کی تقدیر ہی بدل جائے۔ معاشرے میں فلم والوں کو عام طور پر برا سمجھا جاتا ہے۔ ان میں خامیاں اور کمزوریاں بھی ہیں مگر میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ فلم کے لوگ دوسرے شعبوں کے مقابلے میں زیادہ بے تکلف' کھلے دل' رسک لینے والے اور وعدہ' نبھانے والے ہوتے ہیں۔ یہاں ہر کام محض زبانی طے پاتا ہے یہاں تک کہ رقوم کی ادائیگی بھی رسیدوں کے بغیر ہوتی ہے مگر کبھی کوئی غلط فہمی یا گڑ بڑ نہیں دیکھی۔ جس زمانے میں ہم فلموں سے وابستہ تھے کم از کم اس زمانے میں یہی ہوتا تھا۔ اس لئے غیر ملکی ہنرمند اور کاریگر پاکستانی فلم سازوں کے لئے موثر اور کارآمد ثابت نہیں ہو سکتے اور یہی وجہ ہے کہ پاکستانی فلم ساز اپنا یونٹ اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں۔ جب پرویز ملک صاحب نے ایکوپمنٹ والی کمپنی کو بتایا کہ ہمیں ہنرمندوں اور کاری گروں کی ضرورت نہیں ہے تو وہ بہت حیران ہوئے کہ اتنے مختصر یونٹ کے ساتھ یہ لوگ کام کیوں کر کریں گے۔ باہر کے ملکوں کی آؤٹ ڈور شوٹنگ میں پوری فوج کی فوج عملے میں شامل ہوتی ہے۔ اللے تللے بھی خوب ہوتے ہیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم اتنے چھوٹے یونٹ سے شوٹنگ کر سکتے ہیں۔ صاحب' سب پیسے کی بات ہے۔ ان لوگوں کے پاس بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ کماتے بھی خوب ہیں اور لٹاتے بھی خوب ہیں۔ ہمارا یہ خیال

ہے کہ پرانے محاورے کے مطابق ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا؟ نہ اتنی آمدنی ہے کہ بڑے بجٹ کی فلمیں بنائیں اور نہ ہی اتنی بڑی مارکیٹ میسر ہے کہ بڑی رقم لگا کر منافع کمائیں۔ پرویز صاحب نے انہیں ریاض بخاری صاحب سے ملایا اور کہا کہ آپ کا کیمرا کیونکہ بالکل جدید ہے اس لئے اگر آپ کا کوئی ماہر دن میں ایک بار پھیرا لگا لے تو ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ وہ مان تو گئے مگر حیران اور بے اعتباری ان کے چہروں پر لکھی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ سچ پوچھئے تو وہ شاہ جی کے حلئے سے ذرا بھی متاثر نہیں تھے اور انہیں یقین ہی نہیں تھا کہ یہ معمولی سا آدمی اچھی ریزلٹ بھی دے سکتا ہے۔ اس لئے ان کا اصرار تھا کہ ان کا ایک ایکسپرٹ ہم لوگوں کے ساتھ رہے۔

کیمرے اور دیگر ساز و سامان کا بندوبست کرنے کے بعد ہم نے ٹورنٹو کے ڈاؤن ٹاؤن کا رخ کیا۔ ڈاؤن ٹاؤن اسے آپ اندرون شہر بھی کہہ سکتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے شہروں کے اندرونی علاقے انتہائی تنگ و تاریک اور گندے ہوتے ہیں جب کہ امریکہ' کینیڈا کے ڈاؤن ٹاؤن کے علاقے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پرویز صاحب جس لیبارٹری میں فلم ڈیولپ اور پرنٹ کرانا چاہتے تھے وہ ٹورنٹو شہر کے گنجان علاقے میں واقع تھی۔ یہ کئی منزلہ عمارت جدید ترین مشینوں سے آراستہ تھی اور یہاں ہر کام کمپیوٹر کے ذریعے ہوتا تھا۔ جن لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی وہ بے حد مخلص' ہمدرد اور مددگار قسم کے ثابت ہوئے۔ ان سے یہ طے پایا کہ دن بھر کی شوٹنگ کا نیگیٹو شام کو انہیں دے دیا جائے گا اور صبح وہ اس کے رنگین رش پرنٹ تیار کر کے دکھا دیا کریں گے۔ لیبارٹری والے بہت اخلاق سے پیش آئے مگر ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے ہنرمندوں کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں۔ بہر حال' ان سے معاملات طے کر کے بلڈنگ سے باہر نکلے اور اس جانب گئے جہاں واجد صاحب اپنی کار پارک کر کے آئے تھے۔ مگر فٹ پاتھ پر پہنچے تو دیکھا کہ کار غائب ہے۔ کار کی چابیاں واجد صاحب کے پاس تھیں۔ اس لئے یہ امکان بھی نہیں تھا کہ کار کسی نے کسی اور جگہ پارک کر دی ہوگی۔ ابھی ادھر ادھر دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک نادیہ اور پارو کے پکارنے کی آوازیں کانوں میں پڑیں۔ ہم ابھی آس پاس تلاش کر ہی رہے تھے کہ ادھر سے آواز آئی "پاپا! ہم اوپر ہیں۔"

آسمان کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ واجد صاحب کی بڑی سی ویگن نما کار فضا میں

معلق ہے۔ کار میں بیٹھی ہوئی بچیاں اور خواتین بالکل صاف نظر آ رہی تھیں۔ مسکراہٹیں ان کے چہروں پر رقصاں تھیں یوں لگتا تھا جیسے کسی میلے جھولے پر سوار ہیں۔ پھر ہمیں محکمہ ٹرانسپورٹ کی وہ کار بھی نظر آ گئی جس نے واجد صاحب کی کار کو آسمان پر اٹھا لیا تھا۔ دراصل واجد صاحب نے غلط جگہ پارکنگ کر دی تھی اور کاریں اٹھا کر لے جانے والا محکمہ ان کی کار کو اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ نیچے فٹ پاتھ پر ایک ٹریفک کے سپاہی صاحب بھی کھڑے تھے۔ واجد صاحب نے ان سے درخواست کی کہ ان خواتین اور بچیوں کو زمین پر اتار دیا جائے۔ اگر پولیس ٹکٹ دینا چاہتی ہے تو دے دے۔

سپاہی صاحب مسکرائے اور بہت خوش اخلاقی کے ساتھ کہنے لگے "سر! آپ ٹھیک فرماتے ہیں مگر میں اب کچھ نہیں کر سکتا۔"

ہم نے پوچھا "یہ ہماری کار کو لے کر کہاں جا رہے ہیں؟"

بولے "نزدیک ہی ایک جگہ ہے۔ اس قسم کی تمام کاریں وہیں پہنچ جاتی ہیں اور سو ڈالر جرمانہ ادا کئے بغیر واپس نہیں ملتیں۔"

اتنی دیر میں ایک نہایت سمارٹ قسم کی کینیڈین خاتون کھٹ کھٹ کرتی ہوئی آن پہنچیں۔ انہوں نے آسمان پر لٹکی ہوئی کار اور اس میں سوار خواتین اور بچیوں پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر ہماری جانب متوجہ ہوئیں۔ یورپ اور امریکہ میں عام طور پر لوگ دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ انتہا تو یہ ہے کہ لڑائی جھگڑے اور قتل کی واردات کی جانب بھی کوئی توجہ نہیں دیتے۔ دیکھا کہ فٹ پاتھ پر کوئی مرا پڑا ہے اور ایک دو حضرات بندوقیں اور پستولیں لئے بھاگے جا رہے ہیں مگر کیا مجال جو کوئی رک کر دیکھ لے یا مقتول کے حال زار کی خبر لینے کی زحمت گوارا فرمائے۔ مگر جب ان خوب صورت خاتون نے فٹ پاتھ پر رک کر ہم لوگوں کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر پولیس والے سے پوچھا "آفیسر' کیا بات ہے؟" تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ پولیس والا بولا

"مس! انہوں نے غلط پارکنگ کر دی تھی۔ اب ان کی کار کو "ٹو" کر کے لے جا رہے ہیں۔ سڑک کے اس علاقے میں پارکنگ کے نتیجے میں یہی ہوتا ہے۔"

مس نے ایک بار پھر آسمان کی جانب دیکھا۔ پھر ہم سب کو دیکھا اور پوچھا "آپ

میں سے کار کا ڈرائیور کون ہے؟"

واجد صاحب نے فوراً سر آگے بڑھا دیا۔

انہوں نے پولیس والے کو گھورا اور کہا "آفیسر! ڈرائیور کی موجودگی میں تم کار "ٹو" کر کے کیسے لے جا سکتے ہو؟ تم ان سے کہہ کر کار ہٹوا بھی سکتے تھے۔"

پولیس والا کچھ بوکھلا گیا۔ وہ بولیں "کتنے افسوس کی بات ہے کہ کار کا ڈرائیور سامنے موجود ہے مگر آپ لوگوں نے ان کی فیملی کا تماشا بنا رکھا ہے۔ آپ لوگوں کی شکایت کروں گی۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

پولیس افسر نے فوراً اپنا نام بتایا اور پھر کہا "مس! بات یہ ہوئی کہ جس وقت کار "ٹو" کرنے والے آئے تھے اس وقت ان حضرات میں سے کوئی یہاں موجود نہیں تھا۔ جب انہوں نے کار کو اوپر اٹھا لیا تو یہ لوگ آئے۔"

"تو پھر تمہارا فرض کیا تھا؟" مس نے ڈانٹ کر پوچھا "کیا تمہیں یہ نہیں چاہئے تھا کہ فوراً ان لیڈیز کو نیچے اتار کر ان کے حوالے کر دیتے؟"

پولیس والا کچھ پریشان ہو گیا اور سر کھجاتے ہوئے اس نے سامنے کھڑی ٹرانسپورٹ کی گاڑی والے ڈرائیور کو اشارہ کیا کہ ان لوگوں کو نیچے اتار دو۔ چند لمحوں میں کار نیچے سڑک پر وہیں پہنچ گئی جہاں سے اٹھائی گئی تھی۔ پولیس والے نے خندہ پیشانی سے کہا "سوری سر! آپ کو زحمت ہوئی" پھر وہ مس صاحبہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا "آپ کی آگاہی کا شکریہ" اپنی ٹوپی کو انگلیاں لگائیں اور رخصت ہو گیا۔

مس صاحبہ کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بولیں "بعض اوقات یہ پولیس والے بہت زیادتی کرتے ہیں۔" اتنی دیر میں خواتین بھی وین سے اتر کر ہمارے پاس آ گئیں۔ مس صاحبہ نے شبنم کی رنگین اور خوشنما ساڑھی دیکھی تو بہت متاثر ہوئیں "کیا آپ انڈین ہیں؟"

"جی نہیں' ہم پاکستانی ہیں۔"

"معاف کرنا۔ دراصل ایسا لباس انڈین عورتیں پہنتی ہیں۔"

ہم نے کہا "پاکستان اور انڈیا میں بہت سے لباس مشترک ہیں۔ پہلے یہ ایک ہی ملک تھا۔"

"بہت خوب صورت لباس ہے۔"

"اسے ساڑھی کہتے ہیں۔ یہ ایک ہی کپڑا ہے جسے جسم کے گرد لپیٹ لیا جاتا ہے۔"

وہ حیران رہ گئیں "مگر اس کی فٹنگ کتنی مکمل ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر سی لیا جاتا ہے۔ آپ لوگ سیاح ہیں؟"

واجد نے انہیں بتایا کہ یہ لوگ ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں یہاں آئے ہوئے ہیں اور یہ ان کی ہیروئن ہیں۔

وہ شبنم کے سانولے سلونے چہرے، بڑی بڑی سیاہ روشن آنکھوں اور چمکیلے لمبے سیاہ بالوں کو دیکھتی رہیں پھر بولیں "واقعی، انہیں ہیروئن ہی ہونا چاہئے" یہ کہہ کر انہوں نے "بائی" کہا اور رخصت ہو گئیں۔

شبنم نے فخریہ انداز میں ہمیں دیکھا اور کہا "سن لیا آپ نے؟ وہ لیڈی کیا بولتی تھی؟"

ہم نے کہا ؟پردھان۔ اس لیڈی کی بات چھوڑیے۔ یہ سفید فام لوگ کالے رنگ کو دیکھ کر ویسے ہی احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگ گورا ہونے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں اور یہ کالے ہونے کے لئے گھنٹوں تپتی ہوئی دھوپ میں لیٹے رہتے ہیں۔"

"آپ مجھ کو کالا بولے؟" شبنم نے ہمیں گھورا۔

واجد صاحب نے کہا ؟بھائی آہستہ بولئے۔ اگر کالوں نے سن لیا تو بہت شور مچائیں گے، اور یہاں تو گورا رنگ کوئی خوبی نہیں سمجھی جاتی۔ آپ نے دیکھا نہیں وہ آپ کو کیسی رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔"

شبنم مسکرانے لگیں۔ ان کی یہ عادت بہت اچھی ہے کہ اول تو وہ غصہ ہی نہیں کرتیں اور اگر کبھی مصنوعی غصہ کرتی بھی ہیں تو فوراً ہی ان کا غصہ اتر بھی جاتا ہے۔

واپسی پر واجد صاحب نے شہر کی چند سڑکوں کی سیر کرائی اور پھر ہم لوگ مارکھم روانہ ہو گئے۔ ٹورنٹو سے مارکھم جانے کا راستہ نہایت خوب صورت ہے۔ کہیں کہیں پہاڑی علاقہ ہے جس میں سے سڑک بل کھاتی ہوئی اور نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی بہت بھلی لگتی ہے۔ خاص طور پر رات کے وقت یہ منظر دیدنی ہوتا ہے، جب کاروں کی روشنیوں کی مسلسل قطاریں ان راستوں سے گزرتی ہیں تو ایک عجیب ہی سماں بندھ جاتا ہے۔ کینیڈا کو آپ امریکہ کا جڑواں بھائی کہہ لیجئے۔ سب کچھ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ امریکہ میں ہوتا ہے۔ سڑکیں، عمارتیں، سڑکوں کے نشانات، رہن سہن، بول چال، سبھی کچھ امریکی طرز کا ہے۔ یوں تو ان دونوں ملکوں کے مابین بہت گہرے روابط ہیں مگر کینیڈا والے یہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ امریکہ انہیں ایکسپلائیٹ کر رہا ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں اور تجارتی اداروں پر امریکیوں کا قبضہ ہے۔ امریکہ کسی شعبے میں بھی کینیڈا والوں کو پنپنے نہیں دیتا۔ جو شخص بھی اپنے شعبے میں تھوڑی ترقی کرتا ہے اس کی اگلی منزل امریکہ ہوتی ہے۔ ہم نے تو صرف یہ فرق محسوس کیا کہ یہاں بھاگ دوڑ اور افراتفری امریکہ کے مقابلے میں کم ہے اور لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے کے لئے بھی کچھ وقت مل جاتا ہے۔ سب سے بڑا فرق یہ بھی ہے کہ امریکہ کے مقابلے میں کینیڈا میں فلاحی مملکت کا نظام قائم ہے۔ مثلاً تعلیم اور طبی امداد لوگوں کو مفت فراہم کی جاتی ہے۔ کینیڈا کے معاملے میں ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ امریکہ کا قریبی ہمسایہ ہے مگر انگلستان کی نوآبادی رہا ہے اس لئے سماجی اور معاشرتی امور میں وہاں فلاحی نظام رائج ہے۔ کینیڈا میں بہترین اسپتال قائم ہیں جہاں شہریوں کا علاج بالکل مفت ہوتا ہے۔ دراصل یہ سوشل سیکیوریٹی کا نظام ہے۔ برسرروزگار ہوتے ہیں تو تمام شہری اپنی آمدنی کا ایک حصہ سوشل

سیکیوریٹی کے سلسلے میں حکومت کو دیتے رہتے ہیں اور جب وہ بے روزگار ہوتے ہیں تو حکومت ان کی کفالت کرتی ہے۔ انہیں وظائف اور مالی امداد دیتی ہے۔ بے روزگاری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی کو اس کی پسند کا روزگار نہیں ملتا اس لئے وہ آرام سے گھر بیٹھا ہوا ہے اور حکومت اسے معقول وظیفہ دے رہی ہے۔ اس سہولت کے بعض لوگ غلط اور ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے ہیں اور ایسا کرنے والوں میں بڑی تعداد ایشیائی باشندوں کی ہے۔ ہم ایشیائی اپنی عادات و اطوار اور اپنا کلچر اپنے ساتھ ہر جگہ لے جاتے ہیں۔

ٹورنٹو کے نواحی علاقے دراصل علیحدہ کاؤنٹیز ہیں مگر آپس میں اتنا زیادہ واسطہ اور ارتباط ہے کہ ایک ہی شہر کا گمان گزرتا ہے۔ ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو سے باہر نکلیں تو فضا بہت کھلی کھلی اور صاف ستھری ہے۔ سبزہ زار' میدان اور باغات بھی بہت زیادہ ہیں۔ آبادیوں کے درمیان میں بھی باغ اور سرسبز مقامات ہیں جن میں پھل اور سبزیاں کاشت کی جاتی ہیں۔ آپ نے پاکستان کے پہاڑی مقامات پر جاتے ہوئے دیکھا ہوگا کہ لوگ سڑک کے کنارے پھل یا پھول لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور گزرنے والے رک کر ان سے یہ پھل وغیرہ خرید لیتے ہیں کیونکہ ان غریبوں کے پاس اپنا سامان مارکیٹ تک پہنچانے کی سہولت نہیں ہوتی اس لئے یہ بہت سستے داموں اپنا مال فروخت کر دیتے ہیں۔ پچاس کی دہائی میں ہم ایک بار وادی کاغان گئے تھے۔ اس وقت وہاں پختہ سڑکیں بھی نہیں تھیں اور راستے اس قدر خوفناک اور خطرناک تھے کہ کمزور دل والے تو آنکھیں بند کر لیا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ چند اور صحافی بھی تھے اور ان میں سے دو تین حضرات تو سفر پر جانے سے پہلے خواب آور گولیاں کھا لیا کرتے تھے۔ وادی کاغان میں بعض مقامات پر ہم نے دیکھا کہ پہاڑی لوگ' مرغیاں پکڑے کھڑے ہیں اور پاس ہی بوریاں رکھی ہوئی ہیں۔ گاڑی روک کر معلوم کیا تو انہیں بتایا کہ وہ مرغیاں اور اخروٹ فروخت کر رہے ہیں۔ کاغان کی وادی اس زمانے میں بہت دور دراز علاقہ تصور کی جاتی تھی۔ آنا جانا تو ایک طرف بہت سے پاکستانیوں کو تو اس کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ مقامی آبادی کے لئے روزگار حاصل کرنا اور ضروریات زندگی کے لئے روپیہ کمانا بھی بہت مشکل تھا۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق مکئی' پھل اور سبزیاں پیدا کر لیا کرتے تھے۔

مرغیاں پکا کر گوشت کے طور پر استعمال کر لیا کرتے تھے۔ اور ان کے انڈوں سے پیٹ کا ایندھن بھرتے تھے۔ جب قیمت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ مرغی آٹھ آنے میں مل جائے گی۔ ایک صاحب نے بھاؤ تاؤ کیا تو وہ غریب چار آنے میں مرغی فروخت کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ انڈے کی قیمت دو پیسے تھی۔ اگر بھاؤ تاؤ کیا جاتا تو شاید ایک پیسے کا انڈا بھی مل جاتا۔ مرغی اور انڈے تو ہمارے لئے بے کار تھے اخروٹ البتہ کار آمد چیز تھی۔ اخروٹ کی چھوٹی بوری وہ ایک روپے میں فروخت کر رہے تھے۔ چند حضرات نے مول تول کرنا چاہا مگر دوسروں نے انہیں بہت شرمندہ کیا کہ بندہ خدا۔ ایک روپے میں اخروٹ کی پوری بوری مل رہی ہے۔ اس کے بعد اور کیا کمی کرانا چاہتے ہو؟ اگر ہم لوگوں کا بس چلتا تو اخروٹوں کی سینکڑوں بوریاں خرید لیتے مگر گاڑی میں رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ مجبوراً ہر شخص نے ایک ایک بوری خریدنے پر اکتفا کیا مگر بعد میں یہ پچھتاوا رہا کہ ہم زیادہ بوریاں نہیں خرید سکے تھے۔ یہ غالباً ۱۹۵۶ کا واقعہ ہے۔

مارکھم کی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر ہمیں وادی کاغان اور وہاں کے اخروٹ یاد آ گئے۔ بعض سڑکوں کے کنارے چھوٹے چھوٹے سائن بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر "تازہ سبزی اور پھلوں" کے بارے میں درج تھا۔ واجد صاحب نے بتایا کہ اندر سبزیوں اور پھلوں کے باغات ہیں جہاں سے بہت سستے تازہ پھل اور سبزیاں مل جاتی ہیں اور بہت سے لوگ اپنی ضرورت کے لئے یہیں سے خریداری کرتے ہیں۔ دیکھا آپ نے؟ ملک مختلف ہوتے ہیں' لوگ مختلف ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود بہت سی چیزیں ہر جگہ قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہم لوگ اپنے اپارٹمنٹ پہنچے تو رات ہونے والی تھی۔ پرویز صاحب کو اپنے اسسٹنٹ اور دوسرے حضرات کے ساتھ شوٹنگ کے پروگرام کے سلسلے میں بات چیت کرنی تھی۔ شاہ جی اپنے کمرے میں جا کر غسل کرنے کے بعد دراز ہو گئے۔ ہم نے ڈرائنگ روم میں جھانک کر دیکھا تو ٹی وی پر عجیب و غریب قسم کا پروگرام ہو رہا تھا۔ ہر لمحہ بعد تصویر بدل جاتی تھی اور آوازیں بھی بالکل مختلف اور عجیب و غریب سنائی دیتی تھیں۔ پروگرام کیا تھا بس بیس بائیس مسالوں کی چاٹ تھی۔ تصویریں اتنی تیزی سے بدل رہی تھیں کہ نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ ابھی ہم اس نرالے پروگرام کے بارے میں غور ہی کر

رہے تھے کہ ایک صوفے کے برابر قالین پر نادیہ اور پارو بیٹھی ہوئی دکھائی دیں۔ ریموٹ کنٹرول کا آلہ ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس تیزی سے بٹن دبا رہی تھیں کہ پروگرام عجیب و غریب بن گیا تھا۔ پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

بولیں "ہم اپنی پسند کا پروگرام تلاش کر رہے ہیں۔"

ہم نے کہا "تھوڑے صبر سے کام لو ایک جگہ نگاہ ٹھہرے گی تو تمہیں پروگرام کا پتا چلے گا نا۔"

جواب ملا "ہمیں آواز سے پروگرام کا پتا چل جاتا ہے۔"

"تمہیں کون سے پروگرام کی تلاش ہے؟"

اس کے جواب میں انہوں نے کہا "ڈے نسٹی"

اس زمانے میں ٹیلی ویژن کا سلسلہ وار پروگرام سارے امریکہ اور کینیڈا میں مقبول ترین پروگرام سمجھا جاتا تھا۔ ہم نے کہا "مگر وہ تو بڑوں کے لئے ہوتا ہے، بچوں کو نہیں دیکھنا چاہئے۔"

"تو پھر آپ بڑے ہو کر ہم بچوں کے پروگرام کیوں دیکھتے ہیں؟"

سوچا اب کون ان بچوں کے منہ لگے۔ خواہ مخواہ لاجواب کر دیتے ہیں۔

رات کو کھانے کے بعد ٹہلنا ہمارے معمول میں داخل تھا۔ سچ پوچھئے تو ہمیں ٹہلنے کا شوق نہیں ہے مگر وہاں ماحول اس قدر خوش گوار اور فضا اتنی شفاف تھی اور سڑکوں کے ساتھ والی فٹ پاتھوں پر پیدل چلنا اس قدر آسان اور پر لطف تھا کہ خواہ مخواہ واک کرنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ گرمی کا موسم تھا مگر کینیڈا کی گرمی بھی نرالی ہی دیکھی۔ دن کے وقت دھوپ میں خاصی تمازت ہوتی ہے۔ اگر دھوپ میں پیدل چلیں تو ہلکا سا پسینہ بھی آجاتا ہے اور گرمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود ہوا اتنی ٹھنڈی اور ترو تازہ ہوتی ہے کہ لطف آجاتا ہے۔ اگر آپ کچھ دیر کے لئے سائے دار جگہ پر کھڑے ہو جائیں تو ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے سردی سی لگنی شروع ہو جاتی ہے۔

کمرے میں اگر دھوپ کا رخ ہے تو خاصی گرمی محسوس ہوتی ہے جسے ایک چھوٹا سا ٹیبل فین چلا کر کم کیا جا سکتا ہے۔ کمروں میں ائر کنڈیشنر بھی لگے ہوئے تھے۔ ہمیں تو کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی مگر بعض لوگ مستقل

طور پر ائر کنڈیشنر استعمال کرتے رہے۔ جب ننھے صاحب ٹورنٹو پہنچے تو ان کا یہ عالم تھا کہ کمرے میں بنیان پہن کر اور تہمد باندھ کر بیٹھتے تھے اور ائر کنڈیشن ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ ہم نے ایک دو بار کہا بھی کہ اس سے کمرے میں بہت سردی ہو جاتی ہے۔ ہمارے تو ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔

بے نیازی سے بولے "یہ آپ کے اپنے ہاتھ پیروں کا قصور ہے۔ جب ان پر گوشت نہیں ہو گا تو پھر سردی تو سیدھی ہڈیوں تک پہنچ جائے گی۔ ذرا ادھر غور کیجئے، ہماری انگلیوں پر ہاتھ پیروں پر اور سارے جسم پر قدرتی کشن اور فوم لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے گزر کر سردی ہماری ہڈیوں تک کہاں پہنچتی ہے۔ آپ بھی کچھ کھایا پیا کریں تو سردی نہیں لگے گی۔"

ننھا بہت دلچسپ آدمی تھے اور بہت پر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔ ہمارا ان کا دو تین فلموں میں ساتھ رہا اور بہت اچھا وقت گزرا۔ وہ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے اور بات بات پر لطیفے سناتے تھے۔ آپ نے کوئی واقعہ سنایا تو وہ فوراً کہیں گے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ اور فوراً حسب حال لطیفہ سنا دیں گے۔ ان کی عادت تھی کہ کوئی نیا لطیفہ سنتے یا پڑھتے تو فوراً دوسروں کو سنا دیتے اور کہتے کہ آپ بھی سب کو سنا دیں۔ اس طرح دنیا میں لوگ ہنستے رہتے ہیں۔

ایک دن ان کے اپارٹمنٹ میں بہت ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے کہا "آپ اے سی فوراً بند کر دیں ورنہ ہم تو سردی سے مرجائیں گے۔"

وہ ہنسنے لگے، بولے "آپ نے سردی سے مرنے والا لطیفہ سنا ہے؟"

ہم نے انکار میں سر ہلا دیا تو انہوں نے فوراً لطیفہ سنانا شروع کر دیا، کہنے لگے "مرنے کے بعد کچھ لوگ دوسری دنیا میں اکٹھے ہوئے تو تبادلہ خیال شروع ہو گیا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کر دیا کہ بھئی آپ کیسے مرے تھے؟ موت کا سبب کیا تھا؟ کسی نے کہا میں بیماری سے مر گیا تھا۔ کسی نے کہا دوائی کھانے سے مر گیا تھا۔ کوئی قتل ہو کر مرا تھا۔ کوئی حادثے کا شکار ہو کر مرا تھا۔ ایک صاحب بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ سب نے پوچھا کچھ آپ بھی فرمائیں، آپ کی موت کیسے واقع ہوئی تھی۔ کیا کسی بیماری سے مرے تھے؟"

انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر کیا قتل ہو گئے تھے۔ حادثے میں مر گئے تھے یا کسی نے زہر دے دیا تھا؟"

وہ آہ سرد بھر کر بولے "بھائیو' میں وہ بد نصیب ہوں جسے کوئی بیماری نہیں آئی۔ نہ کسی نے قتل کیا نہ کوئی حادثہ پیش آیا۔ نہ کسی نے زہر کھلایا۔"

"تو پھر آپ کیسے مر گئے؟" سب نے حیران ہو کر پوچھا۔ بولے "بس غلط فہمی سے مر گیا۔"

"غلط فہمی سے؟ وہ کیسے؟"

بولے "صاحب ایک دن میں اچانک گھر پہنچ گیا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ میری بیوی کی کسی سے آنکھ لڑ گئی ہے اور وہ میری غیر موجودگی میں اس سے ملتی ہے۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ ایک دن میں خلاف توقع گھر پہنچ گیا۔ کان لگا کر سنا تو اندر سے کسی مرد کی آواز آ رہی تھی۔ میں غصے سے پاگل ہو گیا۔ دستک دے کر آواز دی اور دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو میری بیوی گھبرائی ہوئی کھڑی تھی۔ میں نے پستول نکال کر پوچھا "بتاؤ۔ وہ کہاں ہے؟"

وہ کچھ نہ بولی تو میں نے اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ بعد میں کمرے کا کونہ کونہ چھان لیا مگر کسی شخص کا پتا نشان نہ پایا۔ شاید ریڈیو پر کوئی پروگرام ہو رہا ہو گا جس کی وجہ سے مجھے غلط فہمی ہو گئی۔ مجھے اس قدر دکھ ہوا کہ خود ہی تھانے جا کر اپنی پیاری بیوی کے قتل کے جرم کا اقرار کر لیا۔ اس طرح پھانسی پا کر میں اوپر چلا آیا۔ مگر یہ سب کچھ محض غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ ایک اور صاحب جو خاموشی سے یہ داستان سن رہے تھے غضب ناک ہو کر بولے "تم نے ہر جگہ تلاش کر لیا تھا؟"

کہنے لگے "ہر جگہ' ہر گوشہ۔"

وہ دانت پیس کر بولے "ارے کم بخت' اگر فریج کھول کر بھی دیکھ لیا ہوتا تو آج ہم دونوں زندہ ہوتے۔"

ایک صاحب بولے "یعنی شوہر کا شک درست تھا اور بیوی نے اپنے عاشق کو گھبراہٹ میں فریج کے اندر چھپا دیا تھا۔ وہ خود گولی کھا کر مر گئی اور وہ عاشق غریب فریج کے اندر جم کر جان دے بیٹھا۔"

نغما نے انہیں گھورا اور کہنے لگے "بھائی صاحب' میں نے آپ کو لطیفہ سنایا ہے۔ کسی شعر کی تشریح کرنے کے لئے نہیں کہا ہے۔ مجھے تو آپ جیسے لوگوں پر ترس آتا ہے۔"

"ترس"

"اور کیا' بھائی آپ وہ بد قسمت ہیں' جو لطیفہ سن کر بھی نہیں ہنستے اور اس میں معنی مطلب تلاش کرنے لگتے ہیں۔"

دوسرے دن ہم ذرا دیر سے اٹھے۔ پتا چلا کہ پرویز ملک صاحب پھر لوکیشنز کی تلاش میں چلے گئے ہیں۔ ندیم صاحب کو فون آیا تو وہ موجود تھے

"بیگ صاحب کیا ہو رہا ہے؟"

"ناشتا۔"

"کہاں سے آیا؟"

"خود بنایا ہے۔"

"واقعی! کیا آپ سچ مچ ناشتا بنا لیتے ہیں؟"

"یقین نہیں آتا تو میرے ساتھ ہی آ کر ناشتا کریں۔"

ہمیں کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا کہ ندیم اپنے لئے بذات خود ناشتا بنا لیتے ہیں۔ ہمارا اپنا یہ حال ہے کہ ہم ڈھنگ سے چائے تک نہیں بنا سکتے حالانکہ اس کے لئے صرف پانی ابالنا ضروری ہے۔ باقی کام بہت آسان ہیں یعنی چائے دانی میں چائے کی پتی ڈال کر اس میں ابلتا ہوا پانی ڈال دیں۔ کچھ دیر رنگ آنے کا انتظار کریں۔ اور پھر پیالی میں ڈال کر چینی اور دودھ ملا کر نوش فرمائیں۔ یورپ اور امریکہ میں یہ کام اور بھی آسان تھا۔ وہاں ٹی بیگ مل جاتے تھے جو اس زمانے میں پاکستان میں نہیں تھے۔ اب اتنا کام رہ گیا کہ پانی ابالیں۔ اسے پیالی یا مگ میں ڈالیں اور اس کے اندر ایک عدد ٹی بیگ ڈال دیں۔ لیجئے چائے تیار ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہم سے تو پہلا مرحلہ ہی طے نہیں ہو سکا۔ ایک بار ہم نے پانی ابالنے کے لئے چولہا جلانا چاہا اور سارے کچن میں چولہا جلانے کے لئے ماچس تلاش کرتے رہے۔ جب ماچس نہ ملی تو صبر کر کے ٹھنڈا دودھ پی کر شکر ادا کیا۔ بعد میں ہماری میزبان نے آ کر بتایا کہ یہ چولہا تو الیکٹرک والا ہے۔ سوئچ آن کریں اور چولہا جل

جائے گا۔ اس تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے چند ماہ بعد لندن میں ایک دوست کے باورچی خانے میں چائے بنانے کی کوشش کی۔ پانی چولہے پر رکھ دیا۔ سوئچ بھی آن کر دیا مگر پانی ٹھنڈا کا ٹھنڈا۔ بہت پریشان ہوئے۔ لندن میں بجلی غائب تو نہیں ہوتی ہے پھر بھی مزید تصدیق کے لئے دوسری بتیاں آن کر کے دیکھیں۔ بجلی موجود تھی۔ مگر چائے کا چولھا جلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آخر ایک صابر و شاکر مسلمان کی طرح پھر ٹھنڈا دودھ پی لیا۔ بعد میں یہ پتا چلا کہ وہ چولہا دراصل 'گیس' والا تھا اور ہم کسی اور چیز کا سوئچ آن کر کے چولہا روشن ہونے کا انتظار کرتے رہے تھے۔ جب ہمارے ذاتی حالات ایسے تھے تو پھر یہ کیسے مان لیتے کہ فلم اسٹار ندیم اتنے سلیقہ مند ہیں کہ خود ہی اپنا ناشتا بنا لیتے ہیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ ہم تصدیق کرنے کے لئے ان کے ساتھ ناشتا کرتے۔ چنانچہ ان کے اپارٹمنٹ میں پہنچ گئے۔ پارو نے جب سنا کہ ہم ندیم انکل کے ہاتھ کا بنا ہوا ناشتا کرنے جا رہے ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لیں۔ ندیم حسب معمول نہا دھو کر اور لباس پہن کر ایسے تیار بیٹھے تھے جیسے کسی پارٹی میں جانے والے ہوں۔ یہ ان کی عادت ہے کہ ہروقت اور ہردم بالکل مستعد اور تیار رہتے ہیں۔ یعنی شاہ جی کے الفاظ میں "ٹچن ٹاچ" ہوتے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائے اور بولے "آیئے کچن میں آجایئے تاکہ آپ کے سامنے ناشتا بن جائے۔"

ہم فوراً کچن میں پہنچ گئے۔ وہاں ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے فریج میں سے کچھ انڈے نکالے اور انہیں توڑ کر ایک برتن میں ڈال دیا۔ پھر انہیں چمچے سے پھینٹنے لگے۔ فرائی پان پہلے ہی ہلکی آنچ والے چولہے پر رکھا ہوا تھا۔ اس میں تھوڑا سا تیل بھی تھا۔ انہوں نے بڑے اہتمام سے انڈے فرائی پان میں ڈال دیے اور ایک چمچہ اٹھا کر اسے ہلانے لگے۔ چند لمحے بعد پیلے رنگ کا آملیٹ تیار تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں انڈوں کے سوا کچھ اور چیز نہیں تھی۔ نہ پیاز' نہ ٹماٹر' نہ کوئی اور ترکاری۔ یہاں تک کہ نمک تک نہیں تھا۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ آپ اپنی پسند کا نمک ڈال کر کھائیں۔ لیجئے' آملیٹ تو تیار ہو گیا۔ اب انہوں نے ڈبل روٹی کے سلائس ٹوسٹر میں ڈالے اور بٹن دبا دیا۔ چند لمحے بعد ٹوسٹ بن کر اچھل کر باہر نکل آئے۔ انہوں نے ٹوسٹوں پہ مکھن لگایا اور میز پر رکھ دیا۔ ہم حیران کھڑے یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے جو

کام ہم کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے وہ ہمارا ہیرو اتنی آسانی سے کر رہا تھا کہ حیرت ہو رہی تھی۔ خیر' اس میں کوئی کمال بھی نہیں تھا۔ ہیرو تو ہیرو ہوتا ہے۔ دنیا کا کون سا کام ہے جو ہیرو نہیں کر سکتا؟ اگر پیاز کے بغیر آملیٹ بنا لیا تو کون سا تیر مار لیا۔ پیلے رنگ کا یہ پھولا پھولا سا آملیٹ ہم نے ٹوسٹ پر رکھ کر کھایا تو بہت مزہ آیا یہ حقیقت ہے کہ ایسا آملیٹ اس سے پہلے نہ ہم نے دیکھا نہ کھایا تھا۔ سادگی کا اپنا علیحدہ حسن اور لطف ہوتا ہے۔ یہ آملیٹ بھی بالکل سادہ اور خالص تھا۔ انڈوں کے علاوہ اس میں کسی چیز کی ملاوٹ نہیں تھی۔

"کیوں آفاقی صاحب! پسند آیا آملیٹ؟" ندیم کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

ہمارے جواب دینے سے پہلے پارو بول پڑی "انکل! یہ کیسا آملیٹ ہے۔ ہم نے آملیٹ بھی دیکھا ہے اور ماما انڈہ فرائی بھی کرتی ہیں۔ ایسی چیز تو ہم نے کبھی دیکھی ہی نہیں۔"

ندیم فخریہ انداز میں مسکرائے "یہ بتاؤ کہ مزہ کیسا ہے؟"

پارو نے کہا "مزہ تو بالکل انڈے جیسا ہے۔"

"بھئی وہ تو ہو گا۔ اس لئے کہ یہ انڈے کا آملیٹ ہے۔ آلو ٹماٹر یا گاجر کا آملیٹ تو نہیں ہے نا۔"

کچن میں آملیٹ کھانے کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ ندیم کو اچانک یاد آیا کہ اس وقت ٹی وی پر ان کا پسندیدہ پروگرام ہوتا ہے۔ ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی آن کیا تو وہ پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ وہ بولے "بس میں ایک منٹ میں چائے لے کر آتا ہوں۔ آپ دیکھئے کہ یہ کتنا دلچسپ پروگرام ہے۔"

سچی بات یہ ہے کہ ہمیں یہ پروگرام بالکل پسند نہیں تھا۔ اس لئے ہم نے میگزین اٹھا کر دیکھنے شروع کر دیے۔ تین منٹ بعد ندیم صاحب چائے کے مگ لے کر آئے تو دیکھا کہ ٹی وی پر کوئی اور پروگرام چل رہا ہے۔

پوچھا "ارے' وہ پروگرام کہاں گیا؟"

پارو نے کہا "پتا نہیں انکل!"

بولے "مگر' یہ ہوا کیسے' خود بخود پروگرام کیسے بدل گیا؟"

"خود نہیں بدلا۔ ہم نے بٹن دبائے تھے" پارو نے فخریہ طور پر کہا۔

"افوہ' یہ تم نے کیا کر دیا پارو۔ لاؤ یہ ریموٹ مجھے دو۔"

ندیم نے ریموٹ ہاتھ میں تھام کر مختلف بٹن دبانے شروع کر دیے اور مختلف چینل سے پیش کئے جانے والے پروگرام سامنے آنے لگے۔ مگر ندیم کا مطلوبہ پروگرام کہیں گم ہو گیا تھا۔

"ایسے نہیں ملے گا انکل" پارو نے مطلع کیا۔

"کیوں نہیں ملے گا؟"

"ہم جب بھی ایسا کرتے ہیں تو کسی کو بھی اصل پروگرام نہیں ملتا۔"

ندیم کو ہنسی آ گئی "مگر تم ایسا کرتی کیوں ہو؟"

"بس' بٹن دبانے میں مزہ آتا ہے۔"

پرویز اور ریاض بخاری شوٹنگ کے لئے مختلف مقامات دیکھتے پھر رہے تھے۔ اس فلم کی کہانی کا پھیلاؤ بہت تھا اور اصل لوکیشنز پر فلم بندی کرنے کا پروگرام تھا اس لئے مناسب اور موزوں عمارتوں' باغوں اور دوسرے تفریحی مقامات تلاش کر کے ان کا تعین کرنا بہت ضروری تھا۔ اس سلسلے میں واجد صاحب اور جاوید چوہدری بہت کار آمد ثابت ہو رہے تھے۔ وہ دونوں سالہا سال سے ٹورنٹو میں مقیم تھے۔ جس قسم کی جگہ کا ان کے سامنے نقشہ کھینچا جاتا وہ فوراً دکھانے کے لئے چل پڑتے۔ کینیڈا میں عارضی عرصے کے لئے تو انٹر نیشنل ڈرائیونگ لائسنس بھی چل سکتا ہے۔ بلکہ اگر کوئی شریف پولیس والا مل جائے تو آپ اپنے ملک کا لائسنس بھی چلا سکتے ہیں۔ مگر احتیاطاً لوگ ڈرائیونگ سے پرہیز کر رہے تھے۔ ہمارے پاس امریکی لائسنس موجود تھا جو کینیڈا میں بہت خوشی کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔ دو مختلف ملک ہونے کے باوجود امریکہ اور کینیڈا کا باہمی رشتہ بہت عجیب ہے' بس اسے دوستی اور دشمنی کا رشتہ کہہ لیجئے۔ مگر ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرنے والے کو کسی قسم کی دشواری یا پریشانی پیش نہیں آتی۔ اگر آپ نے کار امریکہ میں خریدی ہے اور انشورنش بھی امریکہ میں کرائی ہے مگر حادثے کی صورت میں یہ کسی اور وجہ سے اس کی مرمت کینیڈا میں کرانا چاہتے ہیں تو ایسی صورت میں کسی بھی ورکشاپ میں چلے جائیے۔ صرف کاغذ پر دستخط کرنے کے بعد آپ کا ہر کام ہو جائے گا۔ امریکی

بینکوں کے چیک کینیڈا کے بینکوں میں کیش ہو جاتے ہیں۔ اس سے بڑی سہولت اور کیا ہو گی۔ وجہ یہ ہے کہ تمام بڑی بڑی امریکی کمپنیوں اور اداروں کے دفاتر اور شاخیں دونوں ملکوں میں موجود ہیں اور انہوں نے باہمی سہولت اور فائدے کے پیش نظر آپس میں ایسے معاہدے کر رکھے ہیں' جن کی وجہ سے لوگوں کو بھی فائدہ ہے اور انہیں بھی۔ امریکہ میں کسی شاپنگ سینٹر سے خریدا ہوا لباس یا دوسرا سامان اگر آپ واپس کرنا چاہتے ہیں تو کینیڈا میں اس کمپنی کی مقامی شاخ میں جا کر رسید دکھائیں۔ کوئی سوال دریافت کئے بغیر وہ چیز واپس قبول کر لی جائے گی۔ مختصر یہ کہ کینیڈا والوں کو امریکہ میں اور امریکیوں کو کینیڈا میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ اور اگر ان تمام باتوں کے باوجود ضرورت پیش آ جائے تو ٹیلی فون اٹھا کر نمبر گھمائیے اور اسی وقت دوسرے ملک میں بات کر کے اپنا مسئلہ حل کر لیجئے۔ دیکھئے زندہ اور سمجھ دار قومیں کس طرح منصوبہ بندی کرتی ہیں اور اپنے عوام کی سہولت' آسائش اور فائدہ پہنچانے کے لئے کیا کچھ کرتی ہیں۔ ہم ہیں کہ بلا وجہ کے اعتراضات اور جھگڑوں میں الجھے ہوئے ہیں یا پھر انا کا سوال بنا کر بیٹھے ہیں جس کی وجہ سے مشکلات اور پریشانیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے مگر سوچنے اور غور کرنے کی فرصت کس کے پاس ہے؟ یہ بات نہیں ہے کہ امریکی اور کینیڈین ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہیں۔ جی بالکل نہیں۔ دونوں ملکوں کے عوام کے مابین مقابلہ اور مسابقت کی دوڑ جاری ہے اور ایک دوسرے سے بے شمار شکایات ہیں مگر دوسرے کام بھی جاری ہیں۔

فلم ساز و ہدایت کار ایس ایم یوسف صاحب کے پیغامات ہمیں ٹورنٹو ائر پورٹ ہی وصول ہونے شروع ہو گئے تھے اور اس کے بعد ہم جہاں بھی گئے کسی پیامبر نے یوسف صاحب کا پیغام ہم تک پہنچایا۔ آپ شاید سوچتے ہوں گے کہ ہم یوسف صاحب کے قصے کو بھول ہی گئے۔ یہ بات نہیں ہے۔ دراصل بات سے بات نکلتی آتی ہے اور بہت سی باتوں کے لئے ہمیں دوبارہ واپس اپنے حافظے کی الماری کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ جب ہم نے بچپن میں الف لیلیٰ کی داستان اور پھر بعد میں طلسم ہوشربا وغیرہ جیسی کتابیں پڑھیں تو ہم حیران ہوتے تھے کہ لکھنے والے نے کس طرح بات سے بات نکالی ہے اور ایک کہانی کے اندر سے دوسری کہانی کو جنم دیا ہے۔ مگر اب ہمیں محسوس ہوا کہ اگر آپ کے پاس باتیں بہت

زیادہ ہوں تو پھر اس ڈھیر میں سے مختلف قسم کی باتیں' داستانیں اور کہانیاں نکلتی رہتی ہیں۔ اب ہمارے سفرنامے ہی کو دیکھ لیجئے۔ ہم نے جن دنوں یہ سفر کئے اس وقت اخبارات میں مختصر تاثرات پر مشتمل کالم لکھتے رہے تھے۔ مگر بے شمار کہانیاں اور واقعات کا ایک انبار تھا جو ہمارے ذہن میں اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہم نے سفرنامہ لکھنے کے لئے نہ تو کوئی یادداشت لکھی تھی اور نہ ہی نوٹس تحریر کئے تھے۔ کیونکہ سفرنامہ لکھنے کا ارادہ ہی نہیں تھا اس لئے ہم اپنے ذہن کے کباڑ خانے میں ان واقعات کو پھینکتے رہے۔ کباڑ قسم کی چیز کسی زمانے میں ہر گھر میں ہوا کرتی تھی اور یہ کباڑ بہت اہتمام سے سنبھال کر رکھا جاتا تھا۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے یہ فالتو اور غیر ضروری سامان ہوا کرتا تھا جسے اصولاً تو پھینک دینا مناسب تھا مگر گھر والے اس خیال سے ان فالتو چیزوں کو اپنے گھریلو کباڑ خانے میں ڈال دیا کرتے تھے کہ بہت ممکن ہے کبھی ان میں سے کوئی چیز کام آ جائے۔ بعض اوقات یہ چیزیں کام بھی آ جاتی تھیں مگر بیشتر اوقات "کباڑ" ہی رہا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ سالہا سال بعد اس کباڑ کو کباڑیے کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا تھا۔ یہ گئے دنوں کی باتیں ہیں جب لوگوں کے پاس بڑے بڑے گھر اور فالتو کمرے ہوا کرتے تھے۔ جہاں یہ کباڑ ڈال دیا جاتا تھا۔ اب گھر چھوٹے ہو گئے ہیں' کمرے سکڑ گئے ہیں اور انسانوں کے رہنے کے لئے بھی کافی جگہ موجود نہیں ہے۔ ایسے میں کباڑ کو کہاں رکھا جائے؟ آج کل کے گھروں میں اور بڑی بڑی کوٹھیوں تک میں صرف اسٹور روم ہوا کرتے ہیں جہاں تمام ضروری اشیا اسٹور کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جگہ کباڑ کے لئے استعمال نہیں کی جا سکتی کہ اس میں گنجائش ہی نہیں باقی رہتی۔ جدید زمانے میں انسانون کے دلوں اور مکانوں میں گنجائش بہت کم رہ گئی ہے۔ اس لئے جہاں سے بہت پرانی روایات ختم ہو رہی ہیں وہیں "کباڑ خانے" کا سسٹم بھی دم توڑ چکا ہے لیکن ہم نے ابھی تک اپنے گھر میں اور ذہن میں کباڑ کے لئے گنجائش باقی رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب جو سفرنامے لکھنے کا وقت آیا تو ہم نے ذہن کے کباڑ خانے کو کھنگالنا شروع کر دیا اور وہاں سے جو پرانی "زنگ آلود" کرم خوردہ یادیں برآمد ہوئیں انہیں جھاڑ پونچھ کر تحریر کی صورت میں پیش کر دیا۔ اس وضاحت کو آپ جملہ معترضہ سمجھ لیجئے۔ ہمارے اپارٹمنٹ میں پہنچنے کے آدھ پون گھنٹے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف ایس' ایم یوسف صاحب بول رہے تھے۔ ہم نے سلام عرض

کرنے کے بعد بتایا کہ آپ کے تمام پیغامات موصول ہو چکے ہیں اور میں آپ سے رابطہ قائم کرنے ہی والا تھا۔

کہنے لگے "آپ ابھی تو آئے ہیں' تھکے ہوئے ہوں گے۔"

ہم نے کہا "جی نہیں' تھکنے کی کیا بات ہے۔ ہم ہوائی جہاز پر سوار ہو کر آئے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگے' بولے "پھر بھی سفر کی تھکاوٹ تو ہوتی ہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج کے دن آرام کیجئے۔ کل کسی وقت ہماری ملاقات ہونی چاہئے" یہ کہہ کر انہوں نے ہمیں اپنے گھر کا پتا سمجھانا شروع کر دیا۔ ان کا اپارٹمنٹ ہم سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا جسے آپ امریکہ اور کینیڈا میں "واکنگ ڈسٹینس" کہہ سکتے ہیں۔

گویا کوئی فاصلہ ہی نہیں ہے۔ یوسف صاحب کچھ عرصے سے ٹورنٹو (مارکھم) میں اپنی صاحب زادی کے پاس مقیم تھے۔ ان کی بیگم بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ جب سے انہوں نے فلم سازی ترک کی تھی (یا ترک کرنے پر مجبور ہوئے تھے) اس کے بعد وہ باری باری اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے پاس گھوما کرتے تھے اور ہمارے خیال میں بہت پرسکون اور ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ تو ان سے ملنے کے بعد پتا چلا کہ وہ کس قدر روحانی اذیت اور ذہنی کرب میں مبتلا تھے۔ مالی طور پر انہیں کوئی مشکل درپیش نہیں تھی مگر ان کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ انہوں نے ساری زندگی جو کام کیا تھا اب وہ نہیں کر سکتے تھے۔ ایس ایم یوسف کو برصغیر پاک و ہند کی فلمی تاریخ کا ایک اہم کردار قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہماری پیدائش سے بھی پہلے انہوں نے فن کارانہ سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا۔ بمبئی سے کچھ فاصلے پر جنم لیا اور تعلیم حاصل کی مگر پھر اداکاری کے شوق میں بمبئی پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز تھیٹر میں اداکار کے طور پر کیا۔ اس زمانے میں ہیرو کا رول ملا' وہ بہت خوب صورت اور نازک اندام نوجوان تھے۔ سرخ و سفید رنگت' بڑی بڑی آنکھیں' تیکھے نقوش' گھونگھریالے بال۔ اداکاری کا شوق تھا اس لئے پہلے ہی ڈرامے میں ایسی اداکاری کی کہ "ہٹ" ہو گئے۔ کئی سال تک وہ اسٹیج پر کام کرتے رہے۔ پھر فلموں میں پہنچ گئے اور اپنی صلاحیتوں اور خداداد قابلیت کی بنیاد پر ہدایت کار بن گئے۔ غالباً ۲۵ سال کی عمر میں وہ ہدایت کار بن گئے تھے۔ دراصل ان کا اصل شوق

ہدایت کاری ہی تھا مگر منزل تک پہنچنے کے لئے انہوں نے اداکاری کے راستے سفر کیا یہاں تک کہ منزل کو پالیا۔ یوسف صاحب کا شمار بہت جلد ہندوستان کے صف اول کے ہدایت کاروں میں ہونے لگا۔ انہوں نے گھریلو' معاشرتی فلمیں بنانے میں خوب نام پیدا کیا اور بہت سی یادگار فلمیں بنائیں۔ ہندوستان کے چوٹی کے ہدایت کاروں میں محبوب' شانتا رام وغیرہ کے ساتھ ایس ایم یوسف کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔ وہ قیام پاکستان کے کئی سال بعد پاکستان آئے تھے اور لاہور میں ان کی پہلی فلم "سہیلی" تھی۔ اس فلم نے بے انتہا کامیاب حاصل کی اور ان کی دھاک بٹھا دی۔ اس طرح پاکستان کی فلمی دنیا میں بھی ان کے سفر آغاز کامیابیوں کے ساتھ ہوا۔ یوسف صاحب کو میں نے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ و ان تخلیق کاروں میں سے تھے جن کا کھانا پینا' اوڑھنا بچھونا سب کچھ ہی فلم تھا۔ وہ د رات فلم ہی میں کھوئے رہتے تھے۔ انہوں نے پے در پے فلمیں بنائیں۔ کہانیاں لکھوائیں۔ یہاں تک کہ پاکستان کی فلمی صنعت میں نئے رجحانات پرورش پانے لگے ا یوسف صاحب جیسے لوگوں کے لئے فلمیں بنانا مشکل ہو گیا۔ اس طرح وہ پچاس پچپن سال تک مسلسل فلموں سے وابستہ رہنے کے بعد ایک دم فلموں کی دنیا سے الگ ہو گئے۔ ا ان کا کام ملک ملک' شہر شہر گھومنا اور سیرو تفریح کرنا تھا۔ مگر جب میری ان سے ملاقا ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ یوسف صاحب ان تمام سالوں میں ایک دن بھی بے کار نہیں بیٹھ تھے۔ وہ فلمیں دیکھتے رہے تھے' فلموں کے بارے میں پڑھتے رہے تھے' فلمیں بنانے لئے کتابیں اور ناول پڑھ پڑھ کر مواد جمع کرتے رہے تھے۔ شوٹنگ کے لئے مختلف موزو مقامات تلاش کرتے رہے تھے۔ وہ ایک لمحہ بھی خالی اور فلم سے بیگانہ ہو کر نہیں بیٹ تھے۔

"آفاقی صاحب! یہ دیکھئے' میں نے کتنے ویڈیو کیسٹ اور کتنے ناول اکٹھے کر رکھے ہیں۔ آپ کے لئے" انہوں نے بتایا۔

"میرے لئے؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ ہنسنے لگے "اور کہا' میں نے سنا تھا کہ آپ یہاں آ رہے ہیں۔ یہ سب فلمو کہانیوں کا مواد ہے۔ ایک بہت اچھی سی کہانی بنائیں گے اور اس کے بعد فلم"

میں نے ان کے خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا جو دوبارہ فلم بنا

کے تصور ہی سے گلنار ہو رہا تھا۔

"میں نے یہاں بہت سی لوکیشنز دیکھی ہیں۔ آپ کو بھی بتاؤں گا اور وہ پرویز ملک کے کام بھی آئیں گی۔ اب یہ بتائیے کہ آپ ان کے کام سے فارغ ہو کر میرے لئے کب وقت نکال سکیں گے؟"

ہم سوچ میں پڑ گئے' وہ بولے "جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے فراغت حاصل کر لیں۔ پھر ہم ایک بہت اچھی کہانی بنائیں گے۔ ایسی کہ امریکہ اور کینیڈا والے بھی اسے یاد رکھیں گے۔"

ایک عرصے بعد یوسف صاحب کے چہرے پر بچوں جیسی خوشی کے آثار دیکھ کر مجھے بھی بے حد خوشی ہو رہی تھی۔

اگلے دن فلم کی شوٹنگ شروع ہونے والی تھی اس لئے رات ہی سے مناسب انتظامات پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے تو پرویز ملک صاحب نے رات کے کھانے کے بعد سب کو لیکچر دیا کہ رات کو جلدی سو جانے کے کیا فوائد ہیں۔ اس کے بعد مشورہ دیا کہ آج رات سبھی لوگ نو دس بجے رات تک سو جائیں تاکہ صبح کی شوٹنگ کے لئے تازہ دم اور تروتازہ رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ عین فلم بندی کے وقت اداکار اور ہنرمند اونگھتے اور سوتے ہوئے نظر آئیں۔ اگلے روز فلمائے جانے والے مناظر کے مکالمے و ندیم اور شبنم کے حوالے کردیے گئے اور کہا کہ اب آپ لوگ جاکر مکالمے یاد کریں۔ دونوں کافی کے دو دو پیالے پینے کے بعد بڑے صبر و سکون کے ساتھ رخصت ہوگئے پرویز صاحب نے اپنے یونٹ کے ہنرمندوں کو ضروری مشورے اور ہدایات دینی شروع دیں۔ سب سے پہلے تو شاہ جی کو یہ مشورہ دیا کہ وہ آج رات محفل آرائی نہ کریں ا اپنے کمرے میں جاتے ہی لیٹ کر سو جائیں تاکہ صبح سویرے اٹھ کر دن بھر کی شوٹنگ لئے تیار ہو سکیں۔

"سر جی آپ فکر ہی نہ کریں۔" شاہ جی نے انہیں یقین دلایا "صبح آپ کو س سے پہلے میں اور میرے لڑکے ہی "ٹچن ٹاچ" ملیں گے۔" اتنا کہا اور جماہی لے کر کھڑے ہوئے سب کو انہوں نے الوداع کہی اور "سپرد خدا" کر کے چلے گئے۔

"دیکھا آپ لوگوں نے؟" پرویز صاحب نے اپنے اسسٹنٹ حضرات سے کہا " قدر ذمے دار آدمی ہیں شاہ جی۔ اور ایک آپ لوگ ہیں کہ کسی بات کا اثر ہی نہیں لے اب آپ لوگ بھی جائیں صبح جلدی اٹھ کر تیار ہو جائیں۔ کیمرا اور دوسرا سا اپارٹمنٹ بلڈنگ کے نیچے لے جاکر وین میں رکھ دیں۔ ڈریس اور دوسرا سامان بھی

رکھیں اور ہاں میک اپ کا سامان رکھنا نہ بھولنا اچھا خدا حافظ۔"

سب لوگ بڑی سعادت مندی سے "خدا حافظ" کہہ کر چلے گئے تو پرویز صاحب نے ہم سے پوچھا "آپ کا اب کیا پروگرام ہے؟"

ہم نے کہا "ہمیں تو آپ لوگوں کے ساتھ شوٹنگ پر جانا نہیں ہے اس لئے ہم دیر تک جاگنے کے لئے آزاد ہیں۔"

بولے "مگر آپ دیر تک جاگ کر کیا کریں گے؟"

ہم نے کہا "مختلف چینلز سے فلمیں اور پروگرام دیکھیں گے۔"

"ویسے یہ انصاف نہیں ہے اور پھر ابتدائی دنوں کی شوٹنگ میں آپ کا ہمراہ ہونا بہت ضروری ہے بعض اوقات سین تبدیل کرانے کے لئے رائٹر کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

ہم نے کہا "اطمینان رکھئے ہم آپ کو مقررہ وقت پر تیار ملیں گے۔" یہ کہہ کر ہم نے ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور مختلف بٹن دبانے شروع کردیے ہر جگہ کوئی دلچسپ پروگرام جاری تھا۔ جب ہم نے ٹریلر یا جھلکیوں کے طور پر سارے پروگرام باری باری دیکھ لئے تو پھر صوفے پر نیم دراز ہو کر لیٹی کو کافی بنانے کا مشورہ دیا اور گیری کوپر کی ایک پرانی یادگار فلم دیکھنے میں مصروف ہوگئے۔

پرویز صاحب کی بیگم نے سب سے اجازت طلب کی اور بیڈ روم میں چلی گئیں۔ دراصل ہم نے یہ نوٹ کیا تھا کہ جب ریموٹ کنٹرول بھابی کے ہاتھ میں نہ ہو تو ان پر بے زاری سی طاری ہو جاتی تھی اور اس کے بعد ظاہر ہے کہ انہیں نیند آنے لگتی تھی۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ یہ بھی نہیں کہ ان کا کسی خاص پروگرام میں دل لگتا تھا۔ ان کا دل پسند مشغلہ یہ تھا کہ سارے کے سارے بٹن ایک سیکنڈ کے توقف کے بغیر باری باری دباتی رہیں اور اگر کوئی پروگرام پسند آ بھی جائے تو وہ انہیں دوبارہ نہ مل سکے۔

گیری کوپر نے جس وقت اپنے سیاہ رنگ کے خوب صورت گھوڑے کو روک کر ہیروئن سے گفتگو شروع کی تو ماحول بے حد پتھریلا تھا۔ یعنی ہر طرف پہاڑ' خشک ٹیلے اور بے ہنگم سی وادیاں' مگر گیری کوپر کے ہوتے ہوئے باقی کسی چیز کو دیکھنے کا کسی کو کب ہوش تھا۔ ہم اس منظر میں کھو سے گئے۔ ہدایت کار کی ہنرمندی پورے عروج پر تھی اور ایک

سماں سا بندھ گیا تھا۔ یکایک ہمیں اپنے کان کے پیچھے آواز سنائی دی "اف کتنا خوب صورت اور شاندار گھوڑا ہے۔ اس کا رنگ کیسا چمک رہا ہے۔"

دیکھا تو لبنیٰ بیگم کافی کا مگ لئے کھڑی تھیں اگر کافی کی بھاپ اور خوشبو نے مسرور نہ کر دیا ہوتا تو لڑائی جھگڑے کا امکان تھا۔ یعنی سامنے گیری کوپر اور انگرڈ برگمین موجود ہوں اور کوئی گھوڑے کی تعریف شروع کر دے تو ظاہر ہے کہ کسی صاحب ذوق کے دل پر کیا گزرے گی؟

"گھوڑا دیکھا آپ نے بالکل اصلی لگتا ہے؟"

"یہ سبھی چیزیں اصلی ہیں۔ پہاڑ، درخت، پتھر، آدمی تو ظاہر ہے کہ گھوڑا بھی اصلی ہی ہو گا۔"

"میرا مطلب ہے کہ اصیل نسل کا ہے کیا خیال ہے آپ کا کیا یہ عربی نسل کا گھوڑا ہے؟"

اس اثنا میں گیری کوپر صاحب نے زیر لب جو مکالمے ادا کئے وہ ہم نہ سن سکے۔ جواب میں انگرڈ برگمین نے جو سرگوشی فرمائی ہم نے اس پر کان دھر دیئے مگر پھر آواز آئی "اس کی دم کتنی بڑی اور شاندار ہے مجھے تو ریس کا گھوڑا معلوم ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا "بھئی گھوڑے کے بارے میں ڈسکس بعد میں کر لینا پہلے ذرا گیری کوپر اور انگرڈ برگمین کو تو دیکھ لینے دو۔"

جواب میں فرمایا "ان کی فلمیں تو آتی ہی رہتی ہیں، مگر ایسے خوب صورت گھوڑے فلم میں کہاں ہوتے ہیں؟" ملاحظہ فرمایا آپ نے، عورتوں کے بارے میں بزرگ پہلے ہی بہت کچھ فرما گئے ہیں اور جب وہ بیگمات کی شکل میں ڈھل جاتی ہیں تو پھر سونے پر سہاگا سمجھ لیجئے ہم نے تنگ آ کر کہا "اچھا ہم تو ذرا ٹہلنے کے لئے جا رہے ہیں۔" ہمارے حرکت کرتے ہی لبنیٰ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ "چلیں میں بھی چلتی ہوں۔"

پرویز صاحب نے موقع پاتے ہی فوراً ریموٹ کنٹرول کا کنٹرول سنبھال لیا اور لگے جلدی جلدی بٹن دبانے۔ وہ دراصل ایک کامیڈی پروگرام کی تلاش میں تھے۔ ہم نے کہا پرویز صاحب کتنے افسوس کی بات ہے، آپ نے گھوڑے گم کر دیئے۔

بولے "گھوڑے میں آپ کو پھر ڈھونڈوں گا۔ آیئے کامیڈی پروگرام دیکھتے ہیں

کالوں کا۔" یہ بہت مقبول اور دلچسپ پروگرام تھا مگر گیری کوپر اور انگرڈ برگمین کے ساتھ جو توہین آمیز سلوک روا رکھا گیا تھا اس کے بعد ہم سے وہاں نہیں ٹھہرا گیا اور ہم بطور احتجاج ٹہلنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ پرویز صاحب نے صوفے پر نیم دراز ہو کر کشن وغیرہ لگا لئے اور بڑی آسودگی سے ٹی وی دیکھنے لگے۔ ہم نے کہا "پرویز صاحب جلدی سو جایئے صبح شوٹنگ کا پہلا دن ہے۔"

پرویز صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ یعنی جواب دینا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ دراصل کامیڈی پروگراموں میں ہر فقرہ پوری توجہ سے سننا پڑتا ہے ورنہ لطف نہیں آتا۔ نیچے والی منزل پر پہنچ کر ندیم کے اپارٹمنٹ کے سامنے سے گزرے تو سوچا انہیں بھی "وش" کر لیں بیل کے جواب میں چند لمحے بعد دروازہ کھلا۔ ندیم صاحب مکمل لباس میں ہمارے سامنے تھے۔

ہم نے کہا "ارے ابھی سوئے نہیں آپ؟"

بولے "سونے کے لئے تو زندگی پڑی ہے۔ ایک بہت اچھی فلم چل رہی ہے آیئے۔"

ہم نے معذرت طلب کر لی "شکریہ ہم ذرا واک کے لئے جا رہے ہیں۔ باہر بہت اچھا موسم ہے۔"

"شب بخیر" انہوں نے ہمارے رخصت ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا اور دروازہ بند کر لیا۔ واقعی یہ ٹی وی اور فلم کیسے کیسے بلند اخلاق لوگوں کو بد اخلاق بنا دیتے ہیں۔

نیچے کی منزل میں شاہ جی کے اپارٹمنٹ میں خوب رونق لگی ہوئی تھی مگر وہ خود موجود نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ منیجر صاحب انہیں اپنے ہمراہ لے گئے ہیں۔ تاش کی بازی جمے گی۔ یونٹ کے دوسرے ارکان بھی مختلف قسم کی مصروفیات میں پائے گئے۔ جلدی سونے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ اپارٹمنٹ کے سامنے والی فٹ پاتھ پر ہوا انتہائی تازہ اور ٹھنڈی تھی۔ ٹورنٹو (یا مارکھم) میں ہم نے یہ دیکھا کہ دھوپ میں خاصی تمازت ہوتی ہے جو ناگوار گزرتی ہے پیدل چلیں تو پسینہ بھی آ جاتا ہے مگر جہاں ذرا سے سائے میں پہنچے، ہوائیں ٹھنڈی یخ بستہ محسوس ہونے لگیں۔ دن میں خواہ دھوپ تیز رہی ہو لیکن سورج ڈھلتے ہی ہوا میں بے حد خنکی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیں بھی اچھی خاصی سردی

سی لگنے لگی تھی۔

"میں نے کہا تھا کہ کوئی گرم کپڑا پہن لیں، مگر آپ سنتے کہاں ہیں۔" یہ لبنیٰ کی آواز تھی۔ حالانکہ خود وہ بھی سردی سے ٹھٹھری جا رہی تھیں اور کوئی گرم لباس چادر یا سوئٹر وغیرہ ہمراہ نہیں لائی تھیں، مگر دوسروں کی غلطیاں نکالنا خاص طور پر اپنے شوہر کی، فرماں بردار بیویوں کی عادت ہوتی ہے۔ ارادہ تو دور تک جانے کا تھا مگر واقعی سردی خاصی محسوس ہونے لگی تھی اس لئے سیر مختصر کر دی۔ اپارٹمنٹ کے پچھلے حصے کی طرف پہنچے تو دیکھا کہ شبنم، روبن گھوش اور جاوید چودھری صاحب کار میں بیٹھ رہے ہیں۔

ہم نے پوچھا "کہاں کا ارادہ ہے؟"

جواب ملا "سپر مین دیکھنے جا رہے ہیں پاس ہی ایک سینما میں لگی ہے۔"

ہم نے کہا "پاس تو کوئی بھی سینما نہیں ہے۔"

جاوید نے بتایا "یہاں سے پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے آیئے چلیں گے؟"

ہم نے کہا "مگر صبح تو شوٹنگ ہے پہلی پہلی شوٹنگ۔"

شبنم ہنسنے لگیں "آپ کیوں فکر کرتے ہیں آفاقی صاحب۔ شوٹنگ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔"

ہم نے معذرت چاہی اور وہ تینوں "سپر مین" دیکھنے کے لئے رخصت ہو گئے۔

اپنے اپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے ہم سوچ رہے تھے کہ پرویز صاحب کے لیکچر کا ان لوگوں پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا ہے۔ صبح شوٹنگ کا پہلا دن ہے اور ہر کوئی اپنی مصروفیات میں لگا ہوا ہے۔ ہمارے اپارٹمنٹ کی ایک چابی ہمارے پاس تھی۔ تالا کھول کر اندر گئے تو سامنے سٹنگ روم میں پرویز صاحب اسی صوفے میں نظر آئے۔ مگر اس قت وہ نیم دراز نہیں تھے بلکہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور خوب زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ہمیں دیکھا تو کہا "آفاقی صاحب آپ نے بہت دلچسپ پروگرام مس کر دیا ہے آیئے۔"

واقعی پروگرام بے حد دلچسپ تھا اور اس کے بعد شروع ہونے والا پروگرام اس سے بھی زیادہ دلچسپ نکلا۔ ہم لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ جب ہنسنے سے فرصت ملی اور گھڑی کی جانب دیکھا تو ڈھائی بج رہے تھے "اوہ بہت دیر ہو گئی۔ اچھا شب بخیر۔" پرویز صاحب رخصت ہو گئے اب ہم نے ریموٹ کنٹرول سنبھال لیا۔ تھوڑے سے بٹن دبائے

تو ایک جگہ مارلین منرو کی فلم مل گئی "سم لائیک اٹ ہاٹ" کوئی پتھر دل ہی ہو گا جو ایسی اداکارہ کی ایسی فلم کو نہ دیکھے گا۔ اور ہم تو سدا سے بہت نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ جب یہ فلم ختم ہوئی تو سوا چار بجے کا وقت تھا۔

"بھئی اب سونا چاہئے۔" ہم نے کہا "کیا خیال ہے؟"

مگر خیال کون ظاہر کرتا ہماری بیگم پہلے ہی سونے کے لئے جا چکی تھیں

صبح سب سے پہلے ہم ہی بیدار ہوئے۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے جسم کے اندر ایک الارم فٹ ہے۔ اگر صبح سویرے اٹھنا ہو تو یہ ہمارے دماغ کے اندر اتنی زور زور سے بجنے لگتا ہے کہ بیدار ہونا لازمی ہے۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر جب سٹنگ روم میں پہنچے تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد لبنیٰ بھی آ گئیں۔ ہم لوگوں نے ناشتا کیا۔ کافی پی اور پھر ریموٹ کنٹرول لے کر بیٹھ گئے۔ ریموٹ کنٹرول ایک طرح سے "امرت دھارا" کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب وقت گزارنا ہو کسی اور کی محتاجی ہی نہیں ہے بس ریموٹ کنٹرول سنبھالئے اور بٹن دبانے شروع کر دیجئے۔ ہر طرح کی پریشانی دور ہو جائے گی۔ آٹھ بجے کے قریب پرویز صاحب بھی تشریف لے آئے اور ان کے ہمراہ ان کی بیگم بھی تھیں۔ اب ان کا ناشتا شروع ہوا۔ کافی میں ہمیں بھی اخلاقاً شریک ہونا پڑا۔ اتنی دیر میں ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ یونٹ کے لوگ فون کر کے پوچھ رہے تھے کہ کتنی دیر ہے؟ شبنم نیچے لابی سے فون کر رہی تھیں کہ میں بالکل تیار ہوں۔

جاوید چودھری صاحب دریافت کر رہے تھے کہ کون کون سا سامان وین میں رکھوایا جائے واجد صاحب کا فون تھا کہ میں لوکیشن پر پہنچ گیا ہوں۔ آپ لوگ کب پہنچ رہے ہیں۔ جب تمام فون سن لئے تو پرویز صاحب نے ندیم کا فون نمبر ملایا۔ چند لمحے بعد کسی نے دوسری طرف سے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو ندیم! کیا ہو رہا ہے تیار ہو گئے؟"

"ناشتا کر رہا ہوں۔"

پرویز صاحب نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر کہا "بالکل غلط۔ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے۔"

پھر ریسیور میں کہا "کتنی دیر میں نیچے پہنچ رہے ہو؟"

"آدھے گھنٹے میں؟"

"اچھا ذرا جلدی کرو۔"

نیچے پارکنگ لاٹ میں بڑی رونق تھی۔ شاہ جی واقعی "ٹچن ٹاچ" ہو کر تیار کھڑے تھے۔ سفید پتلون اور بش شرٹ میں چمک رہے تھے۔ یونٹ کے دوسرے لوگ بھی سروں پر کپڑوں کی ٹوپیاں لگائے موجود تھے۔ نھا صاحب ان ٹوپیوں کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ فلم والے سر پر کفن باندھ کر تیار ہو گئے ہیں سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ فلم کی ہیروئن شبنم مکمل میک اپ کے ساتھ بال سنوارے تصویر بنی ہوئی ایک کار سے ٹیک لگائے کھڑی ہوئی تھیں۔

"آپ سب لوگ کو ٹائم کا پروا نہیں ہے۔" وہ سب لوگوں سے پہلے تیار ہوئی تھیں حالانکہ ان کا کام سب سے مشکل تھا۔ میک اپ کرنا' بال بنانا' لباس تبدیل کرنا وغیرہ وغیرہ۔ مگر شبنم ایک ایسی ہیروئن ہیں جو تیار ہونے میں ذرا سا بھی وقت نہیں لگاتیں۔ لہری صاحب نے ایک بار یہ دیکھ کر کہا تھا کہ شبنم بھابی تو ہیروئین ہونے کے باوجود ویلن سے بھی پہلے تیار ہو جاتی ہیں خیر شبنم کی تو یہ عادت اور روایت ہے مگر روبن گھوش کو سفید قمیص' سفید پتلون اور سفید جوتوں میں ملبوس پایا تو حیرت سے گنگ رہ گئے۔ یہ وہ شخص ہے جو رات کو چار پانچ بجے جاگتا ہے اور دوپہر کو کم از کم بارہ ایک بجے تک سوتا ہے مگر آج وہ بھی بالکل ترو تازہ اور مکمل تیار نظر آئے۔

"روبن آج اتنی جلدی کیسے اٹھ گئے؟"

"ہم تو سویا ہی نہیں۔ اس لئے اٹھنے میں کوئی پرابلم نہیں ہوا۔"

پونے گھنٹے کے بعد ندیم صاحب برآمد ہوئے۔ حسب معمول مسکراتے ہوئے ہر ایک سے علیک سلیک کی "ارے آپ لوگ دیر کیوں کر رہے ہیں۔ شوٹنگ کو کیوں نہیں چلتے؟"

یہ ندیم کی خاص ادا ہے۔ دیر سے آنے کے باوجود ایسا برتاؤ کرتا ہے کہ کیا مجال جو کوئی ناراض ہونے کی مہلت تو پائے۔

کاروں اور وین میں سوار ہو کر یہ فلمی قافلہ ایک سوپر اسٹور کی جانب روانہ ہو گیا جہاں شوٹنگ ہونے والی تھی۔ ایک وین میں شوٹنگ کے سامان کے علاوہ ہلکی پھلکی

کرسیاں' کھانے پینے کے برتن اور واٹر کولر رکھ دیا تھا۔ اسی وین میں اداکاروں کے ملبوسات بھی تھے۔ پہلے تو سب نے کرسیاں اور واٹر کولر لے جانے کا مذاق اڑایا۔

"بھلا بتایئے ہم شوٹنگ کرنے جا رہے ہیں یا کلاس لگانے؟"

دوسرے صاحب نے کہا "لگتا ہے کہ پرویز صاحب وہاں آؤٹ ڈور میں اپنا دفتر قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"اور واٹر کولر ساتھ لئے پھرنے کی بھلا کیا تک ہے۔ یہ لوگ ریگستان میں تو شوٹنگ کے لئے نہیں جا رہے یہ ٹورنٹو ہے یہاں قدم قدم پر پانی مل جاتا ہے۔"

اس قسم کے تبصرے جاری رہے یہاں تک کہ ہم لوگ سوپر مارکیٹ پہنچ گئے۔

دراصل ہماری شوٹنگ عمارت کے باہر ہوئی تھی۔ یہ ایک بہت لمبی چوڑی مارکیٹ تھی سامنے اس سے بھی زیادہ لمبا چوڑا پارکنگ کا میدان تھا۔ امریکہ اور کینیڈا میں اللہ میاں نے زمین بہت فراوانی اور فراخ دلی سے عنایت کی ہے اس لئے کھلی کھلی سڑکیں' سبزہ زار میدان اور چوڑے چوڑے فٹ پاتھ تو ہیں ہی مگر ان کے ساتھ ہر اپارٹمنٹ بلڈنگ یا سوپر مارکیٹ کے سامنے ایک بہت بڑا میدان پارکنگ کے لئے بھی وقف کر دیا جاتا ہے جہاں کسی کرائے کے بغیر کاریں کھڑی کی جا سکتی ہیں۔ اس پارکنگ کے چاروں طرف باغ اور سبزہ زار تھے۔ ہمیں ان ہی سبزہ زاروں میں شبنم اور ندیم کے چند مناظر فلمانے تھے۔ شاہ جی نے اپنا کیمرہ ایک بڑے سے رنگین چھاتے کے نیچے رکھ دیا تھا اور باقی لوگوں نے دوسرا ضروری سامان آس پاس لگا دیا تھا۔ ان میں پلاسٹک کی ہلکی پھلکی رنگ برنگی کرسیاں بھی تھیں۔ اب جسے دیکھئے وہ کرسی پر بیٹھنے کی حسرت میں گرفتار نظر آ رہا تھا۔ دراصل یہاں بیٹھ کر سامنے کا نظارہ بہت خوب صورت تھا۔ پھر دھوپ بھی چمکنے لگی تھی اور سایہ دار درختوں کے نیچے کرسیاں بے حد سکون اور آرام فراہم کر رہی تھیں۔ پرویز صاحب نے شاٹ کے سلسلے میں نقل و حرکت شروع کر دی۔ ادھر کمپنی کے کینیڈین انجینئر صاحب نے شاہ جی کو جدید ترین کیمرے کو چلانے اور اس کی خصوصی صفات کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ شاہ جی پہلے تو بہت دیر تک اس کی لمبی تقریر سن کر سر ہلاتے اور "او' یس" کہتے رہے آخر صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو انہوں نے واجد صاحب کو پکارا "واجد صاحب پلیز ہیلپ می۔"

واجد صاحب فوراً پہنچے "خیر تو ہے کیا بات ہے؟"

"مجھے اس انگریز سے بچاؤ اس کی تقریر نے میرے سر میں درد کر دیا ہے۔"

"شاہ جی یہ آپ کو نئے کیمرے کے بارے میں بتا رہا ہے۔"

"بھائی اس سے کہو کہ بس کرے کیمرا وہی ہے آپریشن میں معمولی سی تبدیلی ہے وہ میں سمجھ گیا ہوں۔ اتنی دیر تو کمپنی نے یہ کیمرا بنانے میں بھی نہیں لگائی ہوگی جتنی دیر میں یہ مجھے اس کا استعمال سمجھا رہا ہے۔"

واجد صاحب نے کہا "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ آپ اسے بتا دیں کہ میں سمجھ گیا ہوں۔ اب بس کرو۔"

"واجد صاحب یہ انگریز میری انگریزی نہیں سمجھے گا۔ یہاں کے لوگ بہت جاہل ہیں تم اپنی زبان میں سمجھا دو۔"

واجد صاحب نے انجینئر صاحب کو مختصر اور معقول الفاظ میں بتا دیا کہ اب مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا بہت شکریہ۔ وہ مسکرایا اور بولا "خیر کوئی بات نہیں، میں کچھ دیر رک کر کام کی رفتار دیکھوں گا۔ پھر دوبارہ ایک پھیرا لگا لوں گا۔"

پرویز صاحب نے شاٹ اریج کر لیا تھا۔ اب ندیم اور شبنم کی تلاش تھی۔ معلوم ہوا کہ انہیں پیاس لگ رہی تھی اس لئے پانی پینے کے لئے سوپر مارکیٹ میں گئے ہیں۔ اسسٹنٹ حضرات کو ان دونوں بلکہ تینوں (روبن گھوش بھی ہمراہ تھے) کی تلاش میں روانہ کیا گیا۔ مشکل یہ تھی کہ سوپر مارکیٹ میں اندر جانے اور باہر نکلنے کے بہت سے راستے تھے اور پہلی بار تو جو کوئی بھی اندر جاتا تھا وہ راستہ بھول کر کسی اور جانب نکل جاتا تھا۔ کافی دیر گزر گئی مگر تلاش کرنے والے واپس نہ آئے۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد شبنم، ندیم اور روبن آتے ہوئے نظر آگئے۔ ان سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے فلاں فلاں شخص کو دیکھا ہے تو وہ بولے کہ ہم تو بس راستہ تلاش کر رہے تھے۔ اس لئے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ان لوگوں کو ڈھونڈنے کے لئے کچھ اور لوگ بھیجے گئے۔ کچھ دیر بعد پہلی پارٹی تو واپس آگئی مگر بعد میں جانے والے لاپتا ہو گئے۔ ابھی ان کی تلاش کے لئے رضا کار روانہ ہونے ہی والے تھے کہ پرویز صاحب نے انہیں روک دیا "بس کرو یار کیا سارا دن ایک دوسرے کو ڈھونڈنے میں ہی صرف کر دو گے۔ چلو آؤ شوٹنگ کرتے ہیں۔" اس کے ساتھ

ہی انہوں نے یہ پابندی بھی لگا دی کہ اب کوئی پیاس بجھانے کی غرض سے ہرگز سوپر مارکیٹ کا رخ نہ کرے۔

خدا خدا کر کے شاٹ اریج ہوا۔ ریہرسل شروع ہوئی۔ ندیم اور شبنم کے درمیان مکالمے کا آغاز ہوا۔ ندیم صاحب کی یہ عادت ہے کہ وہ ہرجائی قسم کے آدمی ہیں ہر اچھی شکل کی لڑکی سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں اور چھوٹتے ہی اس کی خوب صورتی کی تعریف کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ میرے من مندر میں ایک ایسی ہی مورتی کی ضرورت تھی وغیرہ وغیرہ چنانچہ شبنم کو دیکھ کر بھی وہ یہی مکالمے ادا کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں جو سامان کا تھیلا ہے وہ فوراً خود سنبھال لیتے ہیں اور انہیں اپنی کار میں لفٹ دینے کی پیشکش کرتے ہیں۔ ریہرسل شروع ہوئی تو ندیم تھیلا سنبھال کر ایک کار کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ پرویز صاحب نے اوکے کر دیا۔ اب اصلی شاٹ کی باری آئی۔ جیسے ہی وہ شبنم کے پیچھے پیچھے کار کے نزدیک پہنچے اچانک برابر والی کار سے ایک سردار جی نے گردن باہر نکالی اور چلائے "اوئے ندیم" اس کی آواز کے ساتھ ہی کار کے اندر سے تین اور سردار صاحبان کے سر بھی باہر نمودار ہوئے جن کی مارے خوشی کے باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"اوئے پاپے۔ وہ دیکھ شبنم بھی ہے۔"

چاروں کے چاروں پاپے فوراً کار سے باہر نکل کر ان دونوں کی جانب دوڑ پڑے اور انہیں گھیر لیا۔ "ندیم جی ہم نے آپ کی انڈین فلم دیکھی ہے۔ بہت چنگا کام کیا ہے آپ نے۔" انہوں نے ندیم کے ہاتھ سے تھیلا چھین کر فوراً اپنا ہاتھ مصافحے کی غرض سے ندیم کے ہاتھ میں دے دیا۔ ندیم بے چارہ حیران پریشان کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ آفت ناگہانی کہاں سے آن ٹپکی ہے۔

"شبنم جی، آپ کی فلم ہم نے لندن میں دیکھی تھی۔ بندش، بڑی چنگی تے ستھری فلم ہے۔"

اب انہوں نے شبنم سے گفتگو شروع کر دی۔

"کٹ کٹ کٹ" پرویز صاحب جو دور کیمرے کے پاس کھڑے تھے۔ شاٹ کٹ کرانے کے بعد اپنے ہیرو اور ہیروئین کی مدد کے لئے لپکے۔ بھلا شاہ جی کیسے پیچھے رہ جاتے۔ وہ ان سے بھی پہلے موقع واردات پر پہنچ گئے اور چند لمحے کے اندر ہی سب

سرداروں سے انتہائی بے تکلف بھی ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک قسم کا گیٹ ٹوگیدر شروع ہو گیا۔ سردار حضرات سب کو کھانے کی دعوت دینے پر مصر تھے۔ ان میں سے ایک صاحب ٹورنٹو کے رہنے والے تھے۔ باقی تین ان کے دوست تھے جو لندن سے یہاں آئے تھے۔ لندن والے بھلا کیوں پیچھے رہتے۔ انہوں نے لندن آکر مہمان بننے کی دعوت دے ڈالی۔ کچھ دیر کے لئے تو یوں لگا جیسے بلوہ ہو رہا ہے۔ ہر شخص اونچی اونچی آواز میں بول رہا تھا ہنس رہا تھا' شور مچا رہا تھا' ایکدوسرے کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر راہ چلتے لوگ بھی رک گئے۔ ایک پولیس والا بھی اپنی رنگین روشنیوں والی موٹر سائیکل پر سوار آگیا اور ایک جانب موٹر سائیکل کھڑی کر کے ان لوگوں کی جانب لپکا۔

"کیا بات ہے کیا ہو رہا ہے؟" اس نے رعب سے پوچھا۔

"کچھ نہیں آفیسر فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔" واجد صاحب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اسے یقین نہ آیا تو کچھ فاصلے پر چھاتے کے نیچے رکھا ہوا کیمرا اور دوسری جانب شوٹنگ کا دوسرا سامان بھی اسے دکھایا۔ وہ کچھ بے یقینی کے عالم میں تھا۔ اتنی دیر میں پرویز صاحب نے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کی پہلے تو انہوں نے اپنے یونٹ کے لوگوں کو یاد دلایا کہ وہ یہاں گھر سے ہزاروں میل دور صرف شوٹنگ کرنے کے لئے یہاں آئے ہیں پھر انہوں نے سردار جی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم لوگ یہاں شوٹنگ کی غرض سے آئے ہیں۔ اس وقت مہمان داری سے معاف ہی رکھیں۔ چند منٹ بعد حالات معمول پر آگئے۔ سرداروں نے معذرت طلب کی مگر کہا کہ وہ بھی کچھ دیر شوٹنگ دیکھیں گے۔ خدا خدا کر کے شوٹنگ شروع ہوئی۔ ندیم اور شبنم دونوں بہت اچھے اداکار ہیں مکالمے یا ایکشن بھولنا تو جیسے انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔ تھوڑی دیر کے اندر کئی شاٹ اوکے ہو گئے تو پرویز صاحب کی جان میں جان آئی۔ پولیس والا اپنی موٹر سائیکل سائے میں کھڑی کر کے ادھر ادھر گھومنے چلا گیا تھا۔ وہ دوبارہ گشت لگاتا ہوا آگیا۔ اب اسے بھی یقین آگیا تھا کہ واقعی یہ کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ جاوید چودھری صاحب نے جلدی جلدی اسے فلم کی کہانی کا خلاصہ بھی سنا دیا اور یہ بھی بتایا کہ یہ پاکستان اور کینیڈا کی کو پروڈکشن ہے جس کی وجہ سے پولیس والے کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا۔

"بہت خوب' بہت دلچسپ۔ یہ فلم کون سی زبان میں بنے گی؟"

"اردو"

"اور...... دودو!" وہ بہت حیران ہو کر بولا "یہ کس ملک کی زبان ہے؟"

جاوید صاحب نے اس بار اسے اردو زبان کی تاریخ کے بارے میں ایک لیکچر پلا دیا یہاں تک کہ وہ غریب بے زار ہو کر جماہیاں لینے لگا۔

"ٹھیک ہے یہ آپ کی قومی زبان ہے مانتا ہوں آپ کی شوٹنگ بھی بہت اچھی ہے۔ خاص طور پر اداکاروں کا گیٹ اپ بہت خوب ہے۔"

"گیٹ اپ!" جاوید چودھری نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ گیٹ اپ تو کسی اداکار نے کیا ہی نہیں تھا۔ ندیم اور شبنم دونوں اصلی روپ میں تھے۔ ندیم کا لباس پتلون قمیص اور شبنم کا شلوار قمیص تھا۔ پھر گیٹ اپ کا کیا سوال ہے؟

پولیس والے نے سردار جی حضرات کی طرف اشارہ کر کے کہا ان لوگوں کا گیٹ اپ بہت اچھا ہے۔ آپ کا میک اپ مین کون ہے اور یہ وگز آپ نے یہاں سے خریدی ہے یا اپنے ملک سے لائے ہیں؟

اسے بتایا گیا کہ یہ سردار جی ہیں اور یہ ان کا گیٹ اپ نہیں اصلی روپ ہے۔

"تمہارا مطلب ہے یہ بال اور داڑھی مونچھیں اصلی ہیں؟"

"بالکل۔"

"خدایا اور یہ لوگ ہر وقت انہیں لگائے رہتے ہیں؟"

"ظاہر ہے تم تو یوں حیران ہو رہے ہو جیسے تم نے پہلے کوئی سکھ نہیں دیکھا۔"

"اچھا تو یہ سکھ ہیں وہ تو میں نے کئی دیکھے ہیں مگر ان کے سر کے بال اور داڑھی مونچھیں ایسی نہیں ہوتیں۔"

دراصل اس نے کینیڈا کے سکھ دیکھے تھے جو عموماً بہت ہلکی پھلکی اور مہین سی داڑھی اور مختصر سے بال رکھتے ہیں یا پھر شاید اس غریب نے کبھی چار سکھ یکجا نہیں دیکھے ہوں گے۔

چاروں سکھ بے حد بے تکلف ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی وہ دن کے گیارہ بارہ بجے ہی بقول شاہ جی "ارتھ" ہو گئے تھے۔ یہ لفظ بھی شاہ جی کی خاص اصطلاح ہے۔ اگر کوئی شراب کے نشے میں بہک جائے تو شاہ جی کے الفاظ میں وہ

"ارتھ" ہو جاتا ہے۔ ان چاروں کا اصرار تھا کہ رات کو ہم سب ان کے مہمان جائیں۔ وہ بار بار ہمارا پتا پوچھ رہے تھے۔ واجد صاحب نے بڑی صفائی سے انہیں ڈا ٹاؤن ٹورنٹو کے ایک ہوٹل کا نام اور پتا بتا دیا اور فون نمبر بھی لکھ کر دے دیا۔ وہ بڑی گ جوشی اور خلوص کے ساتھ رخصت ہوئے اور بار بار یاد دہانی کراتے رہے کہ رات کو سب پینے کے لئے آئیں گے اور ایک بس ہمراہ لائیں گے کیونکہ سواریاں کافی زیادہ ہی بڑی مشکل سے وہ رخصت ہوئے اور اپنی کار کی جانب بڑھے۔

"اب کیا ہو گا وہ بے چارے تو رات کو اسی ہوٹل پر بس لے کر پہنچ جائیں گے" کسی نے کہا۔

"فکر نہ کرو رات تک وہ سپرد خدا ہو چکے ہوں گے۔ انہیں خود اپنا بھی ہوش نہ رہے گا۔"

"میرا خیال ہے انہیں روکنے کی ایک اور بھی ترکیب ہو سکتی ہے۔" جاوید صا نے مشورہ دیا۔

"وہ کیا؟"

"پولیس والے کو بتا دیتے ہیں کہ یہ نشے میں ہیں' وہ ان چاروں کو گرفتار کر۔ یہاں شراب پی کر کار چلانا کافی سنگین جرم ہے۔"

"رہنے دیں کچھ تو خوف خدا کریں وہ بے چارے محبت اور خلوص میں دعوت رہے ہیں اور آپ لوگ انہیں گرفتار کرانے کی فکر میں ہیں۔"

"وہ بے چارے محبت اور خلوص میں نہیں شراب کے نشے میں دعوت دے ہیں۔"

پرویز صاحب نے سب کو یاد دلایا کہ ابھی ہمیں کچھ دور ایک پارک میں بھی شو کرنی ہے اس لئے اس موضوع کو ختم کر دیا جائے۔

خدا خدا کر کے سردار جی رخصت ہوئے۔ پرویز صاحب نے بقایا سین فلمانے کی ریاں شروع کر دیں۔ دوپہر کو دو بجے کے قریب سب کو بھوک نے بری طرح ستانا روع کر دیا۔ یا تو سب لوگ کام کر کر کے تھک گئے تھے یا پھر کینیڈا کا پانی ہی بہت ہاضم ا۔ کھانے کے لئے سب لوگوں نے سوپر مارکیٹ میں واقع میکڈانلڈ کا رخ کیا۔ میکڈانلڈ ب ایسی جگہ ہے جہاں جا کر ہر عمر کا آدمی خوش اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ نہایت صاف را ماحول' سیلف سروس مگر کچن کے اندر کام کرنے والی تمام تر نوخیز اور خوب صورت یفارم میں ملبوس لڑکیاں۔ اس کے علاوہ مختصر وقت میں جلدی جلدی کھانے والا کھانا اور قسم کے کولڈ ڈرنکس اور چائے کافی۔ میکڈانلڈ دراصل فاسٹ فوڈ کی بہترین شکل ہے۔ انا بھی یہاں بے حد سستا ہوتا ہے۔ پاکستان میں جب "فاسٹ فوڈ" کا رواج ہوا اور ف قسم کے ریستوران بننے شروع ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ جس مقصد کے لئے یورپ ر امریکہ میں فاسٹ فوڈ مشہور اور مقبول ہے پاکستان میں اس کا نام و نشان تک نہیں ۔ باہر کے فاسٹ فوڈ ریستوران میں آپ جائیں تو آپ کے آرڈر کے مطابق ہر چیز م زدن میں تیار کر کے آپ کے حوالے کر دی جاتی ہے اور خصوصیت یہ ہے کہ ہر چیز ، حد سستی لیکن ہمارے پاکستان میں فاسٹ فوڈ ریستوران میں آ کر آرڈر دینے کے بعد ے لمبا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک قیمت کا تعلق ہے یہ فاسٹ فوڈ بڑے اور مشہور ستورانوں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوتا۔ خیر اپنا کیا ذکر کریں ہمارا تو باوا آدم ہی نرالا ے۔ میکڈانلڈ میں جا کر برگر ہر کوئی کھاتا ہے اور یہ بے حد لذیذ ہوتا ہے اور سستا بھی۔ ری پسندیدہ چیز برگر اور ملک شیک ہے۔ یہی ملک شیک اگر آپ کسی ریستوران سے یدیں تو دو تین گنی قیمتی ادا کرنی پڑے گی۔ سب لوگ میکڈانلڈ میں پہنچ گئے اور جب

ایک گھنٹے تک واپس نہیں آئے تو پرویز صاحب نے بلانے کے لئے اسسٹنٹ بھیجنے شروع کردیئے۔ کھانے پینے کا سلسلہ تو بہت دیر پہلے ختم ہوگیا تھا مگر گپ شپ کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میکڈانلڈ اور اس قسم کے دوسرے ریستورانوں میں کام کرنے والے نوخیز لڑکے اور لڑکیاں عموماً اسکولوں کے طلباء اور طالبات ہوتی ہیں۔ یہاں کام کرکے وہ معقول پیسے کما لیتے ہیں اور ریستوران والوں کو سستے داموں اچھے پھرتیلے اور مستعد کارکن مل جاتے ہیں۔

باغ میں شوٹنگ کا تمام انتظام مکمل تھا۔ باغ کو دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ یورپ امریکہ میں باغوں کو واقعی باغ و بہار بنا کر رکھتے ہیں۔ درخت، پودے، سبزہ، پھول پھلواری تو خیر ہر ایک باغ میں ہوتی ہے مگر یہ لوگ اس میں بھی سجاوٹ کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ درخت ہیں تو سلیقے اور خوب صورتی سے لگے ہوئے، روشیں ہیں تو یوں ترشی ہوئی جیسے ابھی مشین میں ڈال کر نکالی ہیں۔ سبزہ زار ایسے خوش رنگ کہ دیکھ کر جی خوش ہو جائے۔ پھول بے شمار اور انتہائی سلیقے دار ترتیب کے ساتھ لگائے ہوئے۔ آنکھوں کے لئے تو یہ باغات جنت کا نمونہ پیش کرتے ہیں مگر وہ جو ہمارے دیسی پھولوں میں بھینی بھینی خوشبو ہوتی ہے اس سے یکسر محروم ہیں۔ یوروپی پھولوں میں خوشبو کیوں نہیں ہوتی؟ آج تک یہ معمہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ یہاں تک کہ گلاب جو اپنی مہک اور مشام جاں خوشبو کے لئے پھولوں کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ وہاں ویسے تو ہر رنگ روپ میں مل جاتا ہے مگر کیا مجال جو خوشبو بھی آئے۔ پتا نہیں ان پھولوں کی خصائص اور اوصاف بھی ہمارے پھولوں جیسے ہوتے ہیں یا مختلف ہیں۔ مثلاً گلاب اور دوسرے بہت سے پھول ہمارے ہاں دوائیوں میں کام آتے ہیں۔ اب اگر یورپ میں بیٹھ کر کسی حکیم صاحب کو گل قند بنانے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ کیا کرتے ہیں؟ یہ کبھی کسی حکیم صاحب سے پوچھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مغربی ملکوں کے باغوں کی خوب صورتی اور تزئین میں ایک انتظامیہ کے سلیقے اور کوششوں کا دخل ہوتا ہے ہر موسم کے لحاظ سے باغوں اور پھولوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ اگر سردی میں برف پڑ رہی ہے تب بھی باغوں میں گھومنے والے بھی نظر آتے ہیں اور ان کی دیکھ بھال کرنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ دوسری بات سیر کرنے والوں کا ذوق اور شعور سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ وہ لوگ زندگی کے ہر شعبے

مانند باغوں میں گھومنے پھرنے کا بھی سلیقہ رکھتے ہیں اور اس قدر احتیاط برتتے ہیں جیسے غ میں نہیں شیشے کے مکان میں گھوم رہے ہوں۔ بڑے تو بڑے بچے بھی تہذیب اور لیقے کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں جو بد تہذیبی، بد اخلاقی ربے ہودگی لوگوں کے مزاج اور برتاؤ میں در آئی ہے وہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ ں معاملے میں وہ ہم سے اتنے ہی آگے ہیں جتنا خرگوش کچھوے سے آگے تھا۔ اب یں انتظار یہ کرنا ہوگا کہ یہ خرگوش کب خود اعتمادی میں مبتلا ہو کر خواب خرگوش میں وف ہوتا ہے کہ ہمارا کچھوا ان سے آگے نکل جائے۔ ویسے ایمان کی پوچھئے تو ہمارا ان ے آگے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ آگے تو اس وقت نکلیں جب ہم بھی دوڑ میں ں تو کم از کم چلنے میں تو شریک ہوں مگر ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ ہم نے تو ابھی پاؤں پاؤں نا بھی شروع نہیں کیا اور یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا۔

خیر یہ تو بہت دل دکھانے والی باتیں ہیں جس کا کوئی فائدہ ہے نہ اثر۔ اس لئے یے ذرا اپنے موضوع کی طرف واپس آتے ہیں۔ باغ میں پرویز صاحب کو ایک گانے کا ر حصہ اور ایک چھوٹا سا سین فلمانا تھا۔ یہ باغ کافی دور تک پھیلا ہوا تھا اور کئی ہ تھا یعنی پہلے گراؤنڈ فلور، سبزہ زار، پھولوں کے تختے اور بچوں کے کھیلنے کا سامان۔ اسی ایک گوشے میں نہایت خوب صورت ریستوران اور اسنیک بار بھی تھا۔ مغربی ممالک ا یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہر تفریحی مقام پر اس قسم کا انتظام ضرور ہوتا ہے۔ جہاں تے سستے داموں چائے، کافی، کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس مل جاتے ہیں۔ بیئر وغیرہ بھی ا کولڈ ڈرنکس میں شامل ہیں اس لئے وہ بھی ٹین کے ڈبوں میں دستیاب ہو جاتے ۔ پھر قدرے اونچائی پر باغ کی ایک عدد طول طویل منزل تھی جو بہت دور تک پھیلی ا تھی۔ آٹھ دس فٹ کی بلندی پر تیسری منزل تھی اور پھر اس طرح چوتھی منزل بھی ۔ ان سب کی لمبائی چوڑائی ایک جیسی سمجھ لیجئے۔ جگہ جگہ ڈھلانیں تھیں، بعض جگہ لیاں بھی بنی ہوئی تھیں منزلوں سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے کہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ ل یہ باغ نشیب و فراز میں تھا اور اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے واقعی کئی ل میں ہے۔ نہایت خوش منظر اور دلفریب تھا۔ منزلوں کی جانب ہماری توجہ شاہ جی منعطف کرائی تھی کہنے لگے ان انگریزوں نے باغ کی منزلیں بہت اچھی بنائی ہیں۔

سیڑھیاں بھی ہیں مگر ایک چیز کی کمی ہے۔"

پوچھا "وہ کیا؟"

کہنے لگے "لفٹ نہیں ہے۔ بعض اوقات بندے کا پیدل چڑھنے کو جی نہیں کر ہے کیا حرج تھا اگر یہاں لفٹیں بھی لگا دیتے۔" پھر انہوں نے سردار جی والا وہ پرانا لطی بھی سنا دیا کہ سردار جی نے ایک بہت شاندار محل بنوایا۔ اس میں تین سوئمنگ پول ۔ مہمانوں کو گھر دکھانے لگے تو بولے "یہ سوئمنگ پول گرم پانی کا ہے جس کا گرم پانی م نہانے اور تیرنے کو جی چاہے وہ یہاں نہائے دوسرا سوئمنگ پول ٹھنڈے پانی کا ہے جس کا جی چاہے ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں لگائے۔"

"مگر تیسرا سوئمنگ پول بالکل خالی پڑا ہے۔ یہ کس لئے ہے؟"

سردار جی بولے "دیکھو نا جی بندے کا کبھی نہانے یا تیرنے کو جی نہیں بھی کرتا۔ یہ ان کے لئے ہے۔" شاہ جی کی ایک اچھی عادت یہ ہے کہ جیسے بعض لوگ اپنی بات میں شعر شامل کر لیتے ہیں۔ شاہ جی ہر بات کے ساتھ ایک حسب حال لطیفہ بھی سناتے ہ حسب حال نہ بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ ننھا کا کہنا یہ تھا کہ جس طرح بعض سا مند عورتیں بچا ہوا کھانا جمع کرتی رہتی ہیں اور ضرورت پڑنے پر وہی باسی کھانا گھی کا لگا کر گرم کر کے دوبارہ پیش کر دیتی ہیں یہی سلوک شاہ جی لطیفوں کے ساتھ کرتے ہیں بقول ان کے شاہ جی کے "نعمت خانے" میں باپ دادا کے وقتوں کے لطیفوں بھی پڑ ہوئے ہیں۔ انہیں بھی وہ ضرور کسی دن تازہ کر کے سنائیں گے اس لئے اپنی اپنی منائیں۔ شبنم نے اس اثنا میں دوسرا لباس پہن لیا تھا۔ ندیم صاحب کو تو یہ آسانی ہے نہ میک اپ کا جھگڑا' نہ بال بنانے کا مسئلہ اور نہ ہی لباس تبدیل کرنے کا جھنجھٹ قمیص بدل لی تو لباس بدل گیا۔ زیادہ تبدیلی کرنی ہوتی تو پتلون بھی تبدیل کر لی۔ بالوں انگلیاں پھیریں یا کنگھا گھمایا اور لیجئے شوٹنگ کے لئے تیار ندیم ہیروئنوں سے اکثر ا ہمدردی کرتے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے تو ان بے چاریوں پر ترس آتا ہے۔ گھ بال الجھاتی ہیں پھر سلجھاتی ہیں پھر بناتی سنوارتی ہیں۔ اس کے بعد میک اپ میں گھ لگاتی ہیں۔ لباس کی تبدیلی میں بھی کچھ کم وقت نہیں لگتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپ درست کرتی رہتی ہیں کام تو یہ آٹھ گھنٹے کی شفٹ میں صرف دو ڈھائی گھنٹے ہی

ہیں۔ اس میں بھی ایک گھنٹہ کھانے اور چائے میں ضائع کر دیتی ہیں۔ یہ بھی کیا زندگی ہے پھر وہ شبنم سے کہتے "بات سنیں اگلی بار اگر فرشتے رائے لینے کے لئے آئیں تو ہرگز عورت نہ بننا۔ مرد بننے کے حق میں مطالبہ کر دینا ورنہ پھر ساری زندگی اسی طرح میک اپ' ہیئر ڈریسنگ اور کپڑے بدلنے میں ضائع ہو جائے گی۔"

جس شوٹنگ میں شبنم اور ندیم یکجا ہوتے ہیں وہاں خاصی دلچسپی رہتی ہے ان دونوں میں چھیڑ چھاڑ اور فقرے بازی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک "بیگ پارٹی" بن جاتی ہے۔ یعنی ندیم کی پارٹی' دوسری شبنم پارٹی ہوتی ہے۔ شبنم پارٹی ہیروئین کی تعریف میں مصروف رہتی ہے "واہ شبنم بھابی۔ کیا غضب کا شاٹ دیا ہے آپ نے بلکہ بیگ صاحب کی اداکاری کو بھی سنبھال لیا۔"

ادھر بیگ پارٹی کہتی ہے "بیگ صاحب نے اتنے زبردست ایکسپریشن دیے کہ ان کے بہت سے ایکسپریشن ہیروئن کے چہرے پر بھی چلے گئے۔"

بیگ صاحب انکسار سے کہتے ہیں "کیا حرج ہے اگر ہمارے اوور فلو کا دوسروں کو فائدہ ہو جائے۔"

باغ میں چند شاٹ لینے کے بعد چائے کافی کی ضرورت پیش آئی تو سب باغ کے گراؤنڈ فلور پر واقع ریستوران میں چلے گئے۔ ایک تو ماحول پر فضا اس پر ریستوران اتنا صاف ستھرا اور خوب صورت کہ طبیعت خوش ہو گئی۔ پرویز صاحب کو یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ یہاں ایک چھوٹا سا سین بھی فلمانے کا ارادہ کر لیا۔ ویٹرلیس ایک درمیانی عمر کی نہایت شگفتہ جمال خاتون تھیں۔ قدرتی شربتی رنگ کے بال' شربتی آنکھیں شہد اور دودھ کی ملاوٹ سے بنی ہوئی رنگت' چہرہ مہرہ بے حد مناسب اور جسم اس سے بھی زیادہ متناسب' سب لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر رشک کر رہے تھے کہ ۳۰' ۳۵ سال کی عمر میں بھی یہ عورت کس قدر اسمارٹ اور خوب صورت ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی عمر ۴۸ سال تھی۔ بے حد ہنس مکھ اور بااخلاق خاتون تھیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ فلم کی شوٹنگ کر رہے ہیں تو اور زیادہ توجہ دینے لگیں۔ انہوں نے بھی حقیقی زندگی میں کوئی ہیرو یا ہیروئن نہیں دیکھی تھی اس لئے ندیم اور شبنم سے بہت شوق سے ملاقات کی اور ان دونوں کے آٹوگراف بھی لئے۔ فلم کے بارے میں بھی پوچھتی رہیں۔ واجد صاحب نے

انہیں بتایا کہ یہ فلم کسی تھیم پر بنائی جا رہی ہے تو وہ کچھ سوچ میں پڑ گئیں۔ واجد صاحب نے پوچھا "کیا بات ہے آپ چپ کیوں ہو گئیں؟"

بولیں یہ سوچ کر اداس ہو گئیں کہ اگر سب لوگ اپنے اپنے وطن واپس چلے گئے تو میرا بوائے فرینڈ بھی واپس انڈیا چلا جائے گا۔

جاوید چودھری نے کہا "تو پھر کیا ہوا تم کوئی لوکل بوائے فرینڈ ڈھونڈ لینا۔"

کہنے لگیں "ان کے پہلے ہی بہت نخرے ہیں۔ اس کے بعد تو دماغ اور زیادہ خراب ہو جائیں گے۔"

ہم نے کہا "اگر آپ چائے کافی اور اسنیکس کا بل وصول نہ کریں تو ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔"

پوچھنے لگیں "وہ کس طرح؟"

"ہم ایک کردار کی زبانی یہ مکالمہ کہلوا دیں گے کہ جن لوگوں کی یہاں وابستگی ہو گئی ہے وہ واپس نہ جائیں یا اپنے دوستوں کو اپنے ہمراہ لے جائیں۔"

بولیں "دیکھئے دوستی اپنی جگہ مگر میں اپنا وطن چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی اور انڈیا تو ویسے بھی بہت پسماندہ اور غریب ملک ہے۔"

ہم ان کے "انداز محبت" پر حیران رہ گئے۔ سنتے آئے ہیں کہ پیار اندھا ہوتا ہے مگر مغرب والوں کا پیار تو دور بین اور خورد بین استعمال کرتا ہے اور خوب سوچ سمجھ کر حساب کتاب کرنے کے بعد دل کے معاملات طے کرتا ہے۔

فلم کا جو منظر ریستوران میں فلمایا جانا تھا اس کی تو مس مارنیا نے بہت خوشی سے اجازت دے دی مگر جب ان سے کہا گیا کہ وہ ایک بار میز کے پاس آ کر کافی کی پیالیاں رکھ دیں اور دوسری بار کیمرے کے سامنے سے خاموشی سے گزر جائیں تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگی "جب تک کوئی باقاعدہ اگریمنٹ سائن نہ ہو میں کام کیسے کر سکتی ہوں۔"

ہم سب ان کی کاروباری سوجھ بوجھ پر اش اش کرنے لگے۔

باغ میں ایک ایشیائی جوڑا بھی موجود تھا۔ لڑکا پاکستانی تھا اور لڑکی غالباً ایرانی تھی وہ دونوں بہت دیر سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے۔ واجد صاحب

نے ندیم اور شبنم سے کہا "دیکھئے پیار ایسے کرتے ہیں اور ایک آپ دونوں ہیں کہ اتنے دور سے اتنے بہت سے پیسے لے کر یہاں پیار کرنے آئے ہیں مگر پھر بھی الگ الگ گھوم رہے ہیں۔"

لڑکے نے ہم لوگوں کو دیکھا تو پاس آ گیا پہلے تو انگریزی میں مخاطب کیا اور پھر اردو شروع کر دی۔ یہ صاحب زادے انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے آئے ہوئے تھے۔ کراچی کے رہنے والے تھے۔ شاعری اور افسانہ نگاری کا بہت شوق تھا۔ ہمارے بارے میں پتا چلا کہ ہم مصنف ہیں تو گرل فرینڈ کا ہاتھ تھام کر ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے ہم سمجھے شاید ہمیں نجومی سمجھ کر ہاتھ دکھائیں گے مگر انہوں نے ایک اور ہی قصہ چھیڑ دیا کہنے لگے "آپ میری شاعری ٹھیک کر دیں گے۔"

جی میں تو آئی کہ کہیں کہ شاعری کیا، ہم تو تمہیں بھی ٹھیک کر دیں گے مگر پھر لڑکی کا لحاظ کر کے خاموش ہو گئے اور سر ہلا کر ہاں کہہ دی۔ انہوں نے فوراً اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ بک نکالی اور ہمارے حوالے کر دی۔ دیکھا تو اس میں اوٹ پٹانگ شعر لکھے ہوئے تھے۔ زیادہ تر تو آزاد شاعری تھی۔ جو پابند شاعری تھی وہ بھی ضرورت سے زیادہ آزاد نظر آئی یعنی قافیہ، ردیف، عروض، وزن، بحر ہر ایک چیز سے مطلق آزاد۔ مثلاً ان کا ایک شعر ہمیں آج بھی یاد ہے ملاحظہ فرمائیے۔

ہوا جو چلی
تو اس کی زلف کی مہکتی ہوئی کھل گئی کلی
مگر وہ تو بے جان تھی
اس لئے میں تو چپکے سے وہاں سے چلا آیا بادلوں کی طرف

اب بتائیے اس شاعری کو کوئی کہاں لے جائے۔ ان کا نام قدوس تھا اور ان کی گرل فرینڈ کو وہ شاہانی کہہ کر بلاتے تھے۔ جب ہم نے ذرا گھور کر دیکھا تو کہنے لگے "فکر نہ کریں یہ لڑکی بھی مسلمان ہے۔"

واجد صاحب کا مشورہ تھا کہ شوٹنگ کے وقت اگر میز پر کافی کی پیالی رکھنے کا کام ان کی گرل فرینڈ کو سونپ دیا جائے تو پرویز صاحب کا مقصد پورا ہو جائے گا شاہانی کو پس و پیش تھا آخر محبت کی جیت ہوئی اور وہ اس سین میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئیں۔ شاہ جی

نے کیمرا سیٹ کیا اور سب تیاریاں مکمل ہونے کے بعد ندیم اور شبنم کو میز پر بٹھا کر سین کی فلم بندی سے پہلے ایک ریہرسل کے لئے کہا۔ شبنم اور ندیم نے باتیں شروع کر دیں تو پرویز صاحب نے مس شاہانی کو کافی کی پیالیاں ٹرے میں رکھ کر آگے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اتنی بوکھلائیں کہ ان کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کے باعث پہلے تو پیالیاں بجنے لگیں اور پھر جب وہ میز کے نزدیک پہنچیں تو ٹرے ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی اور دو پیالیاں شہید ہو گئیں۔ ریہرسل روک دی گئی اور ان سے دریافت کیا گیا کہ آخر کیا مسئلہ درپیش ہے۔ وہ بولیں "میں اپ سیٹ ہو گئی تھی۔"

"تو پھر اب دوبارہ سیٹ ہو گئی ہو کہ نہیں؟"

انہوں نے قدوس کی طرف دیکھا وہ بولے "فکر نہ کریں اب وہ بالکل تیار ہے۔"

مگر دوسری بار پھر ان کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو گیا اور اس بار پھر دو پیالیاں ٹوٹ گئیں تو مس مارنیا فکر مند ہو گئیں۔ کہنے لگیں "اگر آپ لوگوں نے تمام پیالیاں ریہرسل میں ہی توڑ دیں تو پھر اصلی شوٹنگ کے لئے کیا باقی رہے گا؟؟"

اگلی بار پرویز صاحب نے کہا کہ ڈائریکٹ ٹیک کرتے ہیں ریہرسل کی کیا ضرورت ہے۔ دراصل وہ نفسیاتی طور پر مس شاہانی کے اندر اعتماد پیدا کرنا چاہتے تھے' مگر اس تجربے کا الٹا اثر ہوا۔ مس شاہانی نے اس بار مزید دو پیالیاں توڑ دیں۔ پرویز صاحب پریشان ہو گئے۔ آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ماحول واحول پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چھوٹا سا سین ہے چند لمحوں میں گزر جائے گا۔ اس لئے ویٹریس کے بغیر ہی فلما لیا جائے مگر قدوس نے اس کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ شاہانی آپ کو صحیح ایکٹنگ کر کے دکھائے گی۔ آپ اسے موقع تو دیجئے مگر شاہانی بار بار سر ہلا کر کہہ رہی تھی کہ میں کیمرے کے سامنے نہیں آؤں گی۔ پرویز صاحب نے قدوس صاحب کو سمجھایا کہ بھائی کیوں ہمارا نقصان کرتے ہو۔ ہمیں اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں اور پھر ریستوران میں پیالیاں بھی ختم ہونے والی ہیں۔ قدوس صاحب نے شاہانی سے باقاعدہ جھگڑنا شروع کر دیا کہ تم نے سب کے سامنے میری ناک کٹوا دی۔ یہاں تک کہ وہ بے چاری سچ مچ رونے لگی اور اٹھ کر چلی گئی۔ قدوس صاحب بھی اس کے پیچھے پیچھے رخصت ہو گئے۔ ہم لوگ بہت دیر تک اس بارے میں باتیں کرتے رہے کہ قدوس صاحب کا یہ

رویہ کتنا غلط تھا۔

شبنم بولیں "دیکھ لیجئے سارا مرد لوگ ایک دم غلط ہوتا ہے۔"

ندیم بولے "اپنا اپنا تجربہ ہے۔"

اس سے پہلے کہ اس موضوع پر مزید بحث ہوتی پرویز صاحب نے بوریا بستر باندھ کر اگلی لوکیشن پر چلنے کا اعلان کر دیا اور مس مارنیا سے رخصت ہو کر ہم اگلی منزل کی جانب چل پڑے۔ ٹورنٹو میں یہ گرمیوں کا موسم تھا۔ دھوپ میں چلنے پھرنے سے پسینہ بھی آتا تھا بلکہ ہوا میں اچھی خاصی خنکی بھی تھی۔ ہم لوگ پاکستان میں جس قیامت کی گرمی میں کام کرنے کے عادی ہیں اس کے مقابلے میں یہ خوش گوار موسم تھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ بادل چھا گئے۔ ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں' ایک دو بار تو بارش بھی ہو گئی اور موسم اور زیادہ خوش گوار ہو گیا۔ پرویز صاحب مطمئن تھے کہ ان کی فلم بندی پروگرام کے مطابق جاری تھی۔

شام کو روشنی کم ہوئی تو ہم لوگوں نے گھر کی راہ لی جہاں خواتین ریموٹ کنٹرول سے کھیلنے میں مصروف تھیں بلکہ اچھا خاصا میچ ہو رہا تھا۔ ایک بار پرویز صاحب کی بیگم ریموٹ کنٹرول سنبھالتیں اور باری باری تمام بٹن دبا کر مایوسی سے لبنیٰ سے مخاطب ہوتیں۔ "لبنیٰ بھابی ایک بھی کام کا پروگرام نہیں ہے۔"

اس کے بعد لبنیٰ بھابی ریموٹ کا چارج سنبھال کر باری باری تمام بٹن دبا کر سارے پروگراموں کی جھلکیاں دیکھ لیتیں اور پھر یہ رائے ظاہر کرتیں کہ واقعی اس وقت کسی جگہ بھی کوئی اچھا پروگرام پیش نہیں کیا جا رہا ہے۔

اس اثنا میں پارو یا نادیہ یکایک چلاتیں "ماما وہ' وہ کارٹون آپ نے نکال دیا۔"

"کون سا کارٹون کہاں تھا کارٹون؟"

اب بچیوں کی باری آ جاتی اور وہ کارٹون پروگرام کی تلاش میں ریموٹ کنٹرول کے تمام بٹن دبانے شروع کر دیتیں۔ اس مشغلے میں وقت بہت مزے میں گزر رہا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد پرویز صاحب نے ایک ضروری مسئلے پر میٹنگ طلب کی۔ ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ شبنم کی ماں کے کردار کے لئے کوئی معقول چہرہ درکار تھا۔ دوسرا مسئلہ سائیڈ ہیروئن کا تھا۔ یوں تو کہانی کے مطابق فلم کے ہیرو ندیم صاحب ہر اچھی شکل کی لڑکی پر لٹو

ہو جاتے تھے اور اسے بتاتے تھے کہ میں نے خوابوں میں جو چہرہ دیکھا تھا تم اس کی ہو بہ تعبیر ہو' مگر ایک ان کی مستقل گرل فرینڈ کی بھی ضرورت تھی جو ایک ڈاکٹر کی بیٹی تھی' ڈاکٹر پاکستانی تھے' ایک یورپین لڑکی سے شادی کر لی اور کینیڈا ہی میں آباد ہو گئے' ان کی ایک بیٹی وہیں پلی بڑھی اور ظاہر ہے کہ بالکل مغرب زدہ ہو کر رہ گئی' ڈاکٹر صاحب کی بیگم تو اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں مگر بیٹی نہ صرف زندہ تھی بلکہ جوان بھی ہو گئی تھی اور اس کے طور طریقے ڈاکٹر صاحب کے لئے مستقل عذاب اور اذیت کا باعث بنے ہوئے تھے۔

ہمیں ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو دیکھنے میں پاکستانی لگے مگر عادات و اطوار بالکل امریکی ہوں۔ واجد صاحب اور جاوید چودھری صاحب اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے مختلف لڑکیوں سے رابطہ قائم کر چکے تھے۔ بہت سی پاکستانی لڑکیوں کے ٹیلی فون بھی آئے تھے جو وہیں رہتی تھیں اور فلم میں کام حاصل کرنے کی خواہش مند تھیں۔ ان سب سے انٹرویو ہو چکے تھے اور پرویز صاحب کسی ایک سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ ابھی میٹنگ میں یہ غور خوض جاری ہی تھا کہ ندیم کے اپارٹمنٹ سے ٹیلی فون موصول ہوا۔ ندیم کے ایک پرانے کراچی کے دوست انہیں مل گئے تھے اور وہ ان سے پرویز صاحب اور یونٹ کے دوسرے لوگوں کو ملانا چاہتے تھے۔ ہماری میٹنگ تو ختم ہو ہی چکی تھی اس لئے پرویز صاحب نے انہیں کمرے میں آنے کی دعوت دے دی۔ ویسے بھی فلم والوں کے ہاں کوئی بات خفیہ نہیں ہوتی اس لئے بھری محفل میں ساری باتیں جاری رہتی ہیں۔

ندیم ایک اسمارٹ اور ہینڈسم صاحب کو لے کر کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ مہرہ کافی حد تک ندیم سے مشابہ تھا' عمر اور قد و قامت بھی ویسا ہی تھا ہمیں یاد آیا کہ ہم ان سے پاکستان میں بھی ایک آدھ بار مل چکے تھے۔ ندیم صاحب نے ان کو سب سے متعارف کرایا اور بتایا کہ وہ سالہا سال سے کراچی چھوڑ کر ٹورنٹو میں رہتے ہیں نام ان کا رئیس احمد تھا۔ رئیس صاحب بہت خوش اخلاق بلکہ ذوق و شوق کے ساتھ سب سے ملے۔ ان سے کینیڈا کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اداکاروں کا مسئلہ بھی بیان کیا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی صاحب زادی پیرس اور نیویارک میں ماڈلنگ کر چکی ہیں۔ ان دنوں یہیں ہیں' اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو ان سے بھی ملاقات کر لیں اور انہوں نے اگلے روز ہم لوگوں کو اپنے گھر مدعو کر لیا۔

رئیس صاحب کی صاحب زادی کا نام صبا تھا۔ وہ ایک اسمارٹ اور دلکش شخصیت کی مالک تھیں۔ یورپ اور امریکہ میں دبلے پتلے ماڈلز کو پسند کیا جاتا ہے۔ وہ بھی اس معیار پر پوری اترتی تھیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کینیڈا میں ہوئی تھی مگر ان کا اردو لب و لہجہ اور تلفظ بہت عمدہ تھا۔ شاید اس لئے کہ ان کے گھر میں ہمیشہ اردو ہی بولی جاتی تھی۔ جب پرویز صاحب نے انہیں کردار کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً کام کرنے کے لئے آمادہ ہو گئیں۔ بعد میں انہوں نے جن مناظر میں کام کیا وہ بہت اچھے تھے۔ ماڈل ہونے کی وجہ سے وہ کیمرے سے خائف نہیں تھیں۔ خود اعتمادی بھی بلا کی تھی اور کیوں نہ ہوتی جو لڑکی نیویارک اور پیرس میں ماڈلنگ کرتی ہو اسے بھلا خود اعتمادی اور دولت کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ صبا کے لئے یہ فلم میں کام کرنے کا پہلا موقع تھا مگر انہوں نے کسی موقعے پر بھی تاثر نہیں دیا کہ وہ پہلی بار کیمرے کا سامنا کر رہی ہیں۔ مووی کیمرے کے سامنے یہ ان کا پہلا

موقع ضرور تھا مگر ساکت کیمروں کے سامنے وہ کافی عرصے سے کام کر رہی تھیں۔ ہمارے لئے یہ بات بھی بہت خوشی کا باعث تھی کہ ایک پاکستانی لڑکی نے امریکہ اور یورپ میں بطور ماڈل نام پیدا کیا تھا۔ صبا نے اس بات کی بھی وضاحت کردی کہ وہ ہمیشہ شائستہ انداز میں ماڈلنگ کرتی ہیں۔ نیم عریاں لباس اور فضول قسم کے پوز بالکل نہیں بناتیں۔

صبا بہت جلد یونٹ کے دوسرے افراد کے ساتھ گھل مل گئیں ان کی بول چال اور انداز سے بالکل یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ مغرب کے ماحول میں پل کر جوان ہوئی ہیں اور یہ کریڈٹ ان کے والد رئیس احمد کو بھی جاتا ہے کہ انہوں نے یہ اپنی بیٹی کو مشرقی تہذیب اور شائستگی کا احساس دلایا۔ وہ سب کے ساتھ بے تکلف ہو کر گپ شپ کیا کرتی تھیں اور دنیا بھر کے قصے اور واقعات سنایا کرتی تھیں۔ ماڈلنگ سے وہ بہت معقول پیسے کما رہی تھیں اس کے باوجود ان کی خواہش تھی کہ اگر پاکستان میں انہیں ماڈلنگ یا فلموں میں اداکاری کا موقع مل جائے تو وہ پیرس، روم، نیویارک اور لندن چھوڑ کر پاکستان پہنچ جائیں گی، مگر ان کی اس خواہش کی راہ میں دو رکاوٹیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس زمانے میں پاکستان میں ابھی ماڈلنگ کا رواج اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا جس کے ذریعے معقول آمدنی ہو سکے اور دوسرے یہ کہ ان کا چہرہ مہرہ اور شخصیت مغرب والوں کے لئے تو آئیڈیل تھی مگر پاکستان فلم بین اپنی فلمی ہیروئن میں جس قسم کی خوبیاں چاہتے ہیں وہ ان میں نہیں تھیں "کامیابی" کی نمائش کے چند سال بعد وہ ایک بار پاکستان آئی بھی تھیں اور لاہور میں بھی کئی دن مقیم رہیں۔ ہم اس زمانے میں ایڈورٹائزنگ کے کاموں میں مصروف تھے مگر کوشش کے باوجود انہیں یہاں مصروف رکھنے کے لئے مناسب مواقع فراہم نہ کئے جا سکے۔

ایک روز رئیس صاحب اور صبا نے ہم لوگوں کو اپنے فلیٹ پر باقاعدہ کھانے کی دعوت دی فلیٹ نہایت خوب صورتی اور نفاست سے سجا ہوا تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ آرائش کا انداز مشرقی تھا کھانا صبا اور رئیس صاحب دونوں نے مل کر پکایا تھا اور بہت لذیذ تھا۔ مغرب میں رہ کر مشرقی آداب سے اتنی وابستگی ایک قابل تعریف بات ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسے لوگ اگر اپنے ملک میں واپس آنا چاہیں تو انہیں تمام دروازے بند ملتے ہیں۔ رئیس صاحب ندیم کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ دونوں ملے

تو پرانی باتیں اور قصے کہانیاں شروع ہو گئیں۔ رئیس صاحب کی ایک اور ادا جو ہمیں بہت بھائی وہ یہ تھی کہ جب انہیں پتا چلا کہ فلم میں صبا کا کردار ندیم کی گرل فرینڈ کا ہوگا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ایک دوست کی بیٹی کو گرل فرینڈ کے روپ میں پیش کرنا انہیں کچھ پسند نہیں آیا تھا مگر ہم لوگوں کی مجبوری کی خاطر مان گئے، مگر شوٹنگ کے وقت وہ کبھی آس پاس موجود نہیں رہا کرتے تھے، جس سے ان کی مشرقی وضع داری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایک روز جھیل کے کنارے "سینٹرل آئی لینڈ" پر شوٹنگ کا پروگرام بنایا گیا۔ سینٹرل آئی لینڈ جھیل کے اندر ایک مختصر سا جزیرہ سمجھئے۔ انتہائی خوب صورت جگہ ہے سیرو تفریح کے تمام لوازمات یہاں موجود ہیں۔ اس قسم کے مقامات پر ہر عمر کے لوگوں کی دلچسپی کا لحاظ رکھا جاتا ہے، چنانچہ یہاں بھی ہر قسم کے کھیل کود اور تفریحات کا بندوبست تھا۔ بچوں کے لئے گھوڑ سواری، کھیل تماشے، آسمان پر ہینگنگ چیئرز، میری گوراؤنڈ، پانی کے کھیل غرض ہر طرح کی تفریح اور دلبستگی کا سامان موجود تھا۔ سینٹرل آئی لینڈ جانے کے لئے ٹورنٹو میں ایک مختصر سی بندرگاہ بنائی گئی ہے اور جہاز کے ذریعے وہاں جاتے ہیں۔ یورپ میں مختلف ملکوں کے مختصر سفر کے سلسلے میں جیسی فیری (کشتیاں) استعمال کی جاتی ہیں یہ جہاز بھی ویسا ہی تھا۔ ہر عمر کے عورت مرد، بچے، بڑے، بوڑھے اس میں سوار ہو جاتے ہیں اور پھر یہ جہاز کی مانند موٹی آواز میں وسل دیتا ہے اور آہستگی سے سفر شروع کر دیتا ہے۔ یہ بیس پچیس منٹ کا سفر ہے مگر بے حد دلچسپ اور رنگین۔ مغربی ملکوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ تفریح گاہوں اور سیاحت کے مقامات پر سوائے ہنسنے، ہنسانے، بے فکری اور سیرو تفریح کے اور کچھ نظر نہیں آیا۔ جسے دیکھئے خوش و خرم اور زندگی سے لطف اندوز ہونے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ کیا مجال جو کوئی اداس، فکر مند اور مایوس چہرہ نظر آجائے۔ ان میں سیاحوں کے علاوہ مقامی لوگ بھی بہت بڑی تعداد میں شامل ہوتے ہیں مگر سب کا موڈ ایک جیسا۔ بوٹ میں بچوں کی بھاگ دوڑ اور بڑوں کی مصروفیات جاری رہتی ہیں۔ جب یہ جہاز اپنی بندرگاہ سے روانہ ہوتا ہے تو سامنے ٹورنٹو شہر کی فلک بوس عمارتیں آہستہ آہستہ دور ہوتی نظر آتی ہیں اور سچ مچ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی بڑے شہر سے کسی بحری سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ سینٹرل آئی لینڈ میں بھی دو اطراف تو جھیل کا

پانی حد نگاہ تک نظر آتا ہے اور دو سمتیں ایسی ہیں جدھر ٹورنٹو شہر کی شاندار اور آسما
سے باتیں کرنے والی عمارتیں ایک عجیب منظر پیش کرتی ہیں اس جگہ پرویز صاحب
ایک گانا فلمایا۔ کچھ مناظر بھی فلمائے گئے۔ بچے' خواتین اور شوٹنگ میں حصہ نہ لی
والے لوگ اپنی اپنی دلچسپیوں میں کھوئے رہے۔ آئی لینڈ کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ع
کو چھوٹی چھوٹی خوب صورت کاریں مہیا کی گئی ہیں ان سے کاریں مستعار لے کر ہم
چند بول فلمائے گئے۔ شبنم آسمانی کرسیوں پر سوار ہو کر آئی لینڈ کی سیر کرتی رہیں۔
ہینگنگ چیئرز اچھی خاصی اونچائی پر قریب قریب جزیرے کے ہر حصے کے اوپر سے گز
ہیں اور نیچے کا منظر بہت دلچسپ اور دلکش نظر آتا ہے شاہ جی نے یہ مشورہ دیا کہ ا
کرسیوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اتنا فائدہ تو اٹھالیا گیا تھا کہ ہیرو ہیروئن ان پر سوار ہ
مگر شاہ جی کا خیال تھا کہ کچھ اور فائدہ بھی اٹھانا چاہیے۔

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ کرسیوں پر ہیروئن بیٹھی ہے کہ برابر سے گزرنے والی کرسی پر بیٹھا
ایک غنڈہ چھلانگ لگا کر اس کی کرسی پر آجاتا ہے پھر وہاں ہیرو سے اس کی فائٹ شروع
جاتی ہے۔ کرسیوں والے کرنٹ بند کرتے ہیں اور سب لوگ آسمان پر ہی لٹکے ہوئے
جاتے ہیں۔ ادھر ہیرو اور ولین کی فائٹ جاری ہے کبھی ہیرو نیچے زمین پر گرنے لگتا ہے
کبھی ولین کرسی سے نیچے لٹک جاتا ہے خوب مارا ماری ہوتی ہے پھر آخری میں ولین نے
گر کر سپرد خدا ہو جاتا ہے۔"

پرویز صاحب بڑے صبر کے ساتھ ان کی گفتگو سنتے رہے۔ پھر کہنے لگے "مگر شاہ
ہماری کہانی میں تو ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے۔ اور نہ ایسے ولین کا کوئی کردار ہے۔"

شاہ جی مسکرائے "سر جی آپ کے پاس رائٹر موجود ہے جو اس سچویشن کو کہانی م
ٹچن ٹاچ کر دے گا آخر ان سے بھی تو کوئی کام کرائیں۔"

پرویز صاحب کہنے لگے "محض ان سے کوئی کام کرانے کے لئے ہم اپنی کہانی کا ح
بگاڑ لیں؟"

"نہ بگاڑیں آپ باس ہیں۔"

دو لڑکیاں ایک بینچ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ صورت شکل بہت اچھی' لباس مغ

بشرطیکہ آپ جینز اور قمیص کو لڑکیوں کے لئے معقول لباس سمجھتے ہوں۔ ان میں سے ایک کتاب پڑھنے میں مصروف تھیں۔ اور دوسری خاموش بیٹھی خلا میں تک رہی تھیں ہم انہیں کافی دیر سے دیکھ رہے تھے۔ وہ نہ صرف اردگرد کے ماحول سے بالکل بے تعلق تھیں بلکہ ایک دوسرے سے بھی بیگانہ اور بے زار نظر آرہی تھیں۔ ہمارے ملک میں اول تو اکیلی دوکیلی لڑکی نظر ہی نہیں آتی اور اگر نظر آ بھی جائے تو سینکڑوں ہزاروں نگاہیں اس پر جمی رہتی ہیں' مگر یہاں کوئی ان کی جانب نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ سوائے ہم لوگوں کے۔ لٹی کو یہ پریشانی تھی کہ آخر یہ دونوں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں اور اگر ایک دوسرے کے ساتھ ہیں تو آپس میں باتیں کیوں نہیں کرتیں۔ عورتوں کے بارے میں ساری دنیا میں یہ تصور ہے کہ وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتیں۔ جہاں دو عورتیں اکٹھی ہو جائیں وہاں قیامت برپا ہو جاتی ہے مگر یہ دونوں لڑکیاں اس مقولے کو غلط ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ ایک بار ہم ان کے سامنے سے گزرے تو ان میں سے ایک سگریٹ کے کش لگا رہی تھی جب کہ دوسری حسب سابق آسمان کو دیکھنے میں مصروف تھی۔

کچھ دیر بعد یونٹ کا ایک نوجوان اور جوشیلا رکن ہمارے پاس آیا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں

"سر آپ نے دیکھا وہ کیا کر رہی ہیں؟"

"کون کیا کر رہی ہیں؟"

"وہی آوارہ لڑکیاں سمجھ میں نہیں آتا ان کے ماں باپ ان کو کچھ کیوں نہیں کہتے۔"

ہم سمجھ گئے کہ ان ہی دو لڑکیوں کا تذکرہ ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ دونوں کیا معیوب حرکت کر رہی ہیں ہم کشاں کشاں باغ کے اس گوشے کی جانب چل پڑے جہاں وہ دونوں بہت دیر سے فروکش تھیں۔ وہ دونوں اس وقت بھی پاس پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ کتاب پڑھنے والی لڑکی کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی جس کے ذریعے وہ خلا میں تکنے والی لڑکی کو انجکشن لگا رہی تھی۔

"سر آپ کو پتا ہے یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"ہاں صاف نظر آرہا ہے انجکشن لگایا جا رہا ہے۔"

”سر آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ انجکشن نہیں ہے ہیروئین ہے۔ یہ بے شرم لڑکیاں نشہ کر رہی ہیں اور کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں ہے۔“

ہم نے کہا ”تم خود کیوں نہیں پوچھ لیتے۔“

وہ بے زار ہو کر بولا ”انہیں تو اللہ میاں ہی پوچھے گا سر! کھلے عام بیچ میدان میں سب کے سامنے ہیروئین کا ٹیکہ لگا رہی ہیں۔“

ہم نے کہا ”دیکھو بھائی یہاں کا یہ دستور ہے کہ جس کے جو دل میں آتا ہے وہ کرتا ہے کوئی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا۔“

”اسی لئے تو ان کا یہ حال ہو رہا ہے۔ سر! یہ برباد ہو جائیں گے‘ زمین میں غرق ہو جائیں گے۔“

ہم نے کہا ”فی الحال تو یہ ہم سے صدیوں آگے ہیں۔ چاند ستاروں پر جا رہے ہیں نئی دنیائیں بسا رہے ہیں۔“

”سر! یہ ہیروئین بڑی کمینی چیز ہے۔ بس یہ انہیں لے کر بیٹھ جائے گی۔ آپ میری بات نوٹ کر کے رکھ لیں۔“

شام کو شوٹنگ پیک اپ ہونے کے بعد جب ہم لوگ اپنے بحری جہاز میں سوار ہوئے تو وہ دونوں لڑکیاں بھی ہمارے ساتھ اسی جہاز پر سفر کر رہی تھیں۔ ہم جان بوجھ کر ان کے نزدیک جا کھڑے ہو گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دور سے جتنی اچھی لگ رہی تھیں نزدیک سے اور بھی زیادہ حسین اور دلکش تھیں۔ انہوں نے اپنے کاندھوں سے بڑے سائز کے بیگ لٹکائے ہوئے تھے اور آہستگی سے آپس میں بات چیت کرنے میں مصروف تھیں۔ بظاہر ان پر نشے کا کوئی اثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک لڑکی نے بیگ کھول کر ایک چھوٹا سا کیمرا نکالا دوسری لڑکی کو ٹورنٹو شہر کی عمارتوں کے سامنے کھڑا ہونے کے لئے کہا اور تصویر بنا لی۔ اس کے بعد دوسری لڑکی نے تصویر بنائی۔ پھر شاید انہیں دونوں کی یکجا تصویر بنانے کا خیال آیا۔ سب سے نزدیک ہم ہی انہیں نظر آئے۔ وہ مسکراتی ہوئی ہمارے پاس آ گئیں اور انگریزی میں بولیں: ایکسکیوزمی کیا آپ ہماری ایک تصویر بنا دیں گے؟“

ہم نے فوراً ان کی ایک تصویر اتار دی اور کیمرا انہیں واپس دیتے ہوئے کہا

”تصویر تو بنا دی ہے مگر نظر آئے گی یا نہیں اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔“

”کیوں کیا آپ بہت اناڑی ہیں؟“

ہم نے کہا ”کافی۔“

انہوں نے دلچسپی سے ہمیں دیکھا ”کیا ٹورنٹو میں رہتے ہیں؟“

ہم نے کہا ”ٹورسٹ ہیں۔“

بولیں ”ٹورسٹ تو ہم بھی ہیں۔ یہ ڈینی ہے امریکہ سے آئی ہیں اور میرا نام نارسیا ہے میں بھی امریکہ سے آئی ہوں مگر مغربی ساحل سے یعنی لاس اینجلز‘ سے آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

ہم نے کہا ”ہم بہت دور سے آئے ہیں پاکستان سے۔“

ان میں سے ایک نے گردن ہلائی ”نام تو اچھا ہے ملک بھی اچھا ہی ہو گا۔“

ہم نے پوچھا ”آپ لوگوں نے کوئی اور ملک بھی دیکھا ہے؟“

جواب ملا ”پہلی بار کینیڈا آئے ہیں دراصل ہمارا اپنا ملک اتنا بڑا ہے کہ دیکھنے سے فرصت نہیں ملتی۔“ یہ حال سبھی امریکیوں کا ہے وہ باقی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ بس اپنے اندر مگن رہتے ہیں۔

نارسیا نے کہا ”ڈینی اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم دونوں ان کے ساتھ بھی ایک تصویر بنا لیں؟“

”کیوں نہیں بہت اچھا خیال ہے۔“

انہوں نے پاس کھڑے ہوئے ایک موٹے سے صاحب سے درخواست کی اور وہ ہماری تصویر بنانے کے لئے تیار ہو گئے۔ کیمرا ان کے حوالے کر کے دونوں لڑکیاں آ کر ہمارے دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں۔ دونوں نے ہمارے بازو میں بازو ڈال دیے اور سر ہمارے کندھوں پر ٹیک دیے۔ ہم تو ویسے ہی تصویر بنوانے سے گھبراتے ہیں مگر یہاں تو منظر ہی عجیب تھا جہاز پر سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہ تھی‘ مگر ہمیں کچھ فاصلے پر ایک آرام کرسی کے نزدیک لبنیٰ کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آ گیا۔ ہم نے پریشانی سے لبنیٰ کو دیکھا مگر اتنی دیر میں ہماری تصویر اتر چکی تھی۔

"تھینک یو" کہہ کر انہوں نے موٹے آدمی کے ہاتھ سے اپنا کیمرا چھین لیا اور پھر ہم سے مخاطب ہو کر ہمارا بھی شکریہ ادا کیا جواب میں ہم نے بھی ان کا شکریہ ادا کیا۔
نارسیا نے کہا "اگر آپ اپنا کارڈ دے دیں تو ہم یہ تصویر بنوا کر آپ کو بھجوا دیں گے۔"

"سوری ہمارے پاس اس وقت کارڈ نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں پتا لکھوا دیں۔" اس نے بیگ کھول کر اس کے اندر سے ایک نوٹ بک اور بال پوائنٹ قلم نکال لیا۔ ہم نے کہا "دراصل ہم جس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں اس کا پتا اس وقت یاد نہیں آرہا۔"

"کوئی بات نہیں" انہوں نے نوٹ بک بال پوائنٹ اور کیمرا اپنے بیگ میں رکھ لیا اور ایک بار پھر آپس میں باتیں کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ وہ ہم سے ایسے بے تعلق ہو گئی تھیں جیسے جانتی ہی نہ ہوں۔ مغرب کے لوگوں کا یہ خاص انداز ہے ایک فلمی شاعر نے ان کا نقشہ خوب کھینچا ہے

وہ جو ملتے تھے کبھی ہم سے دوانوں کی طرح
آج یوں ملتے ہیں جیسے کبھی پہچان نہ تھی

ہم پہلی فرصت میں لینٹی کے پاس جانا چاہتے تھے کہ صورت حال کی وضاحت کر سکیں، مگر راہ میں یونٹ کے دو اصحاب مل گئے "سر آپ نے لڑکیوں کے ساتھ تصویر بنوا لی ہے جو سرعام ہیروئین استعمال کرتی ہیں۔"

ہم نے کہا "تو پھر کیا ہوا تصویر ہی بنوائی ہے ہیروئین کا انجکشن تو نہیں لیا۔"

"ان سے بچ کر رہیے گا یہ بڑی آوارہ لڑکیاں ہوتی ہیں تلاش میں رہتی ہیں۔"

ان غریبوں کے بارے میں ان کا اندازہ کتنا غلط تھا۔

لینٹی نے ہمیں دیکھا تو بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا "بنوالی تصویر؟"

ہم نے سر ہلایا "ہاں بنوالی۔"

"یہ تصویریں بنوانے کا شوق کب سے ہو گیا ہے آپ کو؟"

"بس ان لڑکیوں کو دیکھتے ہی ہو گیا۔"

"پتا بھی لکھوا دیا ہے انہیں؟"

"ہاں مگر........"

کہنے لگیں "اگر پاکستان کا پتا دیا ہے تو خیر ہے یہاں کا پتا اور فون نمبر تو ظاہر ہے پ کو یاد نہیں ہو گا۔"

ہم نے دل میں سوچا کہ اگر میاں بیوی کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ہو تو ایسی ہو مگر ی بیوی کی سہیلیاں اسے یہی سمجھاتی رہتی ہیں کہ دیکھ لینا ایک دن نہ پچھتاؤ تو پھر ہمارا بدل دینا۔

سارے دن تو آئی لینڈ میں مصروف رہے پھر واپسی میں بحری سفر کیا اس کے بعد ل کی بندرگاہ سے کاروں کے ذریعے مارکھم تک چالیس پچاس کلو میٹر کا فاصلہ طے کیا اس کے باوجود کسی کو تھکن کا نام نہیں تھا۔ پتا نہیں یہ ماحول اور موسم کی کرامت یا ملاوٹ سے پاک غذائیں کھانے کا نتیجہ؟

رات کو ہم واک کے لئے جانے والے تھے کہ واجد صاحب بوکھلائے ہوئے د
ہوئے "بس کام بن گیا۔"

"کون سا کام؟"

"وہی شبنم کی ماں والا۔"

ہم سب پریشان ہو گئے شبنم کی ماں والا کون سا کام بن گیا ہے جو واجد صاحب قدر خوش خرم نظر آرہے ہیں "میرا مطلب ہے ہیروئن کی ماں مل گئی ہے۔ ماں بھی ڈھونڈی ہے کہ سچ مچ شبنم کی ماں نظر آئے گی اور ہے بھی بنگالن۔"

شاہ جی اور پرویز صاحب اس قدر جوش میں آئے کہ اگلے دن کی شوٹنگ ملتو کے ہیروئین کی ماں سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔ سہ پہر کو وہ سب خوش خوش واپس آ پرویز صاحب نے اعلان کر دیا کہ کل ہم لوگ ہیروئین کے گھر والے مناظر فلمائیں گ

پرویز صاحب نے شبنم سے کہا "شبنم ایسی ماں ڈھونڈی ہے کہ ہو بہو تمہار لگتی ہے تم خود بھی دھوکا کھا جاؤ گی۔"

ندیم صاحب نے لقمہ دیا "مجھے تو کوئی چکر لگتا ہے؟"

"کیسا چکر؟"

"فلموں میں ایسا ہوتا ہے نا کہ ایک ہی شکل کے دو آدمی مختلف مقامات پر ہیں اور بعد میں پتا چلتا ہے کہ وہ بچپن میں بچھڑ گئے تھے کیوں شبنم! بچپن میں تمہار خالہ بچھڑ تو نہیں گئی تھیں؟"

"آپ ہمارا مذاق بناتے ہیں۔"

"مذاق ہی مذاق میں بہت سی باتیں سنجیدہ بھی مل جاتی ہیں۔"

روبن نے سنجیدگی سے کہا "آپ ٹھیک بولے ہم ادھر ڈھاکہ فون کر کے شبنم کی مدر سے پوچھے گا۔"

دوسرے دن اشتیاق کے مارے ہم بھی یونٹ کے ساتھ ہی روانہ ہو گئے۔ وہ جگہ بھی مارکھم ہی میں تھی مگر ہمارے اپارٹمنٹ سے کافی فاصلے پر۔ وہ تو غنیمت ہے کہ سڑکیں اس قدر کشادہ اور ٹریفک اتنا منظم ہے کہ کاریں سڑکوں پر برق رفتاری سے چلتی ہیں ورنہ اتنے فاصلے پر جانے کے لئے گھنٹوں درکار ہوتے ہیں۔

جن خاتون کو شبنم کی ماں کے کردار کے لئے چنا گیا تھا ان کا نام مسز نراد چودھری تھا۔ ویسے تو خود ان کا بھی کوئی نام تھا جو ہمیں یاد نہیں رہا مگر سب انہیں مسز چودھری کہہ کر مخاطب کر رہے تھے ٹاؤن ہاؤس کے باہر مسٹر نراد چودھری استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے وہ سانولی رنگت کے بنگالی تھے۔ عمر پینتالیس پچاس سال کے لگ بھگ ہو گی مگر دیکھنے میں کم عمر لگتے تھے۔ واجد صاحب نے فوراً تعارف کی رسم ادا کی۔ نراد چودھری صاحب نے سب سے انگریزی میں بات چیت کی۔ شبنم کو دیکھا تو فوراً بنگالی میں رواں ہو گئے ادھر شبنم نے بھی بنگالی زبان کے ایسے جوہر دکھائے کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ وہ دونوں اتنی روانی کے ساتھ بنگالی بول رہے تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے کوئی مقابلہ ہو رہا ہے۔ الفاظ تیز رفتار گولیوں کی مانند ان کے منہ سے نکل نکل کر ادھر سے ادھر جا رہے تھے یکایک شبنم کو احساس ہوا کہ ہم سب ان دونوں کی شکلیں دیکھ رہے ہیں انہوں نے معذرت طلب کی۔ مسٹر چودھری نے بھی معذرت کی اور کہا کہ معاف کرنا بہت عرصے بعد کوئی خالص بنگالی اس شہر میں ملا ہے تو بے ساختہ بنگالی بولنا شروع کر دی۔ سب نے شبنم کو اس بات پر مبارک باد دی کہ مسٹر چودھری نے انہیں کم سے کم خالص بنگالی تو قرار دے دیا ہے گھر کے اندر داخل ہوئے تو جانا پہچانا سا لگا ایشیائی لوگوں کے گھروں میں جا کر اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ تصویریں' آرائش اور دوسری چیزوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہم ان سب سے مانوس ہیں۔ اتنی دیر میں کچن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی مسز نراد چودھری بھی تشریف لے آئیں۔ واجد صاحب نے سچ ہی کہا تھا کہ وہ قدو قامت' ناک نقشہ اور صورت شکل میں شبنم سے اتنی زیادہ ملتی تھیں کہ حیرت ہوئی۔ انہوں نے بھی ہم سب سے علیک سلیک کرنے کے بعد شبنم کو گلے لگا کر بنگالی کا دریا بہا دیا پھر جب دل ذرا ٹھکانے

آیا تو انگریزی زبان میں اعلان کیا کہ آپ سب لوگ لنچ اور ڈنر یہیں کھائیں گے۔

"مگر ہم تو بہت سے لوگ ہیں۔" پرویز صاحب نے کہا۔

"تو کیا ہوا ہم نے کھانا بھی بہت سارا بنایا ہے۔"

جب کھانا کھایا تو مسز چودھری کی ایک اور خوبی کا پتا لگا۔ انہوں نے انتہائی لذیذ اور خالص مشرقی کھانے تیار کئے تھے۔ بریانی' قورمہ' دال' ترکاری۔ مسٹر نراد چودھری نے یہ اطلاع بھی دے دی کہ گوشت اور مرغی حلال گوشت کی دکان سے آئی ہے کوئی صاحب پریشان ہونے کی کوشش نہ کریں ان کا جملہ اس قدر اچانک بھرپور اور زور دار تھا کہ ہم سب کے لئے ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا تھا۔ لہٰذا پرویز صاحب نے شوٹنگ کی تیاریاں شروع کر دیں مسز چودھری کو ان کے کردار کے بارے میں بتایا اور شبنم کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ انہیں مکالمے اور سین یاد کرا دیں اور سمجھا دیں۔

"مگر میں کیسے سمجھاؤں گی۔ ڈائریکٹر تو آپ ہیں؟"

"میں نے تو تمہیں اسی وقت اپنا اسسٹنٹ مقرر کر دیا ہے بس اب یہ کام تمہارا ہے۔"

ڈرائنگ روم اور کھانے کے کمرے میں شوٹنگ کے انتظامات شروع ہو گئے۔ یہ ٹاؤن ہاؤس بھی اس نقشے اور نمونے کا تھا جیسے عموماً امریکہ اور کینیڈا میں گھر ہوتے ہیں ان ملکوں میں ایک اچھی یا بری بات یہ ہے کہ گھروں کے عام طور پر چند ہی نقشے ہوتے ہیں جو تعمیر کئے جاتے ہیں۔ اس لئے مکانوں کی چند قسموں کے علاوہ دوسری اقسام اور نمونے دیکھنے میں نہیں آتے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان گھروں میں استعمال شدہ مختلف چیزیں یا ان کی فالتو حصے سپر مارکیٹ میں سستے داموں مل جاتے ہیں۔ وہاں لوگ عام طور پر مرمت اور تعمیری کا کام خود کرتے ہیں اس لئے انہیں یہ سہولت ہو جاتی ہے کہ سیڑھی' دیوار' فرنیچر' فرش وغیرہ کا جو حصہ خراب ہو جائے بازار جا کر بنا بنایا لے آئیں اور فٹ کر دیں۔ نراد چودھری صاحب ہمیں ایک بیڈ روم میں لے گئے۔ زمین پر قالین کا فرش تھا سائیڈ میں ایک بیڈ تھا اور باقی جگہ پر الماریاں اور ریکس بنے ہوئے تھے جن میں آڈیو کیسٹس بھرے ہوئے تھے۔ فرش پر دیواروں کے ساتھ الماریوں کے اندر اور باہر ہر جگہ کیسٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایک جانب ڈیک تھا اور چاروں اطراف

میں اسپیکرز لگے ہوئے تھے۔ سائیڈ میں ایک دیوان نما چیز پر طبلے' سارنگی ہارمونیم اور ستار رکھا ہوا تھا۔ دیواروں پر سہگل' نورجہاں استاد بڑے غلام علی خاں اور دوسرے کلاسیکی گانے والوں کی تصاویر لٹکی ہوئی تھی۔ ہم تو یہ ماحول اور منظر دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ نراد چودھری نے کمرے کے دروازے کے باہر جوتے اتارے تو ہم نے بھی اپنے جوتے اتار دیئے۔ اندر داخل ہو کر انہوں نے بڑے گانے والوں کی تصاویر کے سامنے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور پھر بڑے ادب سے آنکھیں بند کر کے کھڑے ہو گئے کچھ دیر بعد وہاں سے ہٹے تو کیسٹوں کے ڈھیر کے درمیان جو جگہ خالی تھی وہاں بیٹھ گئے ہمارے لئے بھی انہوں نے تھوڑی سی جگہ خالی کر دی۔ نراد چودھری صاحب کا قصہ یہ ہے کہ وہ کلکتہ کے رہنے والے ہیں۔ تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی' شادی کلکتہ میں کی' انجینئر کی تعلیم کے لئے لندن گئے تو پڑھ لکھ کر وہیں نوکری کرنے لگے' بہت زور دار نوکری تھی اس لئے کئی سال انگلستان میں رہے پھر کینیڈا چلے آئے۔ یہ تو ان کا پیشہ ورانہ تعارف تھا۔ شق کا معاملہ یہ ہے کہ انہیں بچپن ہی سے موسیقی سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا اور عمر کے ساتھ یہ شوق اور جنون بھی بڑھتا رہا۔ وہ ہر قسم کی موسیقی کے عاشق ہیں۔ ہلکی پھلکی' فلمی غزلیں' کلاسیکی' نیم کلاسیکی۔ ہندوستان اور پاکستان کے سبھی گانے والوں کے کیسٹ ان کے پاس موجود ہیں۔ ہر ایک کے بارے میں معلومات اور اس کی ہسٹری بھی ان کے پاس ہے بلکہ زبانی یاد ہے اتنی میوزیکل معلومات شاید ہی کسی کو زبانی یاد ہوں۔ ہندوستان اور پاکستان میں بننے والا ہر گانا ان کے پاس موجود ہے۔ موسیقار ناشاد امریکہ گئے تو نراد چودھری خاص طور پر انہیں ٹورنٹو لے کر آئے اور اپنا مہمان بنایا۔ موسیقاروں اور گلوکاروں کے تو وہ تابعدار اور حلقہ بگوش ہیں۔ پاکستان کے سبھی موسیقاروں اور گلوکاروں کے نام انہیں ازبر ہیں۔ ہر ایک کے کیسٹ ان کے پاس موجود ہیں ہر ایک کے مقبول اور مشہور گانے انہیں زبانی یاد ہیں۔ ہمیں تو یوں لگا جیسے آدمی نہیں کوئی کمپیوٹر ہیں۔ ہر قابل ذکر گانے والے کے نام پر وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے (ہمارے نہیں اپنے) میڈم نورجہاں کا ذکر آیا تو دو زانو بیٹھ گئے اور آنکھیں موند کر دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم لاہور میں رہتے ہیں تو ہاتھ جوڑ کر ہم سے پوچھا غلام علی صاحب بھی تو لاہور ہی میں رہتے ہیں۔

ہم نے کہا ”رہتے تو ہیں مگر زیادہ تر آتے جاتے رہتے ہیں۔“

نزاد چودھری صاحب غلام علی کے بندہ بے دام ہیں۔ مرید ہیں، عاشق ہیں انہوں نے ان کی گائیکی کے انداز کی جو تعریفیں انتہائی تفصیل کے ساتھ شروع کیں تو ہم بھی سن کر حیران رہ گئے۔ ٹھیک ہے غلام علی کی غزلیں ہمیں بھی اچھی لگتی ہیں مگر اتنی زیادہ بھی نہیں مگر نزاد چودھری نے ان کی جو صفات اور خوبیاں گنوانی شروع کیں تو ہماری آنکھیں کھل گئیں کہ اتنا گنی، ہنرمند شخص ہمارے آس پاس رہتا ہے اور ہم قدر ہی نہیں کرتے۔

نزاد چودھری نے ہمارے گھٹنے چھوئے اور بولے: ”سر! ہماری ایک ہی تمنا ہے ایک ہی درخواست ہے، ایک ہی رکھشا ہے ایک ہی دعا ہے۔“

”وہ کیا؟“ ہم نے پوچھا۔

بولے ”کبھی غلام علی صاحب یہاں آکر اس کمرے میں بیٹھیں اور سامنے بیٹھ کر گائیں۔ میں تو ان کے چرنوں میں بیٹھ کر جان ہی دے دوں گا۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں؟“

ہم نے گھبرا کر انہیں دیکھا ”کیا مطلب؟ یعنی آپ کی خودکشی کے پروگرام کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں؟“

عاجزانہ بولے ”نہیں سر بس کسی طرح انہیں ایک بار اس کمرے میں بلا دیں۔ آنے جانے کا سارا خرچہ پیش کروں گا اور جو بھی نذرانہ طلب کریں گے حاضر کر دوں گا۔ پلیز میرا یہ کام کرا دیں۔“

ہم نے کہا ”دیکھئے کوشش کریں گے آج کل تو پتا نہیں غلام علی صاحب کہاں ہیں؟“

انہوں نے فوراً ان کی نقل و حرکت کا تمام شیڈول ہمیں سنا دیا کہ آج کل وہ کہاں ہیں پھر وہاں سے کہاں کہاں جانے والے ہیں۔ پھر انہوں نے غلام علی کی گائی ہوئی غزلیں سنانی شروع کر دیں۔ ہارمونیم اور ستار اٹھا لئے اور پوچھا ”آپ کون سا ساز بجاتے ہیں؟“

ہم نے کہا ”ہم تو بس ریڈیو، ٹیلی ویژن اور زیادہ سے زیادہ کیسٹ ریکارڈ بجا سکتے ہیں۔“

بولے ”طبلہ بھی نہیں؟“

”جی نہیں۔“

”سارنگی، ہارمونیم، ستار؟“

”جی کچھ بھی نہیں۔“ ہم نے شرمندہ ہو کر جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں، میں ہارمونیم بجا کر سنا دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ہارمونیم کے پردوں کو انگلیاں لگائیں اور گانا شروع کر دیا۔

”چپ کے چپ کے رات دن آنسو بہانا یاد ہے۔“

اب عالم یہ ہوا کہ وہ گاتے کم تھے اور آنسو زیادہ بہا رہے تھے ان کی آنکھیں بند تھیں مگر آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ غزل کا ایک ہی مصرعہ وہ بار بار دہراتے رہے پھر آنکھیں کھول کر بولے ”سر، ہم تو غلام علی صاحب کے پیروں کی دھول بھی نہیں ہیں مگر ان کا گایا ہوا گانے کی کوشش کرتے ہیں جیسے کوئی جوگیوں کا بچا ہوا کھانا کھا کر خوش ہو جاتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت مل گئی ہے۔“

غلام علی سے ان کی عقیدت اور محبت دیکھ کر سچ مچ ہماری آنکھیں کھل گئیں اور ہم نے دل ہی دل میں خود کو بہت نفرین کی کہ ایسا گنی شخص ہمارے شہر میں رہتا ہے اور ہم نے آج تک اسکی ذرا بھی قدر نہ کی۔ کتنے شرم کا مقام ہے۔ نزاد چودھری نے بڑی دلچسپ باتیں کیں۔ موسیقی کے بارے میں عجیب و غریب معلومات فراہم کیں۔ مختلف موسیقاروں اور گلوکاروں کے کمالات کے بارے میں گفتگو کی۔ وہ اپنی ہی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے اور ہم بھی ان کے ساتھ ہی گم تھے یکایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ان کی بیگم شبنم کے ساتھ اندر آگئیں

”لنچ کا ٹائم ہو گیا ہے۔“ انہوں نے کہا پھر جب انہوں نے کمرے کا جائزہ لیا تو چونک کر کہنے لگیں ”نزاد تم نے انہیں چائے کافی بھی پلائی ہے کہ بس ان کے کان ہی کھا رہے ہو؟“

”اوہ سوری سر ہمیں تو خیال ہی نہیں رہا۔ معافی دے دو سر!“ نزاد چودھری مجرموں کی طرح دونوں ہاتھ باندھ کر ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے۔

”کتنے شرم کی بات ہے۔“ ان کی مسز نے کہا مگر ہم نے ان کی بات کاٹ دی۔

"ایسا نہ کہیے مسز چودھری آپ کے شوہر نے آج ہمیں جس دنیا کی سیر کرائی ہے وہ ہمارے لئے بالکل انوکھی ہے۔ ان کا یہ احسان ہم کبھی نہیں بھولیں گے۔"

ان کی مسز حیران ہو کر ہمارا منہ دیکھنے لگیں اور نزاد چودھری نے جھک کر ہمارے پاؤں چھو لئے۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم کوئی دیوتا وغیرہ بن گئے ہیں۔ دنیا میں موسیقاروں اور گانے والوں کے ایسے عقیدت مند اور مداح بھی ہوتے ہیں، اس کا نمونہ ہم نے پہلی بار دیکھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ایک شخص جو نسلاً" بنگالی تھا۔ بنگال میں پیدا ہوا انگلستان میں تعلیم حاصل کی اور کام کاج بھی وہیں کرتا رہا۔ جو پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا پھر کینیڈا میں آکر آباد ہو گیا۔ اپنے وطن اور تہذیب و تمدن سے دور رہا۔ آخر اسے موسیقی سے لگاؤ بلکہ عشق کیسے پیدا ہو گیا۔ پھر اس نے مشرقی موسیقی کے متعلق معلومات اکٹھی کیں۔ ریکارڈ اور کیسٹ اکٹھے کئے۔ جو پرانا گانا آپ کو شاید ہندوستان اور پاکستان میں بھی کسی کے پاس نہیں ملے گا وہ نزاد چودھری کے پاس موجود تھا۔ موسیقی اور گلوکاروں اور موسیقاروں کے بارے میں ساری معلومات اس کے پاس محفوظ تھیں۔ دیار غیر میں اس خزانے کی قدر کوئی کیا کرے گا؟

نزاد چودھری کے مکان میں دو روز تک "کامیابی" کی شوٹنگ ہوتی رہی اور ان دو دنوں میں نزاد چودھری نے ہمیں مشرقی موسیقی کے بارے میں اتنا کچھ سکھا دیا جتنا ہم شاید دس برس میں بھی نہیں سیکھ سکتے تھے۔ کبھی وہ ستار بجا کر گاتے، کبھی ہارمونیم بجاتے، کبھی طبلہ بجانے لگتے۔ ان کی ایک ٹین ایجر بیٹی اسکول سے آتی تو وہ بھی ان کے ساتھ سازوں میں سنگت کرتی۔ کبھی طبلہ بجاتی، کبھی ستار کے سر ملاتی، ہارمونیم تو وہ بہت غضب کا بجاتی تھی۔ ان کا ایک بیٹا بھی تھا جو اس لڑکی سے ایک دو سال بڑا تھا۔ مگر اسے موسیقی سے لگاؤ نہیں تھا اور اس بات کا نزاد چودھری صاحب کو بہت ملال تھا۔ ان کی مسز بھی کسی جگہ جاب کرتی تھیں مگر موسیقی سے انہیں بھی بہت وابستگی تھی دونوں میاں بیوی اور بیٹی مل کر موسیقی سے خوب لطف اندوز ہوتے۔ انہیں دنیا میں کوئی اور کام تھا نہ دلچسپی۔ بس فارغ اوقات میں وہ ہوتے اور موسیقی، کبھی کیسٹ سنتے، کبھی ریکارڈ بجاتے، کبھی خود ہی گانے بجانے لگتے۔ دو دن میں ہیروئین کی ماں کے گھر کا سین ختم ہو گیا اور پھر ہم نزاد چودھری کے میوزیکل خاندان کی صحبت سے محروم ہو گئے۔ وہ دونوں میاں بیوی بہت

مصروف لوگ تھے پھر بھی ایک دو بار ملاقات کے لئے اپارٹمنٹ پر آئے اور دیر تک موسیقی اور موسیقاروں کی باتیں کرتے رہے۔ وہ دونوں اچھے خاصے پیسے کماتے تھے مگر اپنی بنیادی ضرورتوں کے علاوہ ساری رقم موسیقی پر لگا دیتے تھے کے۔ ایل سہگل، پنکج ملک، مناڈے وغیرہ کے پرانے پرانے ریکارڈ اکٹھے کرنے پر ان کی بیشتر آمدنی خرچ ہو جاتی تھی۔ انہوں نے غلام علی کے نام ہمیں بہت سے پیغام بھیجے تھے جن میں سے ایک بھی ہم ان تک نہ پہنچا سکے، ملاقات ہی نہیں ہوئی تو پیغام کیسے پہنچاتے؟ خدا جانے دنیا کے دور دراز گوشوں میں بہت سے فن کاروں کے اور کیسے کیسے اور کتنے پرستار بکھرے ہوئے ہوں گے جن کے بارے میں وہ خود بھی کچھ نہیں جانتے۔ دنیا بھی کیسی عجیب و غریب جگہ ہے اور دنیا والے کتنے عجیب ہیں۔

رات کو شبنم اور ندیم اگلے روز کی شوٹنگ کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ شاہ جی کے اپارٹمنٹ میں بلڈنگ کے منیجر تشریف فرما تھے اور دونوں حضرات اپنی اپنی انگریزی زبان میں ایک دوسرے کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔ بچیاں برابر والے اپارٹمنٹ میں ٹیلی ویژن پر کارٹون دیکھنے میں مصروف تھیں۔ یونٹ کے دوسرے لوگ اپنی اپنی پسند کے ٹیلی ویژن پروگرام دیکھنے یا تاش کھیلنے میں مصروف تھے کہ اچانک سارے میں شور مچ گیا کہ اداکار ننھا آگئے۔ سب لوگوں نے اس خبر پر مختلف قسم کے تاثرات کا اظہار کیا۔ زیادہ تر لوگ تو خوش ہوئے مگر جاوید چودھری صاحب پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ ہمارے اپارٹمنٹ میں خواتین ریموٹ کنٹرول والے کھیل میں مصروف تھیں اور ہم اور پرویز ملک صاحب اسکرپٹ کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ اچانک کال بیل بجی ہم نے کہا آجایئے' دروازہ کھلا ہے۔ دراصل یہ دروازہ رات کے علاوہ ہروقت کھلا ہی رہتا تھا۔ ہر دم لوگوں کی آمدو رفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا اس لئے بار بار اٹھ کر دروازے کا تالا کھولنے کی کوئی تک نہیں تھی۔ ہم سمجھے کوئی یونٹ والا کسی کام سے آیا ہو گا یکایک دروازہ کھلا اور سامنے کیا دیکھتے ہیں کہ کوٹ پتلون میں ملبوس ' سر پر فلیٹ ہیٹ پہنے ننھا صاحب کھڑے ہیں۔

"ارے ننھا تم کہاں سے آئے؟" پرویز صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہ دعا نہ سلام' نہ خیریت پوچھی اب کیا بتاؤں کہ کہاں سے آیا ہوں۔ سمجھئے کہ آسمان سے ٹپکا ہوں اور زمین میں سے نکلا ہوں۔ صاف ظاہر ہے کہ پاکستان سے ہی آیا ہوں۔ اسی نام اور شکل و صورت کا آدمی پاکستان کے سوا اور کہاں رہتا ہے؟" انہوں نے ایک لمبی چوڑی تقریر کر دی۔

"میرا مطلب ہے کہ اس وقت کہاں سے آئے ہو؟"

"دیکھئے سرپانی کے جہاز سے تو آنے سے رہا ورنہ مہینوں لگ جاتے بس کے ذریعے بھی نہیں آیا ہوں کیونکہ پاکستان سے ٹورنٹو کے لئے کوئی بس نہیں چلتی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ہوائی جہاز کے ذریعے ہی آیا ہوں اور ہوائی جہاز عام طور پر ہوائی اڈے پر ہی اترتا ہے۔"

ہم نے کہا "بھائی آپ تو لڑنے پر کمر باندھ کر آئے ہیں۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں چائے پیئیں گے یا کافی ٹھیک رہے گی۔"

"اب یہ بتائیں کہ اچانک آئے کہاں سے؟"

"حضور اچانک نہیں آیا۔ میں نے کل رات ہی فون کر کے اپنے آنے کی خبر دے دی تھی جاوید چودھری صاحب کو۔"

"اچھا مگر انہوں نے تو کسی کو بھی نہیں بتایا۔"

"مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے خود اپنے آپ کو بھی نہیں بتایا۔ ورنہ وہ مجھے لینے کے لئے ائرپورٹ پر ضرور موجود ہوتے۔"

اتنی دیر میں کال بیل بجا کر جاوید چودھری صاحب بھی مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوگئے "اوہو ننھا بھائی' ہاؤ آر یو؟"

ننھا نے انہیں یوں گھورا جیسے بس چلے تو کچا چبا ڈالیں گے پھر بولے "آپ کو پتا نہیں تھا کہ میں کون سی فلائٹ سے آ رہا ہوں؟"

"پتا تھا۔"

"تو پھر مجھے لینے کوئی ائرپورٹ پر کیوں نہیں آیا؟"

"میں خود آپ کو لینے کے لئے ائرپورٹ گیا تھا' مگر آپ وہاں نظر ہی نہیں آئے۔"

"سنا آپ نے؟ میں چڑیا کا بچہ ہوں جو انہیں نظر نہیں آیا۔ میرے سائز اور اسٹائل کا آدمی آپ کو اتنے بڑے ائرپورٹ پر نظر نہیں آیا کیا قصہ ہے' آپ کی نظر کمزور تو نہیں ہے؟"

"ہے تو مگر میں عینک لگاتا ہوں۔ یہ دیکھئے ناک پر رکھی ہے۔"

"میرا خیال ہے اسے آپ صرف ناک پر رکھنے کے لئے ہی استعمال کرتے ہیں۔"

دیکھنے کے لئے نہیں۔"

ننھا کی ناراضی بھی بجا تھی۔ وہ بے چارے کراچی سے ایک لمبی مسافت طے کر ٹورنٹو کے ائرپورٹ پر پہنچے تو وہاں انہیں ریسیو کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ تو شکر ہے ان کے پاس ہم لوگوں کا پتا موجود تھا اور انہیں ائرپورٹ پر ایک پاکستانی بھی مل گئے جنہوں نے ان کو ہمارے اپارٹمنٹ بلڈنگ تک پہنچا دیا۔ بڑی مشکل سے جاوید چودھ نے انہیں یقین دلایا کہ وہ واقعی ائرپورٹ گئے تھے۔ ہوا یہ کہ ننھا کو باہر نکلنے میں کچھ ہو گئی اور وہ مایوس ہو کر پہلے ہی چلے آئے۔ مگر اب جاوید چودھری کے پریشان ہونے باری تھی۔ انہوں نے ننھا صاحب کے لئے بلڈنگ میں ایک اپارٹمنٹ حاصل کرنے لئے بات کرلی تھی مگر جب وہ نہیں پہنچے تو سوچا کہ بلاوجہ کرایہ ضائع کرنے کی کیا ضرور ہے جب آجائیں گے تو اپارٹمنٹ لے لیں گے' مگر اب عمارت میں کوئی اپارٹمنٹ خا نہیں تھا۔ انہوں نے ننھا کو دعوت دی کہ فی الحال میرے ساتھ رہ جائیں' صبح یا اگلے د اپارٹمنٹ مل جائے گا۔

ننھا کہنے لگے "معاف کیجئے کیا اس سائز کا آدمی کسی کے ساتھ رہتا ہوا اچھا لگے گا اور پھر میں اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہوں تھکا ہوا ہوں مکمل آرام کروں گا۔"

"چھوڑو یار کوئی پیدل چل کر تو نہیں آئے ہو۔ میرے اپارٹمنٹ میں بھی مکمل آرام ملے گا۔"

"جی نہیں میں آپ سے ناراض ہوں۔ اس وقت تو معاف ہی رکھیں۔"

ننھے کا سامان جاوید صاحب کے اپارٹمنٹ میں پہنچا دیا گیا اور جاوید صاحب اپ سامان لے کر شاہ جی کے اپارٹمنٹ میں پہنچ گئے۔ منیجر صاحب کو شاہ جی نے فون کیا تو انہوں نے فوراً کسی اور کا اپارٹمنٹ ننھا کے حوالے کر دیا اور کہا جن صاحب سے وعدہ ک ہے اگر وہ آجائیں تو میں کچھ دیر کے لئے انہیں اپنے کمرے میں رکھ لوں گا۔ ننھا صاحب کے رہنے کا بندوبست ہو گیا اور کافی وغیرہ پی کر ان کا مزاج بھی ٹھکانے پر آگیا تو ان کی ساری تھکان غائب ہو گئی بجائے کمرے میں جا کر سونے کے انہوں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ پھر اپنی شوٹنگ کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ پرویز صاحب نے فوراً اسکرپٹ کی ایک کاپی ان کے حوالے کر دی اور تفصیل کے ساتھ مختلف سینوں کے بارے میں بتایا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ننھا نے اس فلم میں ایک خالص روائتی پٹھان بزرگ کا کردار ادا کیا ہے جو اپنے اکلوتے بیٹے کی خاطر صوبہ سرحد میں اپنا آبائی گاؤں چھوڑ کر ٹورنٹو چلا آیا ہے گاؤں میں اس کا کوئی رشتہ دار باقی نہیں رہا تھا ادھر بیٹا تقاضے کر رہا تھا چنانچہ خان صاحب چلے آئے۔ یہاں آکر دیکھا کہ بیٹے نے امریکن لڑکی سے شادی کرلی ہے اور ان کا نوعمر پوتا انگریزی کے سوا کوئی زبان نہیں بول سکتا۔ خان صاحب تو بیٹے اور پوتے کی محبت میں کھنچے چلے آئے تھے مگر یہاں پوتا اور بہو ان کی زبان ہی نہیں سمجھتے تھے۔ نہ ہی ان کی بات خان صاحب کے پلے پڑتی تھی۔ پھر جب مغرب کے طور طریقے دیکھے تو خان صاحب پہلے سے بھی زیادہ تنہا اور دکھی ہو گئے۔ گاؤں کے دوست اور ساتھی ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ وہ محفلیں' وہ چوپال کی گپ شپ وہ پیار اخلاص اور میل جول ٹورنٹو میں کہاں نصیب تھا مگر مشکل یہ تھی کہ بیٹا ٹورنٹو چھوڑ کر وطن واپس جانے پر آمادہ نہ تھا اور خان صاحب بیٹے اور پوتے کے بنا رہ نہیں سکتے تھے یہ ذہنی کشمکش تھی جس سے وہ دو چار تھے۔ گھر میں بہو کو جینز' قمیض اور ننگی پنڈلیوں والا اسکرٹ پہنے دیکھتے تھے تو خون کھول اٹھتا تھا مگر کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ اور بولتے بھی تو فائدہ کیا تھا۔ بہو تو ان کی گفتگو کا ایک لفظ تک نہیں سمجھتی تھی۔ یہی عالم پوتے کا تھا۔ بیٹا غریب درمیان میں پس رہا تھا۔ ایک طرف مغرب کے فائدے اور چمک دمک تھی اور بیوی کا وہاں رہنے پر اصرار۔ دوسری طرف باپ کی محبت اور وطن کی کشش تھی۔ غریب چکی کے دو پاٹوں کے درمیان کچل کر رہ گیا تھا۔ ننھا صاحب کے ملبوسات' پگڑی' کلاہ' پشاوری چپل اور دوسری چیزیں پہلے ہی آچکی تھیں۔ یہاں تک کہ نسوار کی ڈبیہ تک سامان میں موجود تھی مگر جب خان صاحب نے نسوار کی ڈبیہ جیب سے نکالی تو بیٹے کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے لالہ کو سمجھایا کہ یہاں پر تھوکنا بہت بڑا جرم ہے خان صاحب مزید دکھی ہو گئے کہنے لگے "بابا یہ کیسا عجیب سرزمین ہے جدھر تھوکنے پر بھی پابندی ہے۔"

ننھا کافی دیر تک پاکستان کی باتیں اور تازہ ترین خبریں سناتے رہے۔ دیار غیر میں جا کر یہ باتیں بے حد دلکش لگتی ہیں ہم لوگوں کو پاکستان چھوڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا تھا جیسے برسوں سے ملک سے جدا ہیں۔ وہاں کی ہر خبر

نئی اور انوکھی لگ رہی تھی۔ اتنی دیر میں برابر والے اپارٹمنٹ سے پرویز صاحب کی بچی نادیہ اور ہماری پارو بھی آ گئیں۔ ننھا میں دونوں کو دلچسپی تھی اور ننھا کو بھی بچوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ننھا یہ سن کر حیران رہ گئے کہ دونوں بچیاں ٹیلی ویژن دیکھنے کے لئے دوسرے اپارٹمنٹ میں جاتی ہیں جب کہ خود اپنے گھر میں بھی ٹی وی موجود ہے۔

پارو نے کہا ”انکل ہم بتائیں؟“

”ہاں ہاں بتاؤ بیٹے۔“

”انکل بات یہ ہے کہ یہاں سب بڑے لوگ ہوتے ہیں کوئی بھی کارٹون نہیں دیکھتا سب ہی بڑے لوگوں کے پروگرام دیکھتے رہتے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہتے رہتے ہیں بیٹے اب تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔ یہ سین تمہارے مطلب کا نہیں ہے تو پھر ہم کیا کریں؟“

ان کی شکایت پر ننھا صاحب دیر تک غور کرتے رہے مگر اس مسئلے کا کوئی حل تلاش نہیں کر سکے۔ بچیوں کی شکایت بالکل بجا تھی۔ وہ دونوں اس قدر ٹرینڈ ہو گئی تھیں کہ اگر ہم سب ٹی وی دیکھنے میں محو ہو کر انہیں دوسرے کمرے میں جانے کی ہدایت دینا بھول جاتے تو وہ خود ہی ایک دوسرے کو اشارہ کرتیں اور اٹھ کر چلی جاتی تھیں

اگلے دن ٹورنٹو کے بارونق پلازہ کے سامنے شوٹنگ کا پروگرام تھا یہ ڈاؤن ٹاؤن علاقہ تھا یعنی شہر کا دل، بہت خوب صورت اور گہما گہمی والا علاقہ تھا۔ جس پلازہ میں شوٹنگ ہونی تھی وہاں جا بجا خوب صورت فوارے لگے ہوئے تھے۔ سبزہ زار تھے اور پھولوں کے تختے ماحول کے حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔ مگر اس سے بھی زیادہ حسین وہ لوگ تھے جو بے فکری سے ادھر ادھر گھوم رہے تھے یا گھاس کے تختوں پر دراز یا نیم دراز گپ شپ اور پیار محبت میں مصروف تھے۔ منظر یہ تھا کہ ندیم اور شبنم بھی اس پلازہ میں آتے ہیں اور ان لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک جانب فوارے کے نزدیک بیٹھ جاتے ہیں۔ پرویز صاحب نے شاہ جی کو بتایا کہ وہ دونوں کہاں کہاں سے گزریں گے اور کس جگہ جا کر بیٹھیں گے۔ شاہ جی نے کیمرے کے اندر جھانک کر دیکھا اور پھر پرویز صاحب سے بولے ”سر یہ شاٹ تو سنسر ہو جائے گا۔“

”مگر کیوں، اس میں کون سی قابل اعتراض بات ہے؟“

”بات نہیں باتیں ہیں سر! آپ خود ویو فائنڈر سے دیکھ لیجئے۔“

اب جو پرویز صاحب نے دیکھا تو واقعی پریشان ہو گئے۔ ہم نے کہا ”آخر کیا بات ہے اس شاٹ میں۔ بالکل معصوم اور بے ضرر شاٹ ہے بلکہ اس کے بعد والا سین بھی بالکل سیدھا سادا ہے۔“

پرویز صاحب نے کہا ”مگر آپ نے یہ دیکھا ہے کہ ہر طرف نیم عریاں لباسوں میں لڑکیاں بیٹھی اور لیٹی ہوئی ہیں اور ایسی حرکتیں بھی کر رہی ہیں جو انتہائی قابل اعتراض ہیں۔“ اتنے میں ننھا صاحب پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے ٹہلتے ہوئے آئے اور ہماری طرف دیکھ کر پرویز صاحب سے بولے ”میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔“

”کس بات کی؟“

”آپ کی فلم غالباً پہلی پاکستانی فلم ہو گی جسے صرف ”بالغوں کے لئے“ کا سرٹیفکیٹ ملے گا۔“

شاہ جی نے مشورہ دیا ”سر کیوں نہ ہم کیمرے کا زاویہ بدل لیں۔“

”مثلاً؟“ پرویز صاحب نے پوچھا۔

”مثلاً یہ دیکھئے“ انہوں نے کیمرے کا رخ دوسری جانب پھیر دیا۔ ویو فائنڈر میں جھانک کر دیکھا اور پھر کہا ”سوری“ اس کے بعد انہوں نے کیمرا دوسری جانب گھما دیا مگر وہاں جہاں انسان نظر آ رہے تھے وہاں وہاں اسی قسم کے مناظر دیکھنے میں آ رہے تھے۔ آخر تنگ آ کر بولے ”یہ بہت مشکل معاملہ ہے میں تو کہتا ہوں کہ اسے سپرد خدا کر دیجئے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ یا تو ان بازاروں اور سڑکوں پر شوٹنگ کرنے کا ارادہ بدل دیجئے یا پھر پاکستان واپس جا کر سنسر کوڈ تبدیل کرا دیجئے۔“

پرویز صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ ننھا کہنے لگے ”کیوں صاحب، آپ کیسے مسلمان ہیں کہ کیمرے کا اخلاق سنوارنے کی تو آپ کو فکر ہے مگر ہمارے اخلاق کی کوئی پروا نہیں ہے ہم لوگوں کو آپ آنکھیں بند کر کے سوچے سمجھے بغیر اس فرنگستان میں لے آئے ہیں۔ سب دن رات ایسے مناظر دیکھیں گے تو گھر والوں کو واپس جا کر کیا جواب دیں گے؟“

”میرا خیال ہے گھر واپس ہی نہ جاؤ۔“ یہ واجد صاحب کا مشورہ تھا ”یہیں گھر بسا لو

گرین کارڈ بھی مل جائے گا۔"

"آئیڈیا برا نہیں ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولے "تو پھر آپ کوئی مناسب سا رشتہ ڈھونڈ دیں مگر سائز وائز کا ذرا خیال رکھیں۔"

شاہ جی صورت حال کے بارے میں کافی فکر مند تھے یکایک خوشی سے مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور بولے "سر میں نے ایک کونہ ڈھونڈ لیا ہے جہاں کم بے شرم لڑکیاں اور نہایت شریف قسم کے لڑکے بیٹھے ہوئے ہیں۔"

وہ ہم سب کو باغ کے ایک گوشے میں لے گئے۔ یہاں ایک دوشیزہ شریفانہ قسم کا اسکرٹ پہنے ہوئے دوزانو بیٹھی تھیں اور ان کے نزدیک ایک نوجوان لڑکا بیٹھا آئس کریم کھا رہا تھا۔

"بتایئے اس میں کیا کمی ہے؟"

"کمی یہ ہے کہ ایک آئس کریم لڑکی کو بھی خرید کر دو۔ باقی سب اوکے ہے۔"

فوراً ندیم اور شبنم کو بھاگم بھاگ اس گوشے میں پہنچنے کی ہدایت کی گئی اور شاہ جی نے شاٹ ارینج کرنا شروع کر دیا۔ لڑکے اور لڑکی نے جب اپنے ارد گرد اس قسم کی نامانوس سرگرمیاں دیکھیں تو وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی۔ اس طرح پرویز صاحب کا ایک آئس کریم کا خرچ بچ گیا اور ماحول بھی "سنسر زدہ" ہو گیا۔ ندیم اور شبنم کا سین فلمانے کے بعد آس پاس کے بازاروں، فواروں اور اونچی اونچی عمارتوں کی کچھ فلم بندی کی گئی اس اثنا میں ندیم، شبنم اور ننھا بڑے مزے سے چاروں طرف گھومتے رہے۔ بیرونی ملکوں میں فلموں کی شوٹنگ کرنے کا ایک سب سے بڑا فائدہ اداکاروں کو یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی آزادی سے جہاں چاہے گھومتے پھرتے ہیں اور لوگوں کا ہجوم میں گھر جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اگر اکا دکا اپنے ملک کے لوگ ملتے بھی ہیں تو وہ زیادہ پریشان نہیں کرتے۔ ٹورنٹو کی سڑکیں، گلیاں اور بازار پھولوں سے آراستہ تھے۔ مغربی ملکوں میں بازاروں اور سڑکوں کے کنارے بھی خوب صورتی سے پھولوں کو سجانے کا اہتمام کیا جاتا ہے حالانکہ ہمارے ہاں تو اب باغوں میں بھی پھول معدوم ہوتے جا رہے ہیں ان کی جگہ دھول نے لے لی ہے۔ پتا نہیں ہم اپنے شہروں کے دشمن کیوں ہو گئے ہیں۔ کراچی کسی زمانے میں کس قدر صاف ستھرا اور خوب صورت شہر تھا بعض علاقوں؛

پ کے کسی شہر کا گمان گزرتا تھا۔ لوگوں کو بھی شہریت کا شعور تھا۔ تہذیب کا پاس تھا
نہ رفتہ کراچی کا جو حال ہو گیا وہ ہم سب دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں بولتے۔ یہی حال
شہر کا ہے۔ کیسا خوب صورت اور حسین شہر تھا۔ سڑکوں کے کنارے اونچے اونچے
اور اور خوب صورت درخت، سبزہ زار، پھولوں کے تختے، صاف ستھری سڑکیں،
کا اپنا ایک مخصوص حسن تھا مگر اب یہ شہر گندگی اور غلاظت کا ڈھیر بن کر رہ گیا
ٹوٹ پھوٹ کا یہ عالم ہے کہ بعض حصوں پر تو یہ گمان گزرتا ہے جیسے خدانخواستہ
بمباری ہوئی ہے کیا ہمیں اپنے شہروں سے محبت نہیں رہی؟ یہ اعلان سن سن کر تو
پک گئے ہیں کہ لاہور کو ایشیا کا پیرس بنا دیا جائے گا مگر ہوا یہ ہے کہ ہم نے اسے
غلیظ ترین ملبے کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہم ٹورنٹو کی صاف شفاف، حسین و جمیل،
ے سجی ہوئی سڑکوں اور در و بام کو دیکھ رہے تھے اور اپنے شہروں کی زبوں حالی کو
رہے تھے۔

واجد صاحب جو کوئی چیز خریدنے کے لئے سامنے کے اسٹور میں گئے تھے جب وہاں
برآمد ہوئے تو ان کے ہمراہ ایک نہایت خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی تھی۔ ننھا
تو یہ نظارہ دیکھ کر مچل گئے اور ضد کرنے لگے کہ میں بھی اس اسٹور میں جاؤں گا۔
پوچھا "کیا خریدو گے؟"
بولے "دیکھا نہیں کیسی اچھی لڑکیاں ملتی ہیں۔ مناسب قیمت ہو گی تو ڈھیر ساری
ر اپنے ساتھ لے جائیں گے اور جاننے والوں کو تحفے میں دیں گے۔ دراصل میں
ستوں اور رشتے داروں کو قمیص، پتلون، ٹائیاں، موزے اور سوئیٹر دے کر
کیا ہوں۔ یہ ذرا نئی چیز ہو گی۔ کیوں کیا خیال ہے؟"
اتنے میں واجد صاحب نزدیک آ گئے۔ اب جو قریب سے دیکھا تو سبھی رعب میں
نہایت خوب صورت دلکش لڑکی تھی۔ شربتی رنگ کے بال، سنہری اور روپہلی چہرے
لت، جسم ایسا سبک اور متناسب کہ ہالی ووڈ کی اداکارائیں بھی دیکھ لیں تو رشک
گیں۔ ہم آپ کو پہلے بھی بار ہا بتا چکے ہیں اور بار بار یاد دہانی کرانا چاہتے ہیں کہ
جمال کی مغربی ملکوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ ایسی ایسی خوب صورت، پری جمال
جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں کہ دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ معمولی معمولی ملازمتیں کرتی

ہیں۔ ریستورانوں میں ویٹریس کے فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ خاصے مشکل اور م طلب کام کرتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مغرب والے اتنے سنگدل کیوں ہیں کہ ا حسیناؤں کی قدر نہیں کرتے۔ اگر یہ ہمارے ملک میں آجائیں تو بڑے بڑے افسرا وڈیروں اور جاگیرداروں کی بیگمات بن جائیں اور ان پر دولت کی بارش ہونے لگے مگر اسی حال میں مگن ہیں۔ یہ بھی دیکھا کہ انتہائی پری پیکر لڑکی کا بوائے فرینڈ اس قدر بد ش کہ اگر اندھیرے میں نظر پڑ جائے تو بچے ڈر کر چلانے لگیں' مگر وہ بڑے پیار اور اخلا سے ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتی پھرتی ہیں۔ ذرا جو شرمندہ ہو جائیں۔ پتا نہ یورپ اور امریکہ کے حسین اس قدر کور ذوق کیوں ہیں؟ واجد صاحب لڑکی کو لے کر لوگوں کے نزدیک آگئے۔ لڑکی جینز اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ جینز کے پائنچے اس۔ پنڈلیوں سے بھی اوپر تک چڑھا رکھے تھے۔ کاندھے سے ایک بڑا سا بیگ لٹک رہا تھا۔ ن جی پوچھنے لگے "ہمارے ملک میں لڑائی جھگڑا کرنا ہو تو لوگ آستینیں چڑھا لیتے ہیں مگر یہا عورتیں پتلون کے پائنچے کس لئے چڑھاتی ہیں؟"

اس ٹیکنیکل سوال کا جواب دینے سے پہلے ہی واجد صاحب اس فرنگی حسینہ ک ہمراہ بالکل ہی قریب آگئے اور تعارف کرانے لگے۔

ننھا کہنے لگا "تعارف چھوڑیں پہلے یہ بتائیں کہ ریٹ کیا ہے؟"

پہلے تو واجد صاحب سمجھے نہیں بعد میں کچھ غور کیا تو سمجھ گئے اور ننھا صاحب گھورنے لگے بولے "مجھے افسوس ہے کہ آپ کی عقل بھی آپ کے جسم جیسی ہے ارے بندہ خدا یہ تو ویریٹا ہے۔"

"ویریٹا؟ کون سی والی؟"

"بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"وہ تو نظر آرہا ہے۔"

"اخلاق و عادت کی بھی بہت اچھی ہے۔ میں نے اسے راضی کر لیا ہے۔"

"اتنی جلدی؟ مطلب یہ کہ دکان کے اندر جاتے ہی راضی کر لیا؟ اس کا مطلب ت ہے کہ اب ہم لوگوں کو قاضی ڈھونڈ کر لانا پڑے گا۔" ننھا واقعی فکر مند نظر آنے لگا۔

واجد صاحب ہنس پڑے "کبھی کام کی بات بھی کر لیا کرو۔ پرویز صاحب کے کہنے ت

ں ایک آرٹسٹ تلاش کر کے لایا ہوں۔"

یہ حقیقت بھی تھی۔ ننھا کی امریکن بہو کا کردار کرنے کے لئے ایک لڑکی درکار ی۔ ویریٹا ایک خوش شکل اور خوب صورت لڑکی تھی۔ ہم سب کو فوراً پسند آگئی۔

ننھا نے کہا "صورت دیکھتے ہی آپ لوگ لٹو ہو گئے۔ اس کی سیرت بھی تو دیکھئے۔ ے ایکٹنگ ویکٹنگ بھی آتی ہے یا نہیں؟"

ویریٹا نے زندگی میں پہلے کبھی ایکٹنگ نہیں کی تھی۔ وہ دراصل ایک امریکن لڑکی تھی۔ فلوریڈا میں پیدا ہوئی تھی۔ اٹھارہ برس کی ہوئی تو رواج کے مطابق گھر چھوڑ کر نیویارک چلی گئی۔ وہاں ایک آرٹ گیلری میں مہمان داری کے فرائض سرانجام دیتی رہی پھر ایک ریستوران میں ویٹریس ہو گئی۔ وہاں سے دل اکتایا تو ایک جیولر کی دکان پر سیلز گرل ہو گئی۔ مختصر یہ کہ اس نے دس بارہ قسم کی نوکریاں کیں مگر ان میں ایک بھی ڈھنگ کا کام نہ تھا۔ ہم سب حیران ہو کر اس لڑکی کا سراپا دیکھ رہے تھے جو دیکھنے میں واقعی پری لگتی تھی مگر اپنے حسن کے بل بوتے پر کوئی اچھا سا کام یا اچھا سا شوہر تلاش نہیں کر پائی تھی بعد میں وہ قسمت آزمائی کے لئے کینیڈا چلی آئی۔ پہلے مانٹریال گئی' وہاں فرانسیسی زبان سے تنگ آ کر ٹورنٹو آ گئی۔ اب وہ کسی تعمیراتی کمپنی میں ریسپشنسٹ تھی جہاں تک ویریٹا کی دوسری خوبیوں کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ بجا مگر ہمارا یہ خیال نقش بر آب ثابت ہوا کہ وہ اب تک اپنے لئے اچھا شوہر تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔ جب اس کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہوئیں تو ویریٹا تو چھپی رستم بلکہ "چھپی رستمہ" نکلی اتنی کم عمری میں اس کے شادی کے تجربات ہمارے ہاں کے بڑے بوڑھوں کو شرمندہ کرنے کے لئے کافی تھے۔ مثلاً پہلی بات تو یہ ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر میں فلوریڈا میں اپنا گھر چھوڑنے سے پہلے ہی وہ ایک عدد بچے کی ماں بن چکی تھی۔ گھر والوں کو اس کے ماں بننے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اعتراض یہ تھا کہ وہ پہلے اپنی تعلیم تو مکمل کر لیتی' مگر تعلیم کا اسے کچھ زیادہ شوق نہیں تھا اور بچوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے اس نے اپنے ایک ماہ کے بچے کو ایک "ہوم" میں داخل کر دیا اور خود نیویارک چلی گئی۔ اسے آپ نوزائیدہ بچوں کا یتیم خانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو مائیں اپنے بچوں کو یہاں وہاں چھوڑ جاتی ہیں ان

معصوموں کو ایسے ہی مقامات پر ٹھکانہ نصیب ہوتا ہے اور یہ یتیم خانے ہی ان کے لئے ماں کی آغوش کا کام دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امریکن ایک دوسرے سے بے گانہ اور قطعی غیر جذباتی قوم ہیں۔ ویریٹا نیویارک پہنچ کر بھی نچلی نہیں بیٹھی۔ پہلے تو اس نے ایک ہوٹل کے ویٹر سے دوستی کی اور پھر ایک ٹیکسی ڈرائیور سے شادی کر لی۔ دو ماہ بعد دوستی تو قائم رہی مگر شادی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد وہ مختلف اوقات میں لوگوں سے دوستیاں اور شادیاں کرتی رہی۔ اس کی شادیوں کی تعداد پانچ سے زیادہ تھی۔ دوستیاں ان گنت تھیں۔ اس وقت بھی اس کی ایک نوجوان سے منگنی ہو چکی تھی اور وہ دونوں ساتھ رہتے تھے۔ اگلے روز جب ویریٹا کی شوٹنگ شروع ہوئی تو اس نوجوان کی جھلک بھی دیکھنے میں آئی وہ ویریٹا سے اس کا اس روز وصول ہونے والا معاوضہ لے کر رخصت ہو گیا۔ عجیب ہونق قسم کا آدمی تھا۔ ویریٹا کے لائق تو کسی طور پر بھی نہیں تھا مگر ویریٹا کو پسند تھا تو ہم اور آپ کیا کر سکتے ہیں۔

ویریٹا بہت ذہین اور حسین لڑکی تھی۔ ہمارے ملک میں ہوتی تو کسی وڈیرے یا صنعت کار کی پانچویں چھٹی بیوی ضرور بن جاتی۔ واجد صاحب نے اس سے ضروری بات چیت کی۔ وہ بے تکلفی سے جواب دیتی رہی۔ اسے اداکاری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی زیادہ دلچسپی وصول ہونے والے معاوضے سے تھی۔ پرویز صاحب نے اسے مختصر طور پر کہانی اور ذرا تفصیل کے ساتھ خود اس کا کردار سنایا اور ننھا صاحب سے بھی ملایا کہ یہ ہمارے فادر ان لاء ہوں گے۔ اداکار اعجاز جو پاکستان سے امریکہ اور کینیڈا گئے تھے۔ وہاں ہمیں مل گئے تھے اور ننھا کے بیٹے کے کردار کے لئے ان کا انتخاب کر لیا گیا تھا۔ اعجاز سے کہیں آپ اعجاز درانی نہ سمجھ لیجئے گا۔ ارے صاحب اس غریب اعجاز کی ایسی قسمت کہاں۔ حالانکہ صورت شکل' تعلیم اور رکھ رکھاؤ میں یہ اعجاز' اعجاز درانی سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھا۔ مگر قسمت کا ہیٹا تھا اس لئے زندگی بھر چھوٹے موٹے کردار کر کے گزارہ کرتا رہا۔ ثابت ہوا کہ محض نام سے کچھ نہیں ہوتا ساتھ میں تقدیر بھی بنوا کر لانی چاہئے۔

اپارٹمنٹ کی سب سے اوپر کی منزل پر ایک کونے والا بڑا سا اپارٹمنٹ جاوید چودھری صاحب کا دفتر بھی تھا اور گھر بھی۔ اسے فلم کا صدر مقام سمجھ لیجئے۔ دو دن بعد

اس اپارٹمنٹ میں ننھا ان کے بیٹے' پوتے اور بہو کے سین فلمائے گئے۔ ہم لوگوں
خیال تھا کہ شاید ویریٹا کی وجہ سے پریشانی ہوگی۔ مگر وہ تو غضب کی اداکارہ نکلی۔ ایک
بتانے سے مکالمے یاد کرلیا کرتی تھی اور کیمرے کی ہیبت کو جانے اس کی بلا' پہلے ہی شا
میں اس نے بڑی بے تکلفی سے اپنے شوہر کے ساتھ مکالمے بولے اور اپنے کمسن بیٹے'
دادا کی صحبت سے بچنے کی ہدایت کی۔ وہ اس قدر قدرتی اور حقیقی اداکاری کر رہی تھی
سب حیران رہ گئے۔ البتہ اسے یہ آسانی ضرور تھی کہ وہ اپنی زبان یعنی انگریزی میں
مکالمے ادا کر رہی تھی۔ مگر اس کی اداکاری کا بے ساختہ پن حیرت انگیز تھا۔ وہ سیٹ
موجود سب لوگوں سے فوراً بے تکلف ہو گئی۔ ننھا صاحب کے ساتھ تو اچھی خاصی گپ
شپ بھی ہوا کرتی تھی۔ ننھا نے پرویز صاحب سے کہا "آپ نے جیسی لڑکی میرے بیٹے کی
بیوی بنائی ہے اسے دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ایسی بیوی کو چھوڑ کر
پاکستان چلا جائے تو اس سے بڑا احمق اور کوئی نہ ہو گا۔"

ننھا کے پوتے کا کردار جاوید چودھری کا چھ سالہ بیٹا ادا کر رہا تھا۔ اس کا رنگ گورا
بال سنہری' اور آنکھیں ہری تھیں۔ وہ کینیڈا میں ہی پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا تھا اس لئے
پورا یوروپین لگتا تھا۔ انگریزی کا لب ولہجہ بھی خالص امریکی تھا۔ اداکاری میں بھی وہ کسی
سے کم نہیں تھا۔ کیمرے کے سامنے یوں آیا جیسے وہ ایک بالکل بے حیثیت چیز ہے۔ کسی
نے ننھا سے کہا "یہ بچہ تو آپ کو خاطر ہی میں نہیں لا رہا۔"

وہ بولے "یہ تو کیمرے کو بھی کچھ نہیں سمجھتا بھلا مجھے کیا سمجھے گا؟"

اس گھر میں چند بے حد دلچسپ مناظر فلمائے گئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ کوئی کسی کی زبان
نہیں سمجھتا تھا ننھا کی پشتو زدہ اردو بہو اور پوتے کے پلے نہیں پڑتی تھی اور ان دونوں کی
امریکن انگریزی ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر غلط فہمی پیدا ہو
جاتی تھی۔ بیٹا بے چارہ مترجم کے فرائض ادا کرتے ہوئے تھک گیا تھا۔ یوروپین لوگوں میں
یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ عام زندگی میں بھی جس طرح بولتے جاتے ہیں اس پر بھی اداکاری کا
ہی گمان ہوتا ہے اس لئے انہیں اداکاری کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

پہلے خیال تھا کہ ساحل پر بھی کچھ شوٹنگ کی جائے مگر جب ایڈوانس پارٹی ساحل کا
جائزہ لینے کے لئے بھیجی گئی تو لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے واپس آئے "توبہ توبہ۔ اتنی

بے شرمی اور بے حیائی کی انتہا نہیں رہی ہے۔"

"کیوں بھئی کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا وہاں تو نہانے اور تیرنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہو رہا؟"

"صاف ظاہر ہے ساحل پر نہانے اور تیرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"ان کا لباس بہت خراب ہے جی بلکہ دیکھا جائے تو سرے سے لباس ہے ہی
نہیں۔ بہت سی عورتیں تو بالکل بے لباس ہیں۔ اب بتائیے کہ وہاں کیا شوٹنگ کی جائے
اور سنسر والوں کی آنکھوں پر پٹی باندھی جائے جس طرف دیکھئے بے ہودگی کے سوا کچھ نظر
نہیں آتا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ عریانی نظر آتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھے آپ' کوئی عریانی سی عریانی ہے۔"

چنانچہ ساحل پر شوٹنگ کرنے کا خیال ترک کر دیا گیا۔ واجد صاحب نے فوری طور
پر ایک اور تجویز پیش کر دی۔ ٹورنٹو میں نمائش گاہ کے بالکل سامنے جھیل ہے جس کے
کنارے پر بہت خوب صورت اور کشادہ باغ اور سبزہ زار ہے۔ اس باغ میں جا بجا مختلف
قسم کے اسلحہ رکھے ہوئے ہیں مثلاً ایک چھوٹا سا ہوائی جہاز کھڑا ہے۔ ایک جانب بہت
بڑی توپ رکھی ہوئی ہے کسی طرف بحری جہاز کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح کچھ اور آلات
حرب بھی سجے ہوئے ہیں۔ دراصل یہ بچوں کے لئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ وہ کھیل ہی
کھیل میں ان ہتھیاروں کے بارے میں بھی جان لیں۔ سامنے حد نظر تک جھیل کا نیلا پانی
ہے جس میں بادبانی کشتیاں تیرتی ہوئی بہت خوب صورت لگتی ہیں۔ کبھی کبھی کوئی پیراکی
کرنے والا بھی نظر آجاتا ہے۔ واٹر سکی انگ بھی یہاں ہوتی رہتی ہے۔ مختصر یہ کہ بہت
خوب صورت تفریح گاہ ہے۔ باغ کے ایک گوشے میں جھولے وغیرہ بھی لگے ہوئے ہیں۔
اتنی خوب صورت لوکیشن کا پہلے کسی کو خیال کیوں نہیں آیا؟

اس باغ کے سامنے بہت کشادہ سڑک ہے اور سڑک کے دوسری جانب نمائش گاہ'
یہاں ہر سال نمائش لگتی ہے بلکہ عام طور پر لگی ہی رہتی ہے۔ ہمارے سامنے بھی وہاں
نمائش لگی ہوئی تھی۔ نمائش میں بچوں اور بڑوں سب کی تفریح کا سامان تھا۔ ہر روز بڑے
بڑے خوب صورت فلوٹ مارچ کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ بینڈ باجے بج رہے ہیں رنگین

غبارے فضا میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ خوب صورت نو خیز لڑکیاں رنگ برنگی یونیفارم پہنے ہوئے سامنے مارچ پاسٹ کرتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ ہر طرف خوشی اور بے فکری کا سماں ہے۔ جسے دیکھئے ہنس رہا ہے' مسکرا رہا ہے' شور مچا رہا ہے اور مختلف قسم کے کھیلوں میں حصہ لے رہا ہے۔ ایسے ماحول میں کوئی اپنے غم و آلام یاد نہیں رکھ سکتا۔ دکانوں پر مختلف قسم کی چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ ہر طرح کے کھیل تماشے موجود ہیں اور ان سب سے بڑھ کر سیاحوں اور مقامی سیربینوں کی ریل پیل' عجیب و غریب انوکھے مگر دلکش لباس ہر رنگ اور نسل کے لوگ' یہ نمائش گاہ صحیح معنوں میں ایک تفریح گاہ ہے۔ پرویز ملک نے نمائش میں تو شوٹنگ نہیں کی مگر جھیل کنارے والے باغ میں شبنم' ندیم اور پھر ندیم اور ان کے فلمی صاحب زادے کے کچھ مناظر فلمائے۔

ایک سین تو ایسا ہے کہ ندیم اپنے بچے کو سیر کرانے باغ میں لاتے ہیں اور وہ سوالات کر کے ان کا دماغ خراب کر دیتا ہے۔ وہ پوچھنا چاہتا ہے کہ ہم لوگ اپنے وطن کیوں نہیں واپس جاتے۔ ندیم جھلا کر کہتا ہے "ارے بے وقوف تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ یہ جو کچھ تمہیں یہاں نظر آ رہا ہے پاکستان میں نظر آتا ہے۔ یہ خوب صورت علاقے' اونچی اونچی عمارتیں' صاف شفاف کشادہ سڑکیں' تفریح گاہیں' شاندار شاپنگ پلازہ ایسا کچھ بھی پاکستان میں نہیں ہے۔"

خرم کہتا ہے "پاپا آپ بھی تو نہیں سمجھتے کہ یہ سب چیزیں آپ کی نہیں ہیں ان پر آپ کا کوئی حق نہیں ہے آپ تو یہاں مہمان ہیں اگر آپ کسی کے عالیشان گھر میں مہمان جائیں تو کیا وہاں کی سب چیزیں آپ کی بن جائیں گی۔ آپ کا گھر اس کے مقابلے میں چھوٹا اور خراب سہی مگر وہ آپ کا اپنا گھر تو ہے نا۔"

اسی جھیل کنارے ندیم اور خرم پر ایک گانے کا کچھ حصہ بھی فلمایا گیا۔ یہ قصہ یہ ہے کہ خرم اپنے پاپا کو وطن واپس چلنے کے لئے بہت دلیلیں پیش کرتا ہے اور پھر گانا بھی گاتا ہے۔

چلو چلیں پاپا ہم اپنے پاکستان میں

اب منظر یہ ہے کہ پاپا بیٹے کی بات نہیں سننا چاہتے وہ آگے آگے ہیں اور بیٹا ان کے پیچھے پیچھے۔ پھر اسی روز ندیم شبنم اور خرم کے کچھ سین اس پُر فضا مقام پر فلمائے

گئے۔ اس روز موسم بہت خوشگوار تھا چمک دار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے۔ جھیل اور اس کے آس پاس کا سماں بھی انتہائی دلفریب تھا۔ وہاں کے رہنے والوں کے لئے یہ مقامی موسم تھا۔ کینیڈا میں یوں تو گرمی بھی ہوتی ہے مگر یہاں آٹھ نو مہینے سردی پڑتی ہے۔ برف گرتی ہے شدید بارش ہوتی ہے آسمان پر بادل چھائے رہتے ہیں۔ ویسے تو ان لوگوں نے موسم سرما میں اپنے سارے کام معمول کے مطابق جاری رکھنے کا طریقہ ڈھونڈ لیا ہے اور خوب مزے سے سردیوں کا موسم گزارتے ہیں مگر سرد موسم کی سختیاں اپنی جگہ قائم رہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جب بہار اور گرما کا موسم آتا ہے تو ان لوگوں کی عید ہو جاتی ہے۔ ایسے موسم میں کوئی بھی گھر کے اندر بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔ باہر گھومتے پھرتے ہیں' تفریح گاہوں میں جاتے ہیں۔ یہی وہ موسم ہے جس میں خواتین کو کم سے کم لباس پہننے کے مواقع نصیب ہوتے ہیں اور وہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہیں ورنہ سردی کے موسم میں اگر یہ لباس آزمائیں تو نمونئے کا شکار ہو کر دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹا لیں۔ مرد بھی کچھ پیچھے نہیں رہتے۔ مرد اگر محض نیکر' جانگیا پہن کر گھومیں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر خواتین بھی ان کے مقابلے میں آجائیں تو پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔

چنانچہ جھیل کنارے بھی ان دنوں خوب رونق تھی۔ جسے دیکھئے کم سے کم لباس پہننے کے مقابلے میں شریک ہونے کے لئے گھر سے نکل آیا تھا۔ کیا مرد' کیا عورت' کیا جوان' کیا بوڑھا' بلکہ بچے تک ننگ دھڑنگ پھر رہے تھے۔ مگر آسانی یہ تھی کہ جھیل کا کنارہ دور تک پھیلا ہوا تھا اور بعض حصوں میں ان "خباثت" سے محفوظ رہ کر بھی شوٹنگ کی جا سکتی تھی۔ ویسے یہ بات ہم پہلے بھی آپ کو بتا چکے ہیں کہ ایک دو دن تو یہ ماحول اور ننگا پن دیکھ کر حیرت ہوتی ہے شرم بھی آتی ہے مگر پھر عادت پڑ جاتی ہے اور یہ معمول کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی کشش اور دلکشی میں کوئی کلام نہیں ہے۔ کیا کریں حضرت انسان کا خمیر ہی ایسی فضول مٹی سے اٹھایا گیا ہے کہ انہیں یہ دلدل ہی راس آتی ہے۔ ہم یورپ پہلے بھی جاتے رہے ہیں اور امریکہ جانے کا اتفاق بھی ہوا مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قوم فرنگ اپنی عریانی کی حدود سے مطمئن نہیں ہے۔ ان لوگوں کا بس نہیں چلتا کہ محض قدرتی اور فطری لباس میں گھومیں پھریں مگر کیونکہ حکومت

کی طرف سے برائے نام پابندیاں عائد ہیں اس لئے بے چارے ایسا لباس پہننے پر مجبور ہیں جو کہنے کو لباس ہو مگر لباس بھی نہ ہو یعنی شاعر کے الفاظ میں

ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

والی بات ہو جائے۔ اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں خواتین و حضرات کپڑے کا تکلف ہی بالکل ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں ایسے ایسے ملبوسات دیکھنے میں آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ایک زنانہ لباس تو اتنا باریک ہوتا ہے کہ لباس نظر ہی نہیں آتا مگر قانون کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ بہرحال لباس تو پہنا ہوا ہے۔ چند روز قبل ہم نے اخبار میں ایسی خواتین کی تصویریں بھی دیکھی تھیں جن کے جسموں پر سب ملا کر بلا مبالغہ تین انچ لباس بھی نہ ہوگا (یعنی تین انچ فی خاتون) لباس کیا انتہائی باریک سی ڈوریاں سمجھ لیجئے جو اتنی نازک تھیں کہ اگر چھینک ماریں تو ڈوریاں ٹوٹ جائیں۔ چند انچ کا لباس پہننے والی خواتین کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہاں بعض دکانوں اور ریستورانوں پر یہ بورڈ بھی نظر آتا ہے کہ "اندر آنے کے لئے کچھ لباس اور جوتا پہن کر تشریف لائیں" وجہ یہ ہے کہ اکثر خواتین و حضرات برائے نام لباس میں جوتے ہاتھ میں لٹکائے دکانوں میں چلے جاتے ہیں اور برائے نام لباس کا مطلب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے یعنی بالکل بے لباس نہ آئیں، کچھ تو خدا کا خوف کریں۔

اس سے پہلے چند روز ٹورنٹو میں شدید گرمی پڑی تھی جس نے لوگوں کو بوکھلا دیا تھا اب جو خوشگوار موسم اور ٹھنڈی ہوائیں نصیب ہوئیں تو جسے دیکھئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ جھیل کنارے شوٹنگ کے سلسلے میں کوئی مشکل بھی پیش نہیں آرہی تھی۔ یہاں کوئی بلا وجہ سامنے کھڑا ہو کر ڈسٹرب نہیں کرتا۔ ذرا سی دلچسپی کا اظہار ضرور کرتے ہیں اور پھر ایک دو سوال کر کے آگے چلے جاتے ہیں۔ اس بہانے بے شمار سیاحوں نے غالباً پاکستان کا نام پہلی بار سن لیا کہ یہ ایک پاکستان فلم کی شوٹنگ ہے۔ پرویز صاحب تو جھیل کا ایک ایسا گوشہ تلاش کرنے میں مصروف تھے جہاں کوئی سنسر کی خلاف ورزی کرنے والا لباس اچانک فریم میں نہ آجائے اور ہم ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ایک درخت کے نیچے ایک صاحب کو دیکھا جو محض ایک مختصر سا نیکر پہن کر تولیہ بچھائے بیٹھے تھے۔ کسی یورپین ملک کے نظر آتے تھے۔ عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی مگر بہت صحت منداور مضبوط و توانا جسم کے مالک تھے۔ حلیہ جناب کا یہ تھا کہ جسم پر لباس کے نام پر نیکر تھا اور سر پر ایک فلیٹ ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ یوں بیٹھے تھے جیسے کوئی سادھو دھونی رما کر بیٹھ جاتا ہے۔ مگر دھیان گیان سے زیادہ ان کی توجہ شوٹنگ کی جانب مرکوز تھی۔ کبھی تو اونگھنے لگتے اور کبھی سر اٹھا اٹھا کر شوٹنگ دیکھنے لگتے۔ ہم ٹہلتے ہوئے ان کے نزدیک پہنچے تو مسکرائے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مخاطب کیا۔ گویا کسی یورپی ملک سے ان کا تعلق تھا مگر انگریزی بولنے والے نہیں تھے۔ پوچھنے لگے کیا تم بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو جو شوٹنگ کر رہے ہیں۔"

ہم نے کہا "جی ہاں۔"

پوچھنے لگے "یہ لوگ کیا کر رہے ہیں"

ہم نے بتایا کہ ہم لوگ پاکستان سے آئے ہیں.اور ایک فلم بنا رہے ہیں۔ انہوں

نے سب سے پہلے تو ہمارا نام پوچھا۔ پھر اپنا نام بتایا۔ "مجھے جارجی کہتے ہیں میرا تعلق پولینڈ سے ہے۔" انہوں نے بتایا کہ انہیں پولینڈ سے آئے ہوئے ۵۳ سال ہو گئے ہیں مگر وہ آج بھی خوابوں میں اپنے ملک کو دیکھتے ہیں۔ انگریزی انہوں نے باقاعدہ طور پر سیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بس انگریزی کی ٹانگ توڑتے رہتے ہیں۔ پولینڈ کا تذکرہ آیا تو وہ ٹھنڈی آہیں بھرنے لگے بولے "بس اب تو پولینڈ کے بارے میں خبریں ہی پوچھتا رہتا ہوں۔"

ہم نے کہا "واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟"

بولے "اب وہاں میرا کون بیٹھا ہے اور پھر کینیڈا میں میرے پاس گھر ہے۔ کام کاج ہے آرام سے رہتا ہوں مگر پھر بھی اپنا وطن یاد آتا ہے تم کہاں سے آئے ہو؟"

ہم نے کہا "بتایا تو ہے کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔"

بولے "اچھا اچھا روس میں کوئی جگہ ہے؟"

ہم نے احتجاج کیا اور انہیں پاکستان کے بارے میں بتایا پھر جغرافیائی حالات کی وضاحت کرنے کے لئے زمین پر نقشہ کھینچ کر سمجھایا کہ پاکستان کہاں واقع ہے اور اس کے آس پاس کون کون سی ملک ہیں۔ افغانستان' چین' بھارت' ایران۔

کہنے لگے "ویری امپارٹنٹ ' ویری امپارٹنٹ' بھئی تم کو تو بہت بڑی فوج رکھنی پڑتی ہو گی۔ کیا تمہاری فوج بہت بڑی ہے؟"

ہم نے کہا "بڑی تو نہیں ہے مگر بہت اچھی ہے سب اس سے ڈرتے ہیں۔

سرہلا کر بولے "ڈرتے ہوں گے ترکوں سے بھی سب ڈرتے ہیں ہم بچے تھے تو سنا کرتے تھے۔" ہم نے بتایا کہ پاکستان بھی مسلمان ملک ہے اور بہت سے لوگ ترک نسل کے بھی ہیں کہنے لگے "جب ہی تو کسی سے نہیں ڈرتے' بھئی تمہای فوج بہت مضبوط ہو گی اس لئے تو تم لوگ بے فکری سے ساری دنیا میں گھومتے پھرتے ہو۔ یہ بتاؤ تمہارا ارادہ کینیڈا میں آباد ہونے کا تو نہیں ہے؟"

ہمارے انکار پر کہنے لگے "بالکل درست ہر شخص کو اپنے ہی ملک میں رہنا چاہئے۔ بے وطن ہو کر انسان نامکمل ہو جاتا ہے۔ اب مجھ ہی کو دیکھ لو۔ میں نامکمل انسان ہوں' بنجارہ ہوں' ایک پناہ گزین ہوں' یہ ملک کبھی میرا وطن نہیں بن سکتا۔ ترپین سال تک

ہاں رہنے کے باوجود بالکل تنہا اور اجنبی ہوں۔ نہ یہ زمین میری ہے نہ یہ مٹی۔" انہوں نے اپنی موٹے موٹے شیشوں کی عینک اتار کر آنسو صاف کئے وہ مزید آنسو روکنے کی وشش کر رہے تھے۔ پھر ٹوکری میں سے ایک بیئر کا ٹین نکال کر غٹ غٹ کر کے پی ئے۔ ہمیں ان سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو دوسرے لوگ بھی وہاں آ گئے۔ ہم نے ب کا ان سے تعارف کرایا۔ شبنم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے "ویری بیوٹی فل' ویری ارمنگ سچ مچ ہیروئین لگتی ہے۔"

ہم نے کہا "لگتی نہیں ہے سچ مچ ہیروئین ہے۔"

کہنے لگے "میرا مطلب ہے کہ اگر یہ فلموں میں نہ ہو پھر بھی ہیروئین ہے۔ کتنا ھارنگ ہے کتنی خوب صورت آنکھیں ہیں کتنی اسمارٹ اور دلکش ہے۔ اس کے بال تنے گھنے اور سیاہ ہیں اگر یہ مجھے تیس سال پہلے نظر آئی ہوتی تو اسے لے کر پولینڈ بھاگ تا۔"

ہم سب ان کی باتوں پر ہنس رہے تھے۔ شبنم کچھ شرما سی گئیں۔ ہم نے کہا پردھان آپ ان کی تعریف پر نہ جائیں۔ ان لوگوں کو تو ہر کالی چیز بہت اچھی لگتی ہے۔" وہ ناراض ہو گئیں۔ "آپ بہت خراب ہیں۔"

جارجی صاحب کو برائے نام انگریزی آتی تھی جب بولتے تھے تو یوں لگتا جیسے ریزی کو کوٹ پیس کر اس کی روٹی بنا رہے ہیں۔ ہمارے بہت سے ساتھیوں نے بھی نا سے باتیں شروع کر دیں۔ اور خوب انگریزی آزمائی۔ وہ ان کی انگریزی پر حیران رہ ئے۔ بار بار پوچھ رہے تھے کہ تم لوگوں نے اتنی اچھی انگریزی کہاں سے سیکھی؟

ہم نے کہا "ہمیں انگریزوں نے سکھائی ہے۔ ہم بہت عرصے ان کے غلام رہے ہیں ل لئے ان کی زبان اور طور طریقے جانتے ہیں۔"

جارجی صاحب نے پوچھا "تمہاری فلم کا ہیرو کون ہے؟"

ہم نے ندیم کی طرف اشارہ کیا جو ایک گانا پکچرائز کرا رہے تھے کچھ دیر دیکھتے ہے پھر بولے "اچھا خوب صورت ہے مگر "مین لی" نہیں ہے یعنی مردانہ حسن نہیں ہے۔" ہم نے کہا ہمارے ملک میں لوگ چاکلیٹ ہیرو کو بہت پسند کرتے ہیں۔

کہنے لگے خوب یاد دلایا یہ چاکلیٹ کھاؤ۔ انہوں نے باسکٹ میں سے چاکلیٹ نکال

کر سب کو کھلائے۔ ان کی کہانی یہ ہے کہ پولینڈ سے ایک بحری جہاز میں چھپ کر چ
سے کینیڈا آ گئے تھے اس وقت نو عمر تھے۔ وہاں ان کے ماں باپ بہت غریب تھے۔ کینیڈا
آ کر بس وہیں کے ہو رہے۔ چھوٹے موٹے کام کرتے رہے۔ انگریزی بس مطلب کی سمجھ
لیتے تھے۔ سیکھنے کی کوشش کبھی نہیں کی وجہ؟ "ہماری پولش زبان بہت میٹھی اور پیاری
ہے۔ پھر انگریزی سیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

حالانکہ ان کی پولش ایسی زبان ہے کہ سنو تو لگتا ہے کہ کوئی پتھر برسا رہا ہے۔
جارجی صاحب نے ایک پولش لڑکی ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس سے شادی کر لی کہنے لگے "بہت
اچھی لڑکی تھی' اس کا بھی یہاں کوئی نہیں تھا بس ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے تھے۔
اس وقت دنیا بہت حسین لگتی تھی۔ بیس سال تک انہوں نے خوش و خرم زندگی بسر کی۔
بیوی پولش کھانے پکا کر کھلاتی تھی۔ دونوں آپس میں اپنی زبان بولا کرتے تھے اور خوب
خوش تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی کے ماں باپ بنے تو انہیں بھی اپنی زبان ہی سکھائی' مگر
وہ اسکول گئے تو انگریزی سیکھ آئے دوست احباب بھی انگریزی بولتے تھے۔ کہنے لگے "بس
وہ دونوں بگڑ گئے۔ میں نے تو تانیا سے کہہ دیا تھا کہ یہ دونوں گئے ہمارے ہاتھ سے۔"

شادی کے بیس سال بعد تانیا ڈوب کر مر گئی۔ اسے تیراکی کا بہت شوق تھا۔ ایک
دن سمندر میں تیرنے گئی تو پھر اس کی لاش ہی باہر آئی۔ جارجی کی تو دنیا اندھیری ہو گئی۔
پھر انہوں نے شادی نہیں کی بیوی کے تذکرے پر ایک بار پھر ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"تو پھر آپ کے بچے کہاں گئے؟"

وہ یہاں کے موسم میں پیدا ہوئے تھے۔ انہیں یہاں کی ہوا لگ گئی تھی۔ انہیں
کسی چیز سے پیار نہیں تھا۔ نہ پولینڈ سے' نہ ماں سے' نہ باپ سے' نہ ایک دوسرے
سے۔ بس بڑے ہوئے تو جس کا جدھر منہ اٹھا چلا گیا۔ بیٹا امریکہ چلا گیا۔ بیٹی برازیل میں
ہے۔ کبھی کبھی خط لکھتے ہیں مگر میں تو پڑھ بھی نہیں سکتا۔ کسی سے پڑھوا کر سنتا ہوں۔

ان کی باتیں سن کر ہمیں اپنی فلمی "کامیابی" کا کردار خان بابا یاد آ گیا۔ اس بے
چارے کی بھی تو یہی کہانی ہے۔ ہم نے انہیں بتایا تو خوش ہو گئے۔ "بالکل ٹھیک کہا ہے تم
نے میرا بس چلے تو ایسا قانون بنا دوں کہ کوئی شخص اپنے وطن سے باہر ہی نہ نکلے۔ چند
پیسوں اور تھوڑی سی آسائش کے لئے آدمی سب کچھ کھو بیٹھتا ہے۔"

اس وقت ننھا نہیں تھے ورنہ انہیں جارجی سے ملواتے۔

اگلے دن ٹورنٹو کے مشہور شاپنگ سینٹر "ای ٹن" میں شوٹنگ تھی۔ "ای ٹن" کے
ے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا شاندار اور خوبصورت ترین شاپنگ سینٹر
شاپنگ سینٹر کیا ہے ایک پورا شہر ہے۔ ہم تو وہاں راستہ ہی بھول جایا کرتے تھے۔
دکانیں اور ان میں رکھا ہوا سامان ہی دیکھتے اور حیران ہوتے رہے۔ خریداری کے نام
م نے وہاں آئس کریم اور کافی پر بہت ڈالرز خرچ کئے۔ لبنیٰ نے کچھ مصنوعی زیورات
جوتے وغیرہ خریدے۔ دراصل یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا خریدیں اور
نہ خریدیں۔ اس کی کئی منزلیں ہیں۔ شیشے کی چھتیں ہیں۔ شیشے کے اندر لفٹیں لگی
ہیں۔ بڑی حسین' رنگین اور دلکش جگہ ہے۔ "ای ٹن" کی شوٹنگ میں ایس ایم
ن صاحب بھی ہمراہ تھے۔ وہ پرویز صاحب کو اس کے بہت سے حصے دکھاتے رہے۔
کا کہنا سو فیصد ٹھیک تھا۔ "ای ٹن" کے پس منظر میں ایک کیا کئی فلمیں بنائی جا سکتی

یوسف صاحب کا قصہ دراصل بیچ میں ہی رہ گیا۔ ان سے بعد میں کئی ملاقاتیں
ہ۔ ان کی بیگم سے بھی ملنا ہوا۔ بے حد معصوم' نیک دل' اور وضع دار خاتون ہیں۔
لی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یوسف صاحب کے بارے میں بہت سے اسکینڈل
ر ہوئے۔ انہوں نے کچھ فلمی شادیاں بھی کیں مگر کیا مجال جو بیگم نے شکایت کی ہو یا
ں ملال بھی آیا ہو۔

ہم نے ایک دن پوچھا تو معصومیت سے مسکرائیں اور کہنے لگیں "مجھے معلوم تھا
یہ سب جگہ گھوم پھر کر واپس میرے پاس ہی آئیں گے۔"

یوسف صاحب کے پاس فلم سازی کے بہت سے منصوبے تھے' بلکہ ایک انبار لگا
تھا۔ وہ انگریزی زبان میں فلم بنانا چاہتے تھے۔ ہم نے سمجھایا کہ یہاں آپ کو کون جانتا
اور اس فلم میں اداکار بھی آپ کو ہالی ووڈ کے مشہور اسٹار لینے پڑیں گے۔ اس لئے
ال چھوڑ دیں اور اردو میں فلم بنائیں۔ انہوں نے ہمیں شیکھر صاحب سے ملایا۔ یہ
زمانے میں اچھے مشہور ہیرو تھے۔ ان کی بعض فلمیں بہت کامیاب ہوئی تھیں جن
ے ایک "آنکھیں" بھی تھی۔ شیکھر صاحب ان دنوں ٹورنٹو میں رہتے ہیں' کاروبار

کرتے ہیں۔ بچے جوان ہو گئے ہیں۔ شادیاں کر کے اپنے اپنے کام میں لگ گئے ہیں، مگر شیکھر صاحب کے دماغ سے فلم کا کیڑا نہیں نکلا۔ ایک دن یوسف صاحب ہمیں ان کے گھر دعوت پر لے گئے۔ اچھی خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں۔ گارمنٹس کا کاروبار ہے۔ شاندار اپارٹمنٹ ہے۔ بہت لذیذ اور ٹھیٹ دیسی کھانا کھلایا۔ کافی بہت اچھی پلائی۔ پھر ہم ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ اچھے خوش ذوق انسان ہیں۔ اردو کا لب و لہجہ بے حد نستعلیق قسم کا ہے اور کیوں نہ ہو یوپی سے تعلق ہے۔

کہنے لگے "صاحب کوئی اچھا سا موضوع بتائیں جس پر فلم بنائی جائے۔ ہم تو تلاش کر کے تھک گئے۔ بے شمار کہانیاں سن چکے ہیں مگر کوئی دل کو نہیں لگی۔"

ہم نے کہا "دیکھئے ہمیں کہانی سنانی بالکل نہیں آتی۔ پھر بھی ایک کہانی کا آئیڈیا سناتے ہیں۔"

انہوں نے اپنی بیگم سے کہا کہ اب نہ کوئی کمرے میں آئے نہ کسی کا فون ملایا جائے۔ بالکل تخلیہ۔ البتہ تھوڑی دیر بعد کافی چائے بھیجتی جائیں۔ پان سپاری بھی آتی رہے۔ اس کے بعد وہ ایک صوفے پر ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گئے۔ ہم شاید یہ بتانا بھول گئے کہ وہ ریشمی کرتہ اور چوڑی موری کا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ بیگم نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ گھر کی آرائش بھی خالص مشرقی قسم کی تھی۔ بہت دل خوش ہوا ان کے گھر جا کر۔ یوسف صاحب دوسرے صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔ ہم نے ایک صوفے کے کنارے بیٹھ کر کہانی سنانی شروع کی۔ کہانی وہانی ہمیں بالکل سنانی نہیں آتی۔ ہم تو لکھ کر دے دیا کرتے ہیں اور ہدایت کار پڑھ کر بحث مباحثہ کرتے ہیں۔ ہماری لکھی ہوئی کہانی بھی فلم ساز یا ہدایت کار ہی پڑھ کر دوسروں کو سناتے ہیں۔ یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب فلم ساز بھی پڑھے لکھے باذوق ہوا کرتے تھے اور فلم ساز و ہدایت کار بھی حسن طارق، خلیل قیصر، پرویز ملک، ایس سلیمان، رضا میر، اقبال شہزاد، راشد مختار، شریف نیر جیسے تھے۔

ہم نے باتوں باتوں میں کہانی شروع کر دی۔ شیکھر صاحب صوفے سے اٹھ بیٹھے اور آگے جھک کر بیٹھ گئے۔ یوسف صاحب بھی آگے کو ہو کر بیٹھ گئے۔ بیگم صاحب کافی اور دال موٹھ لے کر آئیں تو شیکھر صاحب نے انہیں اشارے سے روک دیا اور کہا "بس اب رہنے دیجئے۔"

ہم کافی پینے کو رکے تو وہ بے تابی سے پوچھنے لگے "پھر کیا ہوا؟"

یہ ایک سسپنس ٹائپ کہانی تھی۔ بہر حال، آدھے گھنٹے میں ختم ہو گئی۔ اس میں کافی چائے بھی چلتی رہی۔ سوالات بھی ہوتے رہے۔ شیکھر صاحب کو اتنی پسند آئی کہ وہ فوراً کہانی شروع کرنے پر اصرار کرنے لگے۔ ہم اگلے روز ٹورنٹو سے پرواز کرنے والے تھے۔ طے یہ پایا کہ ہم ان کا اسکرین پلے بنا لیں گے اور یوسف صاحب پاکستان آ کر باقی باتیں طے کر لیں گے۔ رات کے تین بجے تک یہ میٹنگ جاری رہی۔ اس دوران میں لنڈن کے کئی فون آئے۔ پرویز صاحب نے کئی بار فون کیا مگر مسز شیکھر نے بڑے سلیقے اور شائستگی سے بات کرنے کے بعد ہم تک فون نہ پہنچایا۔ بہر حال یہ ایک الگ داستان ہے۔

صبح چار بجے ہم اپنے اپارٹمنٹ واپس پہنچے۔ یوسف صاحب کا بس نہیں چلتا تھا کہ فوراً فلم شروع کر دی جائے۔ وہ فلم کے آدمی تھے۔ ان کا اوڑھنا بچھونا، کھانا پینا، سب کچھ فلم ہی تھا مگر وہ پھر کوئی فلم نہ بنا پائے۔ یہی صدمہ شاید ان کی موت کا سبب بن گیا۔ اگر وہ فلمیں بناتے رہتے تو بہت سالوں تک ٹھیک ٹھاک، تندرست رہتے۔ کام کرتے رہتے، فلمیں تخلیق کرتے رہتے۔ بعد میں وہ پاکستان آتے رہے۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ بمبئی بھی گئے، لاہور بھی آئے، کراچی میں بھی رہے۔ زندگی کے آخری ایام بھی انہوں نے کراچی میں گزارے۔ بڑے دلچسپ اور کام کے آدمی تھے۔

"کامیابی" کی شوٹنگ نیاگرا آبشار کے آس پاس بھی ہوئی۔ شاہ جی کی ہنرمندی اور کاریگری دیکھ کر ٹورنٹو میں فلم لیبارٹری والے حیران رہ گئے۔ طریقہ کار یہ تھا کہ دن بھر کی شوٹنگ کے بعد رات کو نیگیٹو لیب میں پہنچا دیا جاتا تھا وہ اس کے پرنٹ اسی رات تیار کر دیا کرتے تھے۔ شاہ جی کو دیکھ کر ان لوگوں کو بہت مایوسی ہوئی تھی کہ یہ آدمی بھلا کیا عکاسی کرے گا مگر ان کا کام دیکھا تو مان گئے۔ ہر شخص رش پرنٹ دیکھتا اور تعریف کرتا۔ ان کا کہنا تھا کہ نیاگرا کو سینکڑوں ہزاروں لوگوں نے فلمایا ہے مگر یہ بات' یہ تاثر' یہ حسن' پہلی بار دیکھا' وہ شاہ جی کے ہاتھ چومتے تھے۔ انہیں عقیدت اور احترام سے دیکھتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم پاکستان کے لوگ جن حالات میں کام کرتے ہیں ان میں کوئی بھی کام نہیں کر سکتا۔ اس قدر اچھے ریزلٹ دینا تو الگ بات ہے۔ ہم ایک دوسرے کی ڈھنگ سے قدر بھی نہیں کرتے۔ باہر والے پہلے تو ہمیں سنجیدگی سے لیتے ہی نہیں ہیں' مگر پھر جب کام دیکھتے ہیں تو قائل ہو جاتے ہیں۔ شاہ جی اور پرویز صاحب اپنی تعریفیں سن سن کر خوش ہوا کرتے تھے۔ شاہ جی نے اب فر فر انگریزی بولنا شروع کر دی تھی۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے ان کی بلا سے۔ ان کا خیال تھا کہ کینیڈا والوں کو اپنی انگریزی بہتر بنانی چاہیے۔

ٹورنٹو کے ہر قابل ذکر مقام پر پرویز صاحب نے شوٹنگ کی تھی۔ کئی بار دلچسپ لطیفے بھی ہوئے۔ ہم لوگ ایک جگہ شوٹنگ کرنے کی غرض سے گئے۔ پہچان یہ تھی کہ راستے میں سڑک بن رہی تھی۔ سڑک پر باقاعدگی سے ہدایات موجود تھیں۔ نہ روڑی' نہ کنکر' نہ مٹی' ایک حصہ بالکل علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ دوسرے پر بڑے سلیقے سے ٹریفک رواں تھا۔ دوسرے دن ہم کو پھر اسی لوکیشن پر جانا تھا مگر زیر مرمت سڑک کہیں نظر نہ آئی۔ بہت دیر تک بھٹکتے رہے۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ سڑک کا وہ حصہ کل رات ہی مکمل ہو گیا

تا۔ ہم لوگ تو اس بات کے عادی ہیں کہ اگر کسی جگہ پائپ بھی ڈالے جا رہے ہیں تو اٹھ دس مہینے تک سڑک ملبے کا ڈھیر بنی ہوئی ہے۔ پائپ ڈالنے والے مہینوں کے بعد چلے جاتے ہیں مگر مٹی' گرد و غبار اور گندگی کا ڈھیر وہیں پڑا رہ جاتا ہے۔ ایک اور واقعہ سنئے ارے اپارٹمنٹ سے کچھ فاصلے پر ایک دن دیکھا کہ ایک عمارت بن رہی ہے۔ سائن رڈ سے پتا چلا کہ ایک چینی کھانے کا ریستوران بنایا جا رہا ہے۔ پندرہ دن کے اندر تین زلہ عمارت بن کر تیار ہو گئی اور اس کا افتتاح بھی ہو گیا۔ خدا جانے یہ لوگ جن بھوت ں یا کیا بلا ہیں۔ ٹورنٹو کے نواحی علاقوں میں مختلف مقامات پر بستیاں زیر تعمیر دیکھیں۔ اں یہ دستور ہے کہ جب پوری آبادی' بمعہ سڑک' مکانات' بجلی' اسکول' بازار وغیرہ مل ہو جاتی ہے تو پھر خریدار آتے ہیں اور اسے آباد کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ پہلے ند کچے پکے بے ترتیب گھر بن گئے' نہ پانی' نہ بجلی نہ سڑک' اس کو ہم کچی آبادی کا نام یتے ہیں۔ ہم نے پہلے بھی بتایا ہے کہ کینیڈا والے پہلے بستیاں تعمیر کرتے ہیں پھر انہیں باد کرتے ہیں۔ ہم نے ٹورنٹو کے ایک وزیر صاحب سے پوچھا تھا کہ حضور آپ کے ملک ں بے انتہا خالی زمین پڑی ہوئی ہے مگر آپ پھر بھی باہر سے آنے والوں کو اجازت دینے ے سلسلے میں اس قدر کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ آخر کیوں؟ وہ بولے: دیکھئے پہلے ہم بادیاں بناتے ہیں۔ باہر سے آکر کوئی آباد ہو گا تو اسے گھر بھی درکار ہو گا۔ پانی بجلی' ڑک' ٹرانسپورٹ' بچوں کے لئے اسکول اور بڑوں کے لئے روزگار' علاج کے لئے پتال' یہ سب ضرورتیں جب فراہم ہو جاتی ہیں تو پھر اسی حساب سے لوگوں کو آنے کی جازت دیتے ہیں۔ یعنی ہر معاملے میں منصوبہ بندی سے کام لیا جاتا ہے۔ وہ لوگ سو دو سو ال پہلے ہی آنے والے حالات کے لئے منصوبہ بندی کر لیتے ہیں۔ ہمارا یہ حال ہے کہ دو ال میں لاکھوں کروڑوں کی لاگت سے ایک پل بناتے ہیں جو پانچ سال بعد ضرورت کے ئے ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ نئی بستیاں آباد کرتے ہیں۔ جہاں سڑکیں اتنی تنگ ہوتی ہیں کہ سال بعد ہی آمد و رفت دشوار ہو جاتی ہے۔ ہمارے تو عجیب و غریب طور طریقے ہیں۔ ے کی بات یہ ہے کہ ہمارے حکمران' بیوروکریٹ' سرمایہ دار' تاجر' کھاتے پیتے لوگ' ی دنیا بھر کی خاک چھانتے پھرتے ہیں مگر قسم لے لیجئے جو کہیں سے کوئی کام کی بات سیکھ ر تو آ جائیں۔

ایک دن ایک بہت بڑے شاپنگ پلازا میں ننھا اور ان کے پوتے کا سین فلمایا ج
تھا۔ ننھا اپنے پٹھانی لباس' کلاہ اور پشاوری چپل کے علاوہ اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے سب کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ منظر یہ ہے کہ دونوں گھر سے گھومنے پھرنے غرض سے نکلے ہیں اور شاپنگ پلازا میں ایک جگہ بیٹھے سستا رہے ہیں۔ پوتا ایک آئس کریم کی فرمائش کرتا ہے جو دادا جان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ خالص امریکن لب لہجے میں انگریزی بول رہا ہے ادھر خان صاحب اپنی پشتو نما زبان بول رہے ہیں۔ آخر ا پاکستانی برابر سے گزرتے ہوئے انہیں بتاتا ہے کہ بچہ آئس کریم کھانا چاہتا ہے۔ خا صاحب سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ خوچہ' ام تو اپنے پوتے کا فرمائش بھی نہیں سمجھتا۔ کتنے شرم کا مقام ہے۔ ننھا کے سین بہت دلچسپ تھے۔ بہو کے ساتھ بھی انہیں زبان پرابلم پیش آرہی تھی اور پوتے کے ساتھ بھی یہی مشکل تھی۔ وہ تنگ آکر کہتے تھے او خاناں تمہارا لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ ایک دوسرے کا بات تک نہیں سمجھ اے۔ پھر سب سے بڑی مشکل عورتوں کے لباس کی تھی۔ ننگی ٹانگیں' اور کھلے بازو کر خان صاحب آنکھیں بند کر لیا کرتے تھے۔ ایک بار اس کی وجہ سے ٹریفک حادثے شکار ہوتے ہوتے بچ گئے۔ چلئے باہر والوں پر تو ان کا کوئی بس نہیں چلتا تھا مگر گھر میں بھی ایسا ہی بے شرمی والا لباس پہنتی تھی تو وہ دانت پیس کر رہ جاتے تھے۔ بیٹے سے ک تھے کہ تم اس کا تن ڈھانپو۔ اسے شلوار قمیص اور دوپٹہ بنا کردو۔ کیسا شرم کا مقام ہے امارا بہو ننگا پھرتا ہے۔ خان صاحب اس وقت کو یاد کر کے پچھتاتے تھے جب انہوں زمین اور مکان بیچ کر بیٹے کو پڑھنے کے لئے امریکہ بھیجا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ امارا زمین جائداد بھی گیا۔ بیٹا بھی گیا اور شرم و حیا بھی چلا گیا۔

ایک اسپتال میں چند سین فلمانے تھے۔ واجد صاحب مختلف مقامات پر گھو رہے۔ آخر ایک اسپتال والوں نے ہمیں شوٹنگ کے لئے اجازت دے دی مگر شرط یہ کہ شوٹنگ بالکل خاموشی سے ہوگی اور ہر روز تین گھنٹے سے زیادہ دیر تک نہیں چلے گی واجد صاحب اسپتال والوں سے معاملات طے کرنے کے لئے گئے تو ہمیں بھی ساتھ لے گئے۔ واجد صاحب نہایت معقول اور بہت دلچسپ آدمی ہیں مگر ہم نے رات اور دن میں جب بھی انہیں دیکھا جماہیاں لیتے ہوئے ہی پایا اور واجد صاحب ہی پر کیا منحصر ہے وہاں تو

جسے دیکھئے جماہیاں لے رہا ہے یا اونگھ رہا ہے۔ شروع شروع میں تو ہم بہت حیران ہوا کرتے تھے مگر بعد میں پتا چل گیا کہ جماہیاں لینا ان لوگوں کی قومی عادت ہے۔ جسے دیکھئے منہ پھاڑ پھاڑ کر جماہیاں لینے پر تلا ہوا ہے۔ بعد میں اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ مغربی ممالک کے لوگوں کی نیند کبھی پوری نہیں ہوتی۔ یورپ' امریکہ' کینیڈا' ہر جگہ یہی معاملہ ہے۔ اور نیند پوری ہو تو کیسے ہو۔ ہر شخص جب کام پر جاتا ہے تو یوں سمجھئے جیسے کسی دوسرے شہر جا رہا ہے۔ فاصلے اتنے طویل ہیں کہ خدا کی پناہ۔ ایک ڈیڑھ' دو گھنٹے کا سفر تو معمولی بات ہے۔ پھر ٹریفک کی رکاوٹیں بھی بور کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ آپ کو عین وقت مقررہ کام پر پہنچ جانا لازم ہے۔ چند منٹوں کی تاخیر بھی برداشت نہیں کی جاتی۔ اس لئے صبح اٹھتے ہی ہر شخص مرد' عورت بھاگم بھاگ تیار ہو کر گھر سے نکل جاتا ہے۔ جب کام پر پہنچتے ہیں تو وہاں پورے آٹھ گھنٹے کولھو کے بیل کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ لنچ اور کافی کے وقفے کے علاوہ ایک لمحے کے لئے بھی سر کھجانے تک کی فرصت نہیں ملتی۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ وہی لمبا اور اکتا دینے والا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ گھر پہنچ کر ابھی ستانے کی مہلت نہیں ملتی کہ دوسرے جاب پر جانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ "دوسرا جاب" تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ یعنی دوسرا کام۔ مہنگائی اور اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ محض ایک جگہ کام کر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے اس لئے زیادہ تر لوگ دوسرا کام بھی کرتے ہیں۔ جو تھوڑے سے خوش قسمت اس سے بچے ہوتے ہیں ان کی جان کو اور دوسرے عذاب ہیں۔ پہلے تو کھانا پکانا' گھر کی صفائی' کپڑے استری کرنا اور دوسرے گھریلو کام۔ بازار سے سودا سلف لانا بھی کام ہے۔ اس کے بعد اگر وقت بچ گیا تو ٹیلی ویژن دیکھنا بھی ضروری ہے یا پھر بار' پارٹی' سینما یا تھیٹر' جانا بھی حوائج ضروریہ میں شامل ہے۔ گویا چوبیس گھنٹے میں سے قریب قریب بیس گھنٹے تو جاگتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اب سونے کا وقت وہی رہ جاتا ہے جب آپ کار کا سفر کر رہے ہوں یا انڈر گراؤنڈ ٹرین یا بس میں سوار ہوں' چنانچہ جسے دیکھئے جماہیاں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم تو حیران ہیں کہ وہاں سڑکوں پر اتنے زیادہ حادثے کیوں نہیں ہوتے۔

ہم جب واجد صاحب کے ساتھ سفر کرتے تھے تو اکثر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سو

گئے ہیں۔ بات کرتے کرتے اچانک غوطہ لگا جاتے تھے۔ یکایک خاموش ہو جاتے تھے۔ ایک دو بار جب جواب نہ پایا تو ہم نے کہا۔ "کیا بات ہے کیا سو گئے؟"

وہ خوابیدہ آواز میں جواب دیتے "بالکل نہیں۔"

مگر ایک روز ہم نے سچ مچ انہیں سوتے دیکھا تو جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ باقاعدہ آنکھیں بند کئے سو رہے تھے۔ البتہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے۔ اب ہم اس پریشانی میں تھے کہ اگر انہیں جگائیں تو ایسا نہ ہو کہ اچانک بوکھلا کر اٹھیں اور کوئی حادثہ کر بیٹھیں لیکن اگر نہ جگائیں تو بھی مصیبت' خدا جانے کب وہ کسی اور گاڑی کو ٹکر مار دیں۔ عجب مخمصے میں گرفتار تھے۔ یہاں تک کہ حسب معمول وہ خود ہی بیدار ہو گئے اور پھر باتیں کرنے لگے۔ ہم نے انہیں قسم دے کر پوچھا کہ کیا آپ سو رہے تھے؟

بولے "ہاں ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ میں تو بس اسی طرح اپنی نیند پوری کر لیتا ہوں۔"

کینیڈا میں ٹریفک کے قوانین بہت سخت ہیں۔ شراب پی کر کار چلانا بہت سنگین جرم ہے' مگر حضرت انسان بھلا کب باز آتے ہیں' لہٰذا پی پلا کر کار چلاتے ہیں۔ اب وہاں کی پولیس کو یہ اختیار تو نہیں ہے کہ لوگوں کی کاریں روک روک کر ان کے منہ سونگھتے پھریں۔ بس اگر کوئی حادثہ کر بیٹھے یا اپنی حرکتوں سے شک میں ڈال دے تو ڈرائیور کو پولیس اسٹیشن لے جا کر الکوحل ٹیسٹ لیا جاتا ہے اور اگر شراب پینا ثابت ہو جائے تو ڈرائیونگ لائسنس ضبط۔ اسی طرح کار ڈرائیونگ کرتے ہوئے کوئی دوسرا کام کرنا بھی جرم ہے' مگر لوگ سبھی کچھ کرتے ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں' اخبار پڑھ رہے ہیں' کوئی یادداشت لکھ رہے ہیں' کھا پی رہے ہیں' کوک' یا بیئر کے ڈبوں سے منہ لگا کر پیتے رہنا تو ایک معمول کی بات ہے۔ مگر ایک روز ہم حیران رہ گئے۔ رات گئے ہم واجد صاحب کے ہمراہ چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے موسیقی لگا رکھی تھی اور مغربی دھن پر اپنی انگلیوں سے اسٹیئرنگ پر طبلہ یا اونگا بونگا بھی بجا رہے تھے کہ ہمارے برابر سے ایک لمبی سی کار گزری۔ اس میں ایک ایشیائی صاحب بالکل تنہا بیٹھے ہوئے آم کھا رہے تھے۔ ہم تو ان کے قائل ہو گئے۔ آم ایک ایسا پھل ہے جسے گھر میں کھانے کی میز پر بیٹھ کر کھانے کے لئے بھی بہت اہتمام کرنا پڑتا ہے' مگر یہاں ان کا یہ حال تھا کہ کار چلاتے ہوئے آم کھا رہے تھے۔

یقیناً کوئی پاکستانی یا ہندوستانی ہوں گے۔ اس طرح ہم نے کئی لوگوں کو کار چلانے کے دوران میں باقاعدہ آنکھیں بند کر کے سوتے ہوئے بھی دیکھا۔ بات یہ ہے کہ سڑکیں بہت اچھی ہموار' صاف شفاف اور کشادہ ہیں اور عموماً یک طرفہ ٹریفک کا نظام ہے۔ ہر کار کے لئے لین بنی ہوئی ہے اور سب لوگ اپنی اپنی لین میں چلتے رہتے ہیں۔ اگر کسی کو اوور ٹیک کرنا ہے تو اشارہ دے کر مناسب جگہ پر اوور ٹیک کر لیتا ہے۔ نہ ہارن دیتا ہے نہ ڈرائیور کو تنگ کرتا ہے۔ چپکے سے اپنی کار آگے نکال کر چلا جاتا ہے۔ اس طرح ڈرائیور کی نیند خراب نہیں ہوتی اور وہ اپنی مقررہ لین میں بڑے آرام سے چلتا رہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد بیدار ہوتا ہے تو آنکھیں کھول کر یہ چیک کر لیتا ہے کہ وہ اپنی ہی لین میں ایک مقررہ رفتار سے چل رہا ہے۔ باقی اللہ مالک ہے۔

ہم واجد صاحب کے ساتھ جس اسپتال میں گئے اس کا حال کیا بیان کریں۔ اس کے آس پاس بہت لمبا چوڑا خوب صورت باغ تھا۔ درمیان میں سفید انڈے جیسی شاندار عمارت بہت بھلی لگتی تھی۔ ہم تو یہ سمجھے کہ کوئی مہنگا ہوٹل ہے۔ مگر سائن بورڈ پر نظر پڑی تو پتا چلا کہ اسپتال ہے۔ ایسی پر فضا جگہ' اس قدر خوب صورت اسپتال ہو تو کس کافر کا بیمار ہونے کو جی نہ چاہے گا مگر ٹھہرئیے ایمان خراب کرنے کے لئے وہاں اور بھی بہت سی ایمان شکن چیزیں تھیں۔ مثال کے طور پر استقبالیہ پر تشریف فرما نیلے اور سفید لباس میں چمکتی دمکتی ہوئی خاتون' یورپ امریکہ والوں نے خواتین کا یہ استعمال بہت خوب نکالا ہے کہ سیلز گرلز لڑکیاں' استقبالیہ پر لڑکیاں' بینکوں اور دفتروں میں لڑکیاں' ٹکٹ فروخت کرنے کے لئے لڑکیاں' ٹکٹ کاٹنے کے لئے لڑکیاں۔ دراصل یہ کم محنت والے کام انہوں نے صنف نازک کے لئے وقف کر دیئے ہیں۔ مشکل اور محنت طلب کام مردوں کے ذمے ہیں اور اس پر مغرب کی خواتین کو مردوں پر برابری کا دعویٰ ہے۔ خیر ہمیں کیا لیکن طریقہ کار بہت اچھا ہے۔ اس طرح ماحول بہت ملائم' خوشبو دار' اور حسین ہو جاتا ہے۔ یہ خاتون ایک کمپیوٹر پر مصروف تھیں مگر ہمیں دیکھتے ہی کمپیوٹر کو چھوڑ دیا اور انتہائی خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا کہ کیا خدمت کی جائے؟

اسپتال میں کوئی کیا خدمت کرا سکتا ہے سوائے علاج یا آپریشن وغیرہ کے مگر ہم تو شوٹنگ کے لئے آئے تھے۔ واجد صاحب نے اپنی دو ہزار ڈالر والی مسکراہٹ ان کی جانب

اچھالی اور بتایا کہ ہم نے فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں بات کی تھی۔ اب وہ جگہ دیکھنے آئے ہیں۔ وہ ایک لمحے تو سوچتی رہیں پھر بولیں۔ آپ مسٹر کارٹن سے بات کر لیجئے۔ یہ کہہ کر فون ملایا اور واجد صاحب کے حوالے کر دیا۔ کارٹن صاحب کو بھی اس قصے کا پتا نہیں تھا۔ انہوں نے مس ڈمپل سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو درجن بھر لوگوں سے بات چیت کرنے کے بعد واجد صاحب کو مطلوبہ صاحب مل گئے۔ بات یہ ہے کہ یہ اسپتال بہت بڑا تھا اور ہر شعبہ بالکل الگ تھا جس کی وجہ سے ایک کی بات سے دوسرا واقف نہیں تھا۔ شاید نفسا نفسی اسی کو کہتے ہیں۔ بہر حال ہم نہایت چمک دار اور چکنے فرش پر چلتے ہوئے لفٹ کے نزدیک پہنچ گئے۔ فرش کی چمک دمک کا کیا بتائیں۔ واقعی شیشے کی مانند چمک رہا تھا۔ بلکہ ہمارے ہاں کے تو شیشے بھی نہیں چمکتے۔ مٹی اور گرد و غبار سے اٹے رہتے ہیں۔ لفٹ میں ہم سوار ہوئے تو دوسری منزل پر ایک نرس بھی اندر آ گئیں۔ ویسے انہیں نرس کہنا سفید جھوٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ کیا کوئی ہالی ووڈ کی ہیروئین ان کا مقابلہ کرے گی۔ ہم تو سمجھے کہ مصنوعی ہیں۔ غالباً شوٹنگ وغیرہ کے لئے آئی ہیں۔ اتنی خوب صورت، جامہ زیب اور اسمارٹ کہ بہت سے لوگ تو انہیں دیکھ کر بیمار ہو جاتے ہوں گے اور کون بدذوق مریض ہو گا جو ایسی نرس سے جدائی کا صدمہ برداشت کرتا ہو گا، مگر سنا ہے کہ بیماری میں انسان کچھ پتھردل ہو جاتا ہے۔ ورنہ کون ایسی بد ذوقی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ واجد صاحب بہت باتونی آدمی ہیں۔ انہوں نے فوراً نرس سے باتیں شروع کر دیں۔ مغرب کی عورتوں کی یہ بات ہمیں بہت پسند ہے کہ جو چاہے انہیں مخاطب کر لے وہ بڑے اخلاق بلکہ لگاوٹ سے جواب دیتی ہیں اور یہ ہرگز نہیں کہتیں کہ بلاوجہ بات کرنے کے بہانے مت ڈھونڈو۔ کیا گھر میں تمہاری ماں بہنیں نہیں ہیں!

واجد صاحب چھٹی منزل تک نرس سے باتیں کرتے رہے۔ اس کے آگے بے بس تھے کیونکہ اسپتال کی بس اتنی ہی منزلیں تھیں۔ نرس نے ہمیں اس کمرے تک پہنچا دیا۔ جہاں ہمیں جانا تھا۔ اسے کسی اور طرف جانا تھا مگر اخلاق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ حسن اخلاق تو ہم نے بھی سنا تھا مگر حسن اور اخلاق کا ایسا مجموعہ کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

اندر جو صاحب بیٹھے تھے ان کا نام تو ہمیں یاد نہیں رہا مگر اتنا یاد ہے کہ وہ بہت

ہنس مکھ تھے۔ بات بے بات ہنستے رہتے تھے یا شاید ان کے چہرے کی بناوٹ ہی ایسی تھی۔ بعض لوگ قدرتی طور پر ایسے ہوتے ہیں۔ خراب سے خراب خبر بھی یوں سنائیں گے جیسے کوئی خوش خبری سنا رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں یہ خوش خبری سنائی کہ ہمیں جس ونگ میں شوٹنگ کرنی تھی وہ تو خالی نہیں ہے مگر ایک اور ونگ خالی ہو گیا ہے، چونکہ دو مریض اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ پھر وہ ہمیں وہ جگہ دکھانے لے گئے ہم تو حیران ہوئے کہ ایسی خوب صورت، صاف ستھری اور خوش منظر جگہ کو چھوڑ کر مرجانا کس قدر بدذوقی کی بات ہے۔ راستے میں ہمیں نرسیں اور لیڈی ڈاکٹر ملتی رہیں۔ دراصل یہ حصہ ایسا تھا جہاں عورتیں زیادہ نظر آئیں۔ ہم نے پوچھا کیا یہ کوئی زنانہ وارڈ ہے؟

واجد صاحب نے جواب دیا: زنانہ وارڈ ہوتا تو آپ کو مریضوں کے سوا کوئی عورت نظر نہیں آتی۔ اسپتال کا وہ حصہ بالکل خالی پڑا ہوا تھا جہاں ہمیں شوٹنگ کرنی تھی۔ اسپتال والے بہت خوش اخلاق اور مددگار قسم کے تھے۔ انہوں نے پیش کش کی اگر ہمیں ڈاکٹر کی ضرورت ہو تو وہ بھی مل سکتے ہیں۔ مگر ہماری فلم میں تو ٹورنٹو کے ایک نوجوان اعظم صاحب ڈاکٹر کا کردار کر رہے تھے۔ البتہ ہم نے کہا کہ اگر کچھ نرسیں دستیاب ہو جائیں تو بہت مناسب رہے گا انہوں نے فوراً حامی بھر لی اور کہا کہ نرسیں آپ کو بہترین قسم کی مل جائیں گی۔ اگلے دن جب شوٹنگ کے لئے پہنچے تو دو بزرگ قسم کی نرسیں موجود تھیں۔ بال تو وہاں سبھی عورتیں رنگتی ہیں۔ میک اپ وغیرہ بھی خوب کرتی ہیں مگر اس تمام زیبائش کے باوجود ان کی بزرگی صاف ظاہر تھی۔ کل والے صاحب خیر خبر لینے آئے تو پوچھنے لگے۔ کیسے نرسیں پسند آئیں۔ یہ ہمارے اسپتال کی بہترین اور سب سے تجربے کار نرسیں ہیں۔ اب ہم ان سے کیا کہتے کہ بھائی یہ تو فلم ہے۔ اس میں ہمیں نرسوں کا تجربہ درکار نہیں ہے۔ صورت شکل اچھی ہونی چاہئے مگر وہ اس قدر خوش نظر آ رہے تھے کہ ہم نے خاموش رہنا ہی مناسب جانا۔ ہماری تو تمام دلچسپی ہی ختم ہو گئی۔ اس لئے اسپتال سے واپس چلے آئے۔

اسپتال میں شوٹنگ تو خیر ہو گئی، مگر اتفاق دیکھئے کہ ہمیں اسپتال جانے کا ایک اور بار بھی اتفاق پیش آیا۔ اس بار شوٹنگ کے سلسلے میں نہیں بلکہ سچ مچ بیماری کے سلسلے میں۔ ہوا یہ کہ ہمیں ہلکی سی حرارت ہو گئی۔ ایک دو روز تو ہم نے کوئی توجہ ہی نہیں دی،

مگر جب آنکھوں میں ہلکا ہلکا سا درد شروع ہو گیا اور حرارت نے بھی جانے کا نام نہیں لیا تو سب کو پتا چل گیا کہ ہمیں بخار ہو گیا ہے۔ بخار وغیرہ کے لئے بہت سی ہومیوپیتھک اور دوسری دوائیاں ہم سفر میں اپنے ساتھ رکھتے ہیں کیونکہ پردیس میں بیمار پڑ جانا خاصا پریشان کن اور مہنگا پڑتا ہے۔ یورپ، امریکہ میں تو ڈاکٹر سے وقت لیتے لیتے ہی کمزور مریض اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ وہاں کے لوگ اگر شدید بیمار ہو جائیں تو ڈاکٹر سے معائنے کا وقت ملنے تک کیوں کر زندہ رہتے ہیں؟ یا پھر یوں لگتا ہے جیسے موت کا فرشتہ بھی ان کے ڈاکٹروں سے ملا ہوا ہے۔ لیبارٹری والے تو خیر ڈاکٹروں کے ساتھ کمیشن رکھ ہی لیتے ہیں مگر ملک الموت صاحب بھی ڈاکٹروں سے کمیشن لیتے ہوں گے۔ اس بات کا یقین نہیں آتا۔ بہر حال ہم نے تو یہی دیکھا کہ ڈاکٹر سے ملاقات کا وقت طے ہونے تک کوئی صاحب مرے نہیں۔ پھر بھی احتیاط لازم ہے۔ اس لئے ہم کام کی ساری دوائیں اپنے ہمراہ رکھنے کے عادی ہیں۔ حرارت جب دو تین دن جاری رہی تو ہم نے سوچا کہ کوئی مناسب ہومیوپیتھک یا ایلوپیتھک دوائی استعمال کریں، مگر اتنی دیر میں واجد صاحب تشریف لے آئے۔ انہوں نے ہماری داستان سنی اور پھر بولے "آفاقی صاحب، آپ لوگ بھی کمال کرتے ہیں۔ ارے بھئی، آپ لوگوں نے سارے فلم یونٹ کی ہیلتھ انشورنس کرائی ہے اور اس مقصد کے لئے ڈھیر سارے ڈالر دیے ہیں تو پھر آپ مفت میں علاج کیوں نہیں کراتے؟"

ہم نے کہا "مگر ہمیں کوئی خاص بیماری نہیں ہے۔ بس ایسے ہی ذرا حرارت ہو جاتی ہے۔"

کہنے لگے "پھر بھی اپنا مال تو حلال کرنا چاہئے۔ اٹھئے چلئے میرے ساتھ۔ ابھی آپ کو اسپتال لے چلتے ہیں۔"

"ارے نہیں بھئی۔ اسپتال جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

مگر سب ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ اسپتال ضرور جاؤ۔ آخر ہم نے ہیلتھ انشورنس کس لئے ادا کی ہے۔ للی نے بھی یہی مشورہ دیا کہ اس بہانے آپ کا مکمل چیک اپ ہو جائے گا۔ ہم نے کہا "مگر کس لئے بھئی ہم تو بھلے چنگے ہیں۔"

کہنے لگیں "چیک اپ کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ احتیاطاً سب چیزوں کو چیک کر لیا

جائے کہ واقعی درست حالت میں ہیں آخر ہم نے ان لوگوں کو ہیلتھ انشورنس کے لئے اتنے پیسے دیئے ہیں تو اس کا فائدہ بھی اٹھانا چاہئے۔" اور تو اور پرویز ملک بھی دہائیاں دینے لگے "آفاقی صاحب! خدا خدا کر کے پیسہ حلال کرنے کا موقع ملا ہے تو آپ گھبرا رہے ہیں فوراً جائیں اور علاج کرائیے، بلکہ میری مانیں تو اسپتال میں داخل ہو جائیے۔"

شاہ جی کو بھی افسوس ہو رہا تھا کہ اتنا اچھا موقع ہاتھ سے گنوا دیا گیا۔ کہنے لگے "ہمیں تو یاد نہیں رہا ورنہ سب کے سب چیک اپ کرانے کے لئے اسپتال میں داخل ہو جاتے۔"

"اور شوٹنگ کون کرتا؟"

"اسے سپرد خدا کر دیتے۔"

جب دیکھا کہ اکثریت بلکہ سب کے سب ہمارے اسپتال جانے کے حق میں ہیں تو ہم نے بھی صبر کر لیا۔ دراصل اسپتالوں اور ڈاکٹروں سے ہماری جان اس لئے جاتی ہے کہ یہ حضرات سوائے اینٹی بائیوٹک ادویات اور "مائی سینوں" کے کسی اور دوائی کے قائل ہی نہیں ہیں۔ باہر کے ملکوں میں تو پھر بھی قدرے احتیاط برت لیتے ہیں مگر پاکستانی ڈاکٹروں نے تو گویا قسم کھا لی ہے کہ چھینک کا علاج بھی مائی سین سے کریں گے۔ یہی حال دوسرے ایشیائی ملکوں کا بھی ہے۔

ایک بار ہم کولمبو میں بیمار ہو گئے۔ نذر شباب کی فلم "کبھی الوداع نہ کہنا" کے سلسلے میں کولمبو گئے تھے اور دیکھا جائے تو سوائے شوٹنگ اور ہدایت کاری کے سارے انتظامات ہمارے ذمے تھے۔ جاوید شیخ کو دس سال کے طویل عرصے بعد دوبارہ فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا تھا اور اس میں ہماری سفارش اور اصرار کا بھی دخل تھا۔ جاوید ہمارے ساتھ ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ کہنا چاہئے کہ ہمارے بخار کے دنوں کے ساتھی تھے۔ یہ بخار بھی عجیب و غریب تھا۔ سارے دن ہم ٹھیک ٹھاک رہتے، چلتے پھرتے، شوٹنگ پر جاتے، سیر و تفریح کرتے۔ رات کا کھانا خوب پیٹ بھر کر کھاتے اور اس کے بعد ہمیں سردی لگنی شروع ہو جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دانت بجنے لگتے اور تمام کمبل، چادریں، تولئے وغیرہ ہمیں اوڑھا دیئے جاتے۔ ائرکنڈیشنر بند کر دیا جاتا۔ اس کے باوجود سردی کم ہونے کا نام نہ لیتی۔ اس کے بعد تپ چڑھنی شروع ہوتی۔ بخار اتنا تیز کہ جس پر

رکھ کر مکئی کے بھٹے بھون لیجیے۔ دو تین گھنٹے تک بڑے زور کا بخار چڑھتا۔ جسم لرز
لگتا' ہاتھ پیر کپکپانے لگتے' سر جھن جھنانے لگتا' پھر رفتہ رفتہ پسینہ آتا۔ پہلے کم' اس
بعد زیادہ۔ یہاں تک کہ یوں لگتا جیسے ہم کہیں سے نہا کر آئے ہیں۔ ایک ایک کر کے تم
چادریں' تولئے اور کمبل اتار دیے جاتے اور پھر کپڑے تبدیل کرنے کا سلسلہ شروع
جاتا۔ دو تین بار کپڑے تبدیل کرتے یہاں تک کہ بخار کم ہو جاتا اور ہم سو جاتے۔
آٹھ نو بجے سو کر اٹھتے تو بخار کا دور دور تک نام و نشان تک نہ ہوتا۔ نہ کسی قسم
کمزوری' نہ جسم یا سر میں درد۔ بالکل چاق و چوبند' مستعد۔ اٹھ کر شیو کرتے' نہاتے ا
خوب پیٹ بھر کر ناشتا کرتے اور پھر سارے دن بالکل تندرست اور ایکٹو رہتے۔ یہا
تک کہ شام ہو جاتی اور پھر وہی سردی چڑھنے کا معمول شروع ہو جاتا۔ دیکھا جائے تو
بخار ہمارے کسی کام میں حارج نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ رات کپکپاتے اور پسینے م
نہاتے گزر جاتی تھی۔ جب کئی دن رات اسی طرح گزرتے تو ہم نے ایک ڈاکٹر صاحب
سے مشورہ کیا۔ ان کے نام کے آخر میں ٹنگا آتا تھا۔ سری لنکا میں لوگوں کے ناموں
آخر میں ٹنگا' نائیکے' وردھنے وغیرہ ضرور آتا ہے۔ شروع شروع میں جب ہمیں لوگوں
پورے نام یاد نہیں ہوتے تھے تو ہم ٹنگا یا نائیکے سے کام چلانے کی کوشش کرتے تھے
پھر معلوم ہوا کہ یہاں تو ہر ایک کے نام کا اختتام اسی طرح ہوتا ہے۔ گویا اس حد تک
سبھی ہم نام ہیں۔ خیر ہم ڈاکٹر صاحب کے کلینک میں گئے جہاں بے شمار لوگ اپنے نمبر
ٹکڑیاں لئے بیٹھے تھے۔ ایک خاصے گہرے کالے رنگ کی نرس باہر تشریف فرما تھیں انہو
نے ایک ٹکڑا ہمارے ہاتھ میں بھی تھما دیا جس کا نمبر ۹۴ یا ۹۸ تھا۔ اس طرح تو شاید را
کے وقت ہماری باری آتی۔ ہم نے نرس کی جانب دیکھا جو کنکھیوں سے ہمیں دیکھ رہ
تھی۔ وہ پوچھنے لگی "کیا آپ غیر ملکی ہیں؟"

"جی ہاں' ہم پاکستان سے آئے ہیں اور بہت جلدی میں ہیں۔"

"جلدی کس بات کی ہے؟ کیا ہوائی جہاز لیٹ ہونے کا خطرہ ہے؟"

"جی نہیں ہماری شوٹنگ لیٹ ہونے کا خطرہ ہے۔"

انہیں جیسے ہی پتا چلا کہ ہم فلم والے ہیں وہ فوراً مسکرانے لگیں۔ دوڑی دوڑ
اندر گئیں اور ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ پاکستان سے ایک فلم والے آئے ہیں۔ انہوں۔

ی طور پر ہمیں اندر کلینک میں طلب کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب خاصے بھاری بھرکم تھے۔ عمر
ساٹھ سے اوپر لیکن تیس کے لگتے تھے۔ یہ سری لنکا کے لوگ عمر کے معاملے میں ایسے ہی
چور" ہوتے ہیں۔ کیا مجال جو آپ ان کی صحیح عمر کا اندازہ لگا سکیں۔ آپ جسے پچیس
سمجھ رہے ہیں وہ پچپن سالہ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ساٹھ سالہ پچیس سالہ بھی
سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بیٹھنے کو کہا۔ پھر چائے
کو پوچھا۔ بہت دیر تک لاہور کی باتیں کرتے رہے۔ دراصل وہ لاہور کے کنگ ایڈورڈ
یکل کالج میں پڑھ چکے تھے اور زمانہ طالب علمی میں کئی سال لاہور شہر کی خوبیوں کا مزہ
تھا۔ وہ تو لاہور کے عاشق نکلے۔ ایک ایک جگہ کے بارے میں پوچھا۔ مال اور باغ
ہ کا حال دریافت کیا۔ نہر کے کنارے والے درختوں کی مزاج پرسی کی۔ ہم تو بھول
تے یہاں تک کہ باہر والے مریضوں نے پریشانی کا اظہار شروع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب
ہمیں مائی سین لکھ کر دی اور کہا کہ چاہے یہاں سے خریدیں' چاہے بازار سے لیں'
پانچ دن کا کورس مکمل کریں۔ بخار دو دن بعد ہی غائب ہو جائے گا۔ سری لنکا میں
وں کی فروخت پر کافی پابندی ہے۔ ڈاکٹری نسخے کے بغیر چند دوائیوں کے سوا آپ کچھ
خرید سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے اگلے روز پھر آنے کی دعوت دی۔ اتنے جذباتی ہو گئے
ہم سے فیس تک نہیں لی۔ بلکہ وہ دوائیوں کے پیسے بھی نہیں لے رہے تھے۔ بڑی
ماسے ہم نے انہیں قیمت لینے پر آمادہ کیا۔ البتہ یہ کہہ دیا کہ اگر دو دن کے اندر بخار
ترا تو سارے پیسے واپس لے جائیں گے۔ رات کو پھر کپکپی اور پسینے والا عمل دہرایا
دو دن یوں ہی ہوتا رہا یہاں تک کہ تیسرے دن بخار اتر گیا۔ بخار تو اتر گیا مگر کمزوری
ہو گئی کہ اب بخار کے بغیر ہی ٹانگیں کپکپاتی تھیں اور سر چکراتا تھا۔ بخار نے ہمیں
تک نہیں کیا جتنا پریشان اس علاج نے کر دیا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ تین دن بعد
پھر بخار نے گھیر لیا مگر اس بار کپکپی والا بخار نہیں تھا۔ یہ بخار سردی کے بغیر اچانک
تھا اور کسی طرح اترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ہم نے فوراً ٹنگا صاحب سے رجوع کیا۔
خیال تھا کہ اس بار معدے میں انفیکشن ہو گئی ہے۔ اس لئے دوبارہ مائی سین کھانی
۔ یہ کورس تین روز کا تھا اور تین ہی دن میں بخار اتر گیا' مگر کمزوری کا یہ عالم تھا کہ
تے ہوئے بھی ہانپنے لگتے تھے اور سوچتے تھے کہ اس سے تو کانپنے والا بخار ہی اچھا

تھا۔ تیسرے دن ہمیں پھر بخار نے جکڑ لیا۔ اس بار نہ تو بخار سردی کے ساتھ آتا ت
پسینے کے ساتھ جاتا تھا' نہ اچانک چڑھتا تھا۔ ننگا صاحب نے سنا تو بذات خود تشر
لائے۔ معائنہ کرنے کے بعد بولے اس بار ایسی دوائی دوں گا کہ ہر قسم کا بخار غائب
جائے گا۔

ہم نے پوچھا "اور خود ہمارا کیا ہو گا؟"

بولے "وہی جو بخار کا ہو گا۔"

"یعنی کیا ہم بھی غائب ہو جائیں گے؟"

بولے "ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر پھر ایک اور مائی سین لکھ کر چلے گئے۔ ہم
سوچا کہ مرنا تو ایک دن برحق ہے پھر "مائی سین" کی موت کیوں مرا جائے؟ لہٰذا
منگانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اللہ توکل ہو کر بیٹھ گئے۔ اللہ میاں کو ہماری یہ ادا اتن
آئی کہ انہوں نے ہمیں ہر قسم کے بخار سے نجات دے دی۔ دوسرے دن ننگا صاح
تشریف لائے۔ بخار کو غائب دیکھ کر بے حد خوشی کا اظہار کیا اور بولے "دیکھا ہماری
کا اثر؟"

ہم نے چپ رہنا ہی مناسب جانا' مگر یہ عہد کر لیا کہ پھر کبھی "مائی سین" وا
ڈاکٹر کے قابو میں نہیں آئیں گے۔ "مائی سین" اور ڈاکٹروں کا یہ تجربہ ہمیں بارہا غ
ملکوں میں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ہومیوپیتھک ادویات اپنے ساتھ رکھنی شرو
دیں۔ اور اسپتال یا ڈاکٹر کو دور ہی سے سلام کر لیا' مگر اب کینیڈا میں ہمارے "ا
ہمیں زبردستی اسپتال بھیج رہے تھے۔ سب کی متفقہ رائے یہی تھی کہ ہمیں اسپتال
مفت میں چیک اپ ضرور کرانا چاہئے ورنہ کم از کم بخار کا علاج تو کرا ہی لینا چاہیے۔

ہمیں اسپتال لے جانے کا فریضہ ادا کرنے کے لئے واجد صاحب موجود
دراصل واجد صاحب کو ہم نے ایک "پیدائشی رضا کار" پایا۔ ہر قسم کے اور ہر شخص
کام کے لئے وہ فوراً اپنی خدمات پیش کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسپتال لے جانے کا کام
انہوں نے اپنے ذمے لے لیا۔ ہم مارکھم کے علاقے میں تھے اور اسپتال سکار بور
واقع تھا۔ جب واجد صاحب نے راستے میں جماہیاں لیتے ہوئے یہ اطلاع ہمیں فراہم
ہم نے ان سے عرض کی کہ حضرت آپ اپنی آنکھیں کھلی اور منہ بند رکھیے۔ ایسا

ہم مارکھم سے سکار بورو پہنچنے کے بجائے براہ راست "سکائی" پر پہنچ جائیں۔ وہ نیم
گی کے عالم میں ہنسے اور بولے "دیکھئے آپ میرے سونے سے پریشان نہ ہوں۔ یہ میری
نی عادت ہے اور خدا کا شکر ہے کہ آج تک کوئی حادثہ رونما نہیں ہوا ہے۔"

ہم نے کہا "مگر واجد صاحب! خدارا آپ کبھی بستر پر لیٹ کر بھی سو لیا کیجئے۔ یہ کار
تے ہوئے سونا کہاں کی شرافت ہے؟"

انہوں نے ایک آہ بھری اور کہنے لگے "بستر پر لیٹ کر سونا ہم کینیڈا والوں کی
ہیں کہاں؟"

غرض یہ کہ اسی طرح سوتے جاگتے انہوں نے ہمیں سکار بورو سینٹی نیری اسپتال
دیا۔ دور سے دیکھا کہ ایک کئی منزلہ خوب صورت عمارت باغات اور سبزہ زاروں میں
ی ہوئی ہے۔ سامنے ایک بہت بڑا پارکنگ لاٹ ہے جس میں بے شمار کاریں کھڑی
۔ بڑی شاندار جگہ تھی۔ یوں لگا جیسے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں آگئے ہیں۔ اس لئے ہم
واجد صاحب سے کہا "بھائی یہ ہوٹل میں کہاں لے آئے۔ ہمیں تو اسپتال جانا ہے۔"

بولے "یہ اسپتال ہی ہے۔ وہ سامنے دیکھئے۔"

سامنے اسپتال کا نام لکھا ہوا تھا "سکار بورو سینٹی نیری اسپتال۔" کہنے لگے یہ
ل سکاربورو کے علاقے میں رہنے والوں کے لئے ہے۔ ہر علاقے میں ایسا ہی ایک
ل ہے۔

ہم نے سوچا اس شہر کی آبادی اتنی کم ہے اور اسپتال اتنے بہت سے اور اتنے
بڑے ہیں تو یہاں تو فی آدمی ایک اسپتال یا کم از کم ایک کمرہ ضرور ان کے حصے میں
وگا۔ اور پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ یہاں کے لوگ زیادہ بیمار بھی نہیں ہوتے۔ یعنی یہ
کی جو بیماریاں ہم لوگوں کی جان کو چمٹی رہتی ہیں۔ وہ انہیں لاحق نہیں ہوتیں۔
ستھرا ماحول' صحت مند فضا' ملاوٹ سے پاک خوراک' جراثیم سے صاف پانی' نہ
دھواں نہ گرد و غبار۔ ظاہر ہے کہ بہت سی بیماریاں تو ان وجوہات کی بنا پر انہیں لاحق
ہوتیں۔ البتہ یہ لوگ بڑے اور سنگین امراض میں ضرور مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دل
ض' کینسر' السر۔ یہ بیماریاں عام ہیں۔ ان میں مبتلا مریضوں کو بھی بچانے کی آخری
ر کوشش کی جاتی ہے۔ جان نہ بچا سکیں تو کم از کم ان کی زندگی میں اضافہ ضرور ہو

جاتا ہے۔ ہم نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ ملک الموت صاحب کے ان لوگوں سے تعلق خاصے خوشگوار ہیں اور وہ انہیں کافی رعایت دیتے ہیں۔ یوں بھی کینیڈا وہ ملک ہے جہا صحت کا مسئلہ انتہائی خوش اسلوبی سے حل کیا گیا ہے۔ تمام آبادی کا علاج حکومت طرف سے ہوتا ہے اور اسپتال اتنے شاندار کہ کیا عرض کریں۔ جی چاہتا ہے بس یہیں پڑیں۔ پڑوسی ملک امریکہ میں بیمار پڑنا جس قدر مشکل اور اذیت ناک ہے کینیڈا میں یہ ہی خوشگوار اور آسان ہے۔ یہاں فلاحی حکومت ہے جو لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے کرتی ہے۔ محض زبانی جمع خرچ کے ذریعے انہیں بہلانے یا "اسلامی نظام حکومت م صحت کا مسئلہ کیسے حل ہونا چاہئے" یہ سمجھانے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتی۔ اسلا فلاحی حکومت کا جو نقشہ ہمارے لیڈر ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اگر ا خواب کی عملی تعبیر دیکھنا ہو تو کینیڈا تشریف لے جایئے۔ اس سے آپ کو کم سے کم یقین ضرور ہو جائے گا کہ ہمارے مولوی صاحبان اور لیڈر حضرات جو کچھ فرماتے ہیں محض ہوائی قلعے نہیں ہیں بلکہ ان پر عمل درآمد بھی ہو سکتا ہے' بلکہ ہو بھی رہا ہے ہمارے خیال میں ہمارے ملک کی سیاسی جماعتوں کو چاہئے کہ اپنی تقریریں سنانے کے ب ووٹروں کو کینیڈا جیسے ملکوں کا ایک چکر بھی لگوا دینا چاہئے کہ دیکھئے' یہ ہے ہمارے وعد عملی ثبوت۔ اس طرح لوگوں کو یہ صبر تو آجائے گا کہ یہ حضرات جو کچھ کہہ رہے ہیں محض طفل تسلیاں نہیں ہیں' ایسا ہونا ممکن بھی ہے۔

اسی اثنا میں (جب کہ ہمارے ذہن میں بے معنی اور فاسد خیالات گردش کر ر تھے) واجد صاحب اسپتال کے گرد ایک لمبا چکر لگانے میں مصروف تھے۔

ہم نے کہا "بھائی کیا کر رہے ہو۔ چاروں طرف گھوم پھر کر اسپتال دکھانے کی ک ضرورت ہے' بس دیکھ لیا۔"

کہنے لگے "اسپتال نہیں دکھا رہا ہوں۔ کار پارک کرنے جا رہا ہوں۔"

"مگر اتنا لمبا چکر کاٹنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ وہاں اتنی بہت سی خالی جگہ پڑی تھی۔

بولے "مگر وہاں داخلہ یک طرفہ ہے۔ مقررہ جگہ سے ہی اندر جا سکتے ہیں۔"

بس یہ خرابی ہے ان ملکوں میں کہ ہر کام قاعدے قرینے کے مطابق کرو۔ خیر ہ

اچھی چیز کے کچھ برے پہلو بھی ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے کہ کار پارک کرنے کے لئے خواہ مخواہ اتنا لمبا چکر کاٹنا پڑا ہے۔ ہمارا ملک ہوتا تو جہاں سے اندر داخل ہوئے تھے وہیں مزے سے کار پارک کر دیتے۔ اس بات سے یہ ثابت ہوا کہ اپنے ملک میں سبھی کچھ برا نہیں ہے۔ کچھ اچھے پہلو بھی ہیں۔

اسپتال کی عمارت میں داخل ہوئے تو ہم پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اتنی صاف شفاف خوب صورت عمارت فرش چکنا اور چمکدار' در و دیوار آف وھائٹ جیسے انڈا۔ خیر اب اتنی زیادہ تفصیل بھی کیا بیان کریں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ اسپتال کیا تھا ایک میوزیم تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ سبھی کچھ تھا مگر مریض نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ خدا جانے یہ لوگ مریضوں کو چھپا کر رکھتے ہیں یا کیا کرتے ہیں ایک ہمارے اسپتال ہیں جہاں سوائے مریضوں کے اور کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اپنے اپنے طریقے ہیں۔

ایک دو گیلریوں اور برآمدوں سے گزر کر ہم ایک کشادہ لاؤنج میں پہنچ گئے۔ یہ
اسپتال کی لابی تھی۔ درمیان میں ایک بہت بڑا سا کاؤنٹر تھا جس کے سامنے دو تین خواتین
سفید لباس پہنے بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ یوں لگا جیسے مسکرانے کا کوئی مقابلہ ہو رہا ہے۔
تینوں کی تینوں نے ہمیں دیکھ کر مسکرانا شروع کر دیا تھا۔ شکل و صورت میں بھی نک سک
سے درست تھیں۔ اسمارٹ ایسی کہ نمونے کے طور پر پیش کرسکتے ہیں اور کیوں نہ ہوں
آخر ایک اسپتال کی نرسیں تھیں۔ اگر نرسیں ہی تندرست اور اسمارٹ نہ ہوں تو
مریضوں پر اس اسپتال کا کیا خاک تاثر قائم ہو گا؟

ہم نے بھی بلا ارادہ مسکرانا شروع کر دیا۔ یہ انسانی نفسیات ہے کہ اگر کوئی آپ
کے سامنے مسکرا رہا ہے تو جواب میں آپ بھی ازخود مسکرانا شروع کر دیں گے۔ شاید اس
ڈر سے ہمارے ہاں لوگ مسکرانے میں بہت احتیاط برتتے ہیں اور بے حد کنجوسی سے کام
لیتے ہیں ہم ابھی اور مسکراتے مگر واجد صاحب کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ وہ کہہ رہے
تھے "اپنا انشورنس کارڈ نکال کر دیجئے۔"

ہم نے جیب سے کارڈ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ ایک خاتون نے کارڈ اٹھا کر دیکھا
اور پھر ایک فارم پُر کر کے ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ہم نے اپنے آٹوگراف اس پر ثبت
کئے تو انہوں نے کارڈ اور فارم کو چند کمپیوٹر مشینوں میں ڈال کر نکالا اور پھر کارڈ ہمارے
حوالے کر دیا۔ اس تمام عرصے میں مسکراہٹ نے ایک لمحے کے لئے بھی ان کے رخ
روشن کو نہ چھوڑا۔ پھر انہوں نے ہم سے مخاطب ہو کر بڑے شیریں لہجے میں کہا
"سامنے تشریف لے جائیے۔ دائیں ہاتھ کو ہولڈنگ روم ہے۔ وہاں آپ کو ایک اور
میزبان ملیں گی۔ خدا حافظ۔ ٹیک کیئر "یعنی اپنا خیال رکھنا" کس قدر پُر خلوص گفتگو اور

کتنے نیک اور ہمدردانہ جذبات تھے۔ ایسا برتاؤ تو رشتے دار بھی نہیں کرتے۔ پھر وہ تو غیر
تھیں اور حسن میں بھی بے مثال تھیں یعنی اگر غرور کرتیں تو الزام نہیں دیا جا سکتا تھا۔
ہم تو سوچتے ہی رہ گئے مگر واجد صاحب نے ہمارا کارڈ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور شکریہ
ادا کر کے ہمارے ساتھ چل پڑے۔

ہم نے کہا "کتنا پُرخلوص اور دوستانہ ماحول ہے۔"

انہوں نے کہا "زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔"

ہم نے کہا "واجد صاحب! ہم جذباتی نہیں ہو رہے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کر
رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے اسپتالوں میں تو لوگوں کو بدمزاجیوں اور جھڑکیوں کے
سوا کچھ نہیں ملتا حالانکہ یہ بھی سرکاری اسپتال ہے اور یہاں آنے والوں کا علاج مفت
میں ہوتا ہے۔"

کہنے لگے "ہر وقت موازنہ اور حساب کتاب نہ کرتے رہئے۔ صبر شکر بھی کرنا
چاہئے انسان کو۔"

ہولڈنگ روم جانے کے لئے ہمیں پھر گیلریوں سے گزرنا پڑا۔ ہر چیز شیشے کی مانند ہی
تھی۔ سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ تھی کہ اب تک ہمیں فنائیل کی بدبو نہیں آئی
تھی۔ پتا نہیں یہ لوگ اپنے اسپتال کے جراثیم کو کس طرح مارتے ہیں۔

ہولڈنگ روم دراصل ایک بڑا سا ہال تھا' بالکل سامنے میز رکھے ایک اور خوش
مزاج اور دلکش خاتون تشریف فرما تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ یوں مسکرائیں جیسے طویل
عرصے کے بعد کسی کھوئے ہوئے عزیز کو دیکھا ہو۔ پھر مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ ہماری
جانب بڑھا دیا۔ ہم نے فوراً ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر "ہائی" کہا۔

واجد صاحب نے ہمیں ٹہوکا مارا اور سرگوشی کی "کارڈ دیجئے" گویا انہوں نے کارڈ
طلب فرمایا تھا ہم سے مصافحہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر خیر' پردیسیوں سے ایسی
غلطیاں سرزد ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ہمارا کارڈ دیکھ کر وہ پھر مسکرائیں جیسے کوئی خوشی کی خبر
مل گئی ہے۔ بولیں "آئیے میرے ساتھ" یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔
اب ہم نے دیکھا کہ اس ہال کے ایک جانب بہت سے سفید پردے پڑے ہوئے تھے۔
انہوں نے ایک پردے کے نزدیک جا کر اسے ہٹایا تو اندر ایک صاف ستھرا بیڈ نظر آیا۔

دراصل یہ تمام کمرے تھے جن کی دیواریں پردوں کی تھیں۔ انہوں نے ہمیں اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا اور جوں ہی ہم پردے کے پیچھے گئے انہوں نے ہاتھ بلند کر کے اس پردے کو برابر کر دیا۔ اب ہم ایک کمرے میں تھے جس کے اردگرد پردوں کی دیواریں تھیں۔ پھر وہ ہم سے مخاطب ہو کر بولیں "آپ آرام کیجئے' کچھ دیر انتظار کرنا ہو گا۔" یہ کہا اور رخصت ہو گئیں۔ ان کے جاتے ہی واجد صاحب نے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا اور بولے "تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آکر آپ کا معائنہ کرے گا۔ میں رخصت ہوتا ہوں آدھے گھنٹے بعد باہر لابی میں ملوں گا۔" اور وہ بھی رخصت ہو گئے۔

ہم کھڑے سوچتے رہے کہ کیا کریں؟ بستر پر لیٹ جائیں یا کمرے میں موجود واحد کرسی پر بیٹھیں۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کرپائے تھے کہ پردہ ہٹا اور ایک روشن چہرہ اندر داخل ہوا۔ ان کے ہاتھ میں ایک ریشمی نیلے رنگ کا گاؤن تھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے گاؤن ہماری جانب بڑھا دیا۔ اور کہا "یہ پہن لیجئے۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو"

وہ بات کاٹ کر بولیں "پلیز' یہ تو آپ کو پہننا ہو گا۔

ہم نے بہ مجبوری گاؤن لے کر پہننے کی کوشش کی۔ کہنے لگیں "ایسے نہیں۔"

ہم نے پوچھا۔ "تو پھر کیسے۔ کیا جوتے اتار دیں؟"

بولیں" صرف جوتے ہی نہیں۔ ہمارے کپڑے اتار کر یہ گاؤن پہن لیں۔"

ہم نے خاموشی سے گاؤن لے لیا اور کرسی پر بیٹھ کر جوتوں کے فیتے کھول کر جوتے اتار دیے۔ انہیں دیکھا تو وہ بدستور موجود تھیں۔ کہنے لگیں "جلدی کیجئے' ڈاکٹر آتے ہی ہوں گے۔"

ہم نے پھر انہیں دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ آپ باہر جائیں تو ہم لباس اتار کر گاؤن پہن لیں۔ شاید وہ ہمارا مطلب سمجھ گئیں۔ معنی خیز انداز میں مسکرائیں اور باہر چلی گئیں۔ ہم نے کم سے کم وقت میں لباس اتار کر گاؤن پہن لیا۔ ڈر تھا کہ کسی لمحے وہ پھر پردہ اٹھا کر نہ آجائیں۔ گاؤن بہت ملائم اور ریشمی تھا۔ قیمتی بھی ہو گا۔ ہم آرام سے بستر پر دراز ہو گئے اور سوچنے لگے کہ یہ آج صبح صبح ہم نے کس کا منہ دیکھا تھا جو اس طلسمی محل میں آگئے ہیں۔

یکایک پردہ اٹھا اور اس بار ایک اور خوش اندام مسکراتی ہوئی اندر آئیں۔ انہوں
ز ایک چھوٹی سی پہیوں والی ریڑھی جیسی چیز ہاتھ میں کتے کی زنجیر کی طرح تھام رکھی
ں معلوم ہوا کہ اس میں بلڈ پریشر چیک کرنے کا آلہ بھی لگا ہوا ہے اور بھی بہت کچھ تھا
ران صاحبہ نے دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ایک تھرما میٹر ریڑھی میں سے نکالا اور
رے منہ میں ٹھونس دیا۔ پھر ہمارے گاؤن کی آستین اٹھا کر بلڈ پریشر چیک کرنا شروع کر
۔ اس تمام کارروائی کے دوران وہ خاموشی سے ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہیں۔ ہم جواباً
رانے سے معذور تھے کیونکہ تھرما میٹر گر جانے کا اندیشہ تھا۔ تھرما میٹر منہ سے نکلا تو ہم
بھی مسکرانا شروع کر دیا۔ انہوں نے اسی ریڑھی میں لگی ہوئی ایک نوٹ بک پر کچھ
ا اور مسکراتے ہوئے بمعہ ریڑھی رخصت ہو گئیں۔ ہم دوبارہ بستر پر لیٹ گئے سوچ
ہے تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہم جاگ رہے ہیں یا عالم خواب میں ہیں؟ اچانک پھر
ہلا اور ایک اور مسکراتا ہوا چہرہ اندر آگیا۔ یہ درمیانی عمر کی مگر اچھی شکل و صورت کی
ون تھیں۔ وہ کیونکہ سادہ لباس میں تھیں اس لئے اندازہ ہوا کہ نرس نہیں ہیں بلکہ
ر قسم کی چیز ہیں۔ انہوں نے "ہائی کہا اور بیڈ پر ہمارے پاس بیٹھ گئیں۔ ابھی ہم ان کی
حرکت پر غور ہی کر رہے تھے کہ انہوں نے کہا "منہ کھولیں" ہم نے منہ کھول دیا اور
ں نے حلق' گلا' کان' ناک' سینہ' کمر' ہاتھ پیر سبھی چیزوں کا معائنہ کر لیا۔ سارے کام
ا اشاروں کی مدد سے ہو رہے تھے۔ وہ ہمیں اشارہ کرتیں تو ہم منہ کھول دیتے' اشارہ
یں تو ہم لیٹ جاتے' ان کے اشارے پر کروٹ بدل لیتے' کسی اشارہ پر اٹھ کر بیٹھ
تے۔ کبھی ہاتھ آگے بڑھا دیتے۔ کبھی پیر آگے کر دیتے۔ خاصی تفصیل کے ساتھ انہوں
ہمارا چیک اپ کیا وہ بالکل خاموش رہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ہم تو بول ہی نہیں سکتے
۔ حالانکہ ان کے ٹھنڈے گرم ہاتھ اور انگلیاں جب جسم پر کسی جگہ چھوتے تو ہمیں
لدی سی ہونے لگتی مگر برداشت کرتے کہ ہنسنا منع تھا۔ بہرحال یہ سب کام کرنے کے
وہ مسکرائیں اور بولیں "پلیز انتظار کیجئے۔ ڈاکٹر ابھی آتے ہیں۔" جانے سے پہلے
ں نے ایک نوٹ بک پر کچھ لکھا۔ ہماری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور رخصت ہو
ئیں۔ شاید یہ مسکرانا اس اسپتال کے عملے کی ڈیوٹی میں شامل ہے۔ جسے دیکھئے وہ مسکراتا
رہتا ہے۔

ہم دوبارہ بستر پر دراز ہوئے اور خاصے فکر مند ہو گئے۔ اتنے بہت سے چیک اپ کے بعد ہمیں یہ ڈر ہونے لگا تھا کہ کہیں ہم واقعی زیادہ بیمار تو نہیں ہو گئے۔ ورنہ ایک معمولی سی حرارت پر یہ سب تردد بلا وجہ تھا۔ ہمیں یہ بھی علم تھا کہ یہ حرارت گلے کی خرابی کے سبب سے تھی۔ اس کے علاج کے لئے ہومیوپیتھک دوائی بھی ہمارے پاس موجود تھی' مگر اسپتال آنا ہماری تقدیر میں لکھا تھا' سو آگئے' مگر اب تک کا وقت ہم نے بہت دلچسپی اور لطف کے ساتھ گزارا تھا۔ آگے جو ہو سو ہو۔

کچھ دیر بعد کوئی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہال میں داخل ہوا اور پھر ہمیں برابر کے پردے کے پیچھے سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو میرا نام فلو ہے آپ کا کیا حال ہے؟"

جواب میں ایک زنانہ آواز نے انہیں کچھ بتانا شروع کر دیا۔ پتا چلا کہ ہمارے آس پاس کے پردوں کے پیچھے بھی بہت سے بیمار مسیحا کے انتظار میں تھے اور یہ صاحب جو تشریف لائے ہیں ڈاکٹر تھے۔ مگر ڈاکٹر کا نام "فلو" کچھ عجیب سا لگا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر ٹائیفائیڈ' کوئی ڈاکٹر بران کائٹس ہو۔ یا پھر کوئی ڈاکٹر مسک کف کہلانے لگیں۔ خیر' اپنے اپنے طریقے ہیں۔ ہمیں کیا' چند منٹ تک ڈاکٹر صاحب وہاں مصروف رہے اور کچھ بولتے رہے۔

پھر وہ چلتے ہوئے ہمارے کمرے کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ بولے "ہیلو" میرا نام فلو ہے۔ آپ کا کیا حال ہے؟"

ہم نے فوراً انہیں اپنی حرارت کا اور اسپتال والوں کی حرکتوں کا حال سنایا۔ انہوں نے ہماری نبض پر ہاتھ رکھا۔ کان' ناک' سینہ دیکھا۔ پھر منہ کھلوا کر حلق کے اندر جھانکا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے "آپ غیر ملکی لگتے ہیں؟" ہم نے بتایا کہ پاکستانی ہیں۔ وہ بولے "میں سمجھ گیا تھا کہ آپ ہندوستانی ہیں۔"

ہم نے کہا "مگر ہم تو پاکستانی ہیں۔" پھر ہم نے انہیں پاکستان اور ہندوستان کا فرق بتایا۔

انہوں نے رسمی طور پر پاکستان کے بارے میں چند سوالات کئے۔ پھر کہنے لگے "سنو علی' تمہیں ہلکا سا ٹمپریچر ہے۔ فی الحال سبب نہیں پتا چلا' تمہارے کچھ ٹیسٹ لینے ضروری ہیں۔" اس کے بعد انہوں نے درجن بھر ٹیسٹ گنوا دیئے۔

"اس میں تو بہت دیر لگے گی" ہم نے کہا۔

چھ سات دن! خدایا۔ ہم گھبرا کر بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مگر ڈاکٹر اس کی کیا ضرورت ہے؟ معمولی سی حرارت ہے۔"

بولے "مگر اس کا سبب تو معلوم ہو۔ مکمل چیک اپ کے بغیر ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔"

ہم نے کہا "دیکھئے ڈاکٹر! ہم تو تھوڑی دیر کے لئے آئے تھے۔ پتا نہیں تھا کہ اتنا لمبا قصہ ہو گا۔ ہمارا کسی سے دو بجے اپائنٹ منٹ بھی ہے۔ اس لئے ہمیں اجازت دیجئے۔ پھر کسی وقت آجائیں گے۔"

وہ پوچھنے لگے "کیا آپ بہتر محسوس کر رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے اسپتال آنے کے بعد؟"

ہم نے کہا "جی بہت زیادہ بہتر محسوس کر رہے ہیں۔"

وہ مسکرائے "آپ کی مرضی' جانا چاہتے ہیں تو جائیے۔ شام کو یا کل پھر آجانا۔ میں نہ ہوا تو کوئی اور ڈاکٹر ہو گا' مگر بہتر ہوتا اگر آپ چیک اپ کے لئے رک جاتے۔"

ہم نے کہا "ہمیں بہت سے کام ہیں پھر سہی۔"

"کوئی بات نہیں' پھر جب چاہے آجائیں اور ہاں کیا آپ کبھی لاہور بھی گئے ہیں؟"

ہم نے کہا "ہم لاہور ہی میں رہتے ہیں۔"

کہنے لگے "سنا ہے لاہور بہت خوب صورت شہر ہے۔ وہاں کھانے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میرے ہندوستانی مریضوں نے بتایا تھا۔"

ہم نے کہا "کبھی لاہور بھی آجائیں۔ آپ کو مزیدار کھانے کھلائیں گے۔"

"شکریہ اچھا خدا حافظ۔ مگر میں پھر یہی کہوں گا کہ آپ چند روز کے لئے رک جائیں۔" وہ ہمیں اتنے خلوص سے روک رہے تھے جیسے کوئی اپنے رشتے دار کو روکتا ہے۔ ہم تو شرمندہ ہو گئے مگر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اتنی دیر میں واجد صاحب نے پردہ اٹھا کر جھانکا۔ ڈاکٹر کو دیکھا تو "اوہ سوری" کہہ کر واپس جانے لگے مگر ڈاکٹر نے کہا

"آجائیے۔ اب یہ فارغ ہیں۔"

واجد صاحب اندر آگئے۔ بولے "بہت دیر لگا دی' میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔"

ہم نے کہا" بس چیک اپ میں دیر ہو گئی۔ یہ تو چھ سات دن کے لئے روک رہے ہیں۔"

"تو پھر رک جائیں۔"

"نہیں بھائی! میں ٹھیک ہوں۔"

ڈاکٹر فلو ہماری باتیں سن کر جاتے جاتے رک گئے۔ پوچھنے لگے "آپ کون سی زبان بول رہے ہیں۔ ہندی؟"

ہم نے کہا "جی نہیں' یہ اردو ہے۔ پاکستان کی قومی زبان۔"

وہ سر ہلا کر جانے لگے تو واجد صاحب نے کہا "ڈاکٹر! انہیں فی الحال کوئی مائی سین ہی دے دیجئے......"

"چیک اپ کے بغیر کوئی دوائی نہیں دی جاسکتی اور مائی سین کے لئے تو بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔" وہ مسکرائے اور چلے گئے۔

واجد صاحب نے کہا "اب کپڑے پہن لیجئے انتظار کس بات کا ہے؟"

ہم نے کہا "گاؤن پہنانے کے لئے جو آئی تھیں ان کی راہ دیکھ رہے ہیں۔"

کہنے لگے "بھائی کیوں ندیدہ پن کر رہے ہیں۔ ایسا ہی جی لگ گیا ہے تو اسپتال میں رک کیوں نہیں جاتے۔ بہت مزا آئے گا۔"

ہم نے کہا "اچھا اچھا' آپ ذرا باہر جائیے۔ ہم کپڑے پہنیں گے۔"

اسپتال سے واپس آکر جب ہم نے سب کو روداد سنائی تو سبھی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ جسے دیکھئے وہ چیک اپ کے لئے جانے کو بے چین تھا' مگر مشکل یہ تھی کہ کام بہت زیادہ تھا۔ دوسرے یہ کہ پرویز صاحب نے جتنے عرصے کے لئے ہیلتھ انشورنس لی تھی اس کی معیاد چند دن بعد ختم ہو رہی تھی۔

شاہ جی بولے "مروا دیا سپرد خدا کر دیا' پرویز صاحب نے پہلے نہیں بتایا ورنہ ہم بھی مفت میں علاج کرا لیتے۔"

دو دن بعد ہماری حرارت غائب ہو گئی۔ مگر اسکاربورو کے اسپتال میں ایمرجنسی میں گزرے ہوئے لمحات کی یاد ہمیشہ رہے گی۔

ٹورنٹو میں ہم نے ایک بات یہ محسوس کی کہ ایک ترقی یافتہ مغربی ملک کا دارالحکومت ہونے کے باوجود یہ ایک قدامت پسند معاشرہ ہے۔ سب سے بڑا سکون تو یہاں امریکہ کے مقابلے میں یہ ہے کہ کالوں کی آبادی بہت کم ہے جس کی وجہ سے وہ مسائل بھی کم ہیں جو محض کالوں کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ امن و امان کی صورت حال بھی امریکہ کے مقابلے میں بہتر نظر آتی ہے۔ امریکہ میں عام لوگوں‘ خصوصاً گھریلو عورتوں کو مجرموں سے جس قدر خائف دیکھا کینیڈا میں یہ بات نہیں ہے۔ پھر بے شرمی اور بے حیائی بھی دوسرے مغربی ملکوں کے مقابلے میں کم نظر آئی۔ کھلے عام شراب نوشی کی یہاں اجازت نہیں ہے۔ شراب پی کر ڈرائیونگ کرنا تو جرم عظیم ہے۔

کینیڈا کے لوگ شخصیت پرست ہیں اور گلیمر کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ایک بار ہمارے ہوتے ہوئے شہزادی ڈیانا اور شہزادہ چارلس کینیڈا پہنچے تو لوگ خوشی کے مارے پاگل سے ہو گئے۔ اخبارات ان کی تصویروں‘ خبروں اور تذکروں سے بھرے رہتے تھے۔ ڈیانا سے لگاوٹ کا ایک سبب شاید یہ بھی تھا کہ وہ انگلستان کی شہزادی ہیں اور کینیڈا کی آبادی کی اکثریت انگلستان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ برطانوی نو آبادی رہا ہے اور یہاں کرنسی پر ملکہ انگلستان ہی کی تصویریں شائع ہوتی ہیں۔ چارلس صاحب یہاں اپنی بیگم کے ہمراہ آئے تو بہت دھوم مچی‘ انہوں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اپنی بیوی کی خوب تعریفیں کیں۔ اس زمانے میں ان دونوں میں لڑائی جھگڑے شروع ہوئے تھے۔ دونوں ہر جگہ ایک ساتھ ہی جاتے تھے اور شہزادہ چارلس بڑے فخر سے صحافیوں سے پوچھا کرتے تھے

”کیوں صاحب‘ کیا خیال ہے آپ کا‘ ڈیانا حسن و جمال کا مجسمہ ہے نا؟“

ڈیانا کے پرستاروں کی اس ملک میں بھی کمی نہیں ہے۔ ان میں مرد‘ عورتیں‘ بوڑھے‘ جوان بچے سبھی شامل ہیں لڑکیاں ڈیانا کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرا کرتی تھیں اور اس کی خوش بختی پر رشک کرتی تھیں۔ کینیڈا کی وزیر اعظم مسٹر ٹروڈو کی بیگم مارگریٹ ٹروڈو نے ایک آفت ڈھا رکھی تھی۔ ٹروڈو وہاں کے بہت مقبول اور کامیاب وزیر اعظم تھے۔ انہوں نے ایک خوبصورت لڑکی سے محبت کی شادی کر لی۔ یہ لڑکی مارگریٹ تھی جو عمر میں ان سے خاصی چھوٹی تھی۔ خیر یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے مگر مشکل یہ کہ مارگریٹ ایک بگڑی ہوئی لاڈلی بچی کے مانند ان کی کوئی بات نہیں مانتی تھی۔ ایسی ایسی حرکتیں کرتی تھی کہ اگر کوئی مشرقی مرد ہوتا تو کئی بار گولی مار کر ہلاک کر چکا ہوتا۔ مثلاً کھلے عام دوسرے مردوں کے ساتھ گھومنا‘ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر تصویریں بنوانا۔ حد تو یہ ہے کہ ایک بار وہ شوہر کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ چلی گئیں۔ اخبار والوں نے خوب باتیں بنائیں مگر ٹروڈو صاحب کی آنکھوں پر عشق کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ لطف کی بات یہ کہ وہ ان کے بچوں کی ماں بھی تھیں‘ مگر صاحب بچوں کی یہاں کون پروا کرتا ہے۔ بالکل کتے بلی کے بچوں کی طرح ماں باپ انہیں چھوڑ دیتے ہیں اور بڑے ہو کر وہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ حساب کتاب برابر‘ گلہ نہ وارد۔ مارگریٹ ٹروڈو یہ سب ایڈونچر کرنے کے بعد دوبارہ اپنے شوہر کے پاس واپس پہنچ جاتی تھیں اور وہ انہیں خوش آمدید کہا کرتے تھے۔ لطف تو یہ ہے کہ ان کے ووٹر بھی اس پر اعتراض نہیں کرتے تھے اور نہ ہی قوم کو یہ شکایت تھی کہ صاحب آپ کی بیگم یہ کیا حرکتیں کرتی پھر رہی ہیں؟ بہت ذلیل و خوار ہوئے مگر ٹروڈو صاحب اپنی دلربا بیوی کو چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ خود ان کی بیگم نے انہیں چھوڑ دیا تو مجبوراً صبر کی سل سینے پر رکھ لی۔

بعد میں مسز ٹروڈو نے فلموں میں اداکاری کی اور اپنی بے باکی کے باعث بہت بدنام ہوئیں یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پس منظر میں چلی گئیں۔ ہم نے ایک دن اپنے اپارٹمنٹ کے منیجر مسٹر کلفٹ سے پوچھا کہ بھئی آپ لوگوں کو اپنے وزیر اعظم کی بیگم کی یہ حرکتیں بری نہیں لگتیں؟ وہ بولے ”جب ان کے شوہر کو بری نہیں لگتیں تو پھر ہمیں کیا حق ہے؟“

ہم نے کہا ”پھر بھی سارے زمانے میں رسوائی ہوتی ہے اور وہ آپ کے وزیر اعظم ہیں۔“

کہنے لگے "رسوائی کے ساتھ ساتھ پبلسٹی بھی تو ملتی ہے۔ خواتین کی اکثریت انہیں مارگریٹ کی وجہ سے ووٹ دیتی ہے اور مرد تو ہیں ہی اس پر فریفتہ" گویا وہی بات ہے کہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔

ننھا صاحب پہلی مرتبہ کینیڈا گئے تھے اور یہ ملک انہیں اتنا پسند آیا کہ ایک دن کہنے لگے "سوچتا ہوں یہیں آکر آباد ہو جاؤں۔"

ہم نے پوچھا "اور وہاں آپ کی فلموں کا کیا ہو گا؟"

بولے "فلمیں مکمل کرا کے آؤں گا۔ یہاں کوئی اسٹور یا ریستوران کھول لیں گے۔"

ننھا بے چارے کی تمنا کبھی پوری نہیں ہو سکی۔ پاکستان آنے کے کئی سال بعد جب ننھا کو فلموں میں کام ملنا کم ہو گیا' مالی حالات قدرے ابتر ہو گئے اور عشق میں بھی نامرادی اور مایوسی کا سامان کرنا پڑا تو دل برداشتہ ہو کر کہا کرتے تھے کہ بس میں کینیڈا چلا جاؤں گا' یہاں اب دل نہیں لگتا۔ وہ کینیڈا تو نہیں گئے مگر اتنی دور چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

ننھا بہت دلچسپ آدمی تھے' مگر ان کا جسم جتنا بڑا تھا' دل اتنا ہی معصوم اور چھوٹا تھا۔ کھانے پینے اور خوشبو لگانے کے بہت شوقین تھے۔ ایک فون آیا کہ ذرا آجایئے۔ ایک ضروری کام ہے۔ ہم ان کے اپارٹمنٹ میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ننھا صاحب بنیان اور لنگی پہنے کھڑے ہیں۔ ہم نے پوچھا۔ "خیر تو ہے؟"

بولے۔ "اپنی تو خیر ہے' مرغی کی خیر نہیں ہے۔"

انہوں نے مرغی پکائی تھی' بلکہ بھونی تھی۔ کہنے لگے "چکھ کر دیکھئے"

ہم نے کھائی تو بہت مزیدار تھی۔ تھوڑی دیر میں ہم نے ہاتھ روک لیا تو کہنے لگے۔ "ارے کھایئے نا۔ ہم نے چکھنے کے لئے تھوڑا ہی بلایا تھا۔" ہم نے کہا کہ ہمارا پیٹ ہی بھر گیا۔

غور سے ہمارے پیٹ کو دیکھا پھر اپنے پیٹ کی طرف نظر کی اور ہنس کر بولے "آفاقی صاحب! آپ کی تو پٹی ہے پٹی۔ پیٹ ایسا ہوتا ہے۔"

ننھا بہت باذوق اور رنگین مزاج آدمی تھے۔ ان کے قدو قامت اور فلموں میں

مزاحیہ کرداروں کو دیکھ کر عام طور پر لوگ انہیں مسخرا اور غیر سنجیدہ انسان سمجھتے تھے۔ ہنسی مذاق تو کرتے تھے مگر سنجیدہ گفتگو میں بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ ایک بار ہم لوگ شوٹنگ کے دوران میں ایک طرف بیٹھے ای ٹن سینٹر کی رونق دیکھ رہے تھے۔ سامنے خواتین و حضرات کا ہجوم تھا۔ ننھا کہنے لگے "آفاقی صاحب آپ نے دیکھا۔ دنیا کتنی خوب صورت جگہ ہے۔"

ہم نے کہا "ہے تو۔"

بولے "ایک دن اسے چھوڑنا ہی پڑ جاتا ہے۔ کوئی چاہے یا نہ چاہے۔ کیا حرج تھا اگر اللہ میاں انسان کی عمر ڈھائی تین سو سال کر دیتے اور بچپن ہی سو سال کا ہو جاتا۔ جوانی دو سو سال کی اور بڑھاپا پندرہ بیس سے زیادہ نہ ہوتا۔"

اس قسم کی باتیں وہ کبھی کبھی کیا کرتے تھے۔ ورنہ عام طور پر ہنسی مذاق ہی ان کا معمول تھا۔ ای ٹن سینٹر بہت عظیم الشان شاپنگ سینٹر ہے۔ دنیا بھر کی چیزیں یہاں مل جاتی ہیں۔ پہلی نظر میں یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید یہ بہت مہنگی جگہ ہے' حالانکہ یہاں ہر قسم کی اور ہر قیمت کی چیزیں ملتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ اول تو اس کی وسعت دیکھ کر ہی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرف جائیں اور کس طرف نہ جائیں پھر اشیا کی بہتات دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کیا خریدیں' کیا نہ خریدیں۔ ہم نے اس کی آسان ترکیب تلاش کر لی تھی۔ جاتے ہی سب سے پہلے آئس کریم خریدتے تھے اور مختلف گوشوں میں آرام سے بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ آئس کریم کی بھی یہاں بہت سی اقسام تھیں اس لئے سارا دن آئس کریم کھاتے ہوئے گزر جاتا تھا۔ ایک دن ہم سوئیٹس والے شعبے میں چلے گئے۔ وہاں کیا دیکھا کہ درجنوں بلکہ سینکڑوں اقسام کے چاکلیٹ اور ٹافیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ شبنم کو یہ جگہ بہت پسند آئی' مگر ننھا صاحب نے دوبارہ اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو بولے "مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ اتنی مٹھاس والی جگہ جا کر مجھے شوگر کا مریض نہیں ہونا۔" ان کا کہنا تھا کہ اگر اس جگہ دن میں دو چار بار گزر ہو جائے تو تندرست آدمی کو بھی شوگر کی بیماری ہو جائے گی۔

ہفتے میں چھ دن تو ای ٹن سنٹر پر خوب گہما گہمی رہتی ہے۔ ایک بار ہم اتوار کے روز گئے۔ پرویز صاحب کو سنسان سڑکوں پر چند شاٹس لینے تھے۔ سڑکیں تو ویران تھیں

ہی مگر ای ٹن سینٹر کی بے رونقی دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ وہ کسی اجڑی ہوئی بیوہ کی مانند ایک عجیب سی اداسی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ شاپنگ سینٹر تو بند تھا مگر سامنے فٹ پاتھ پر ایک نوجوان حسین لڑکی اور ایک خوب صورت باوقار جوان لڑکا کرتب دکھانے میں مصروف تھے۔ روبن گھوش کو ایسی چیزوں سے بہت دلچسپی ہے۔ انہوں نے سب کو متوجہ کیا اور ہم بھی تماشا دیکھنے والوں میں شامل ہو گئے۔ جس طرح ہمارے ہاں بازی گر ہوتے ہیں یہ بازی گری کر رہے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں "بچہ جمہورا" ہوتا ہے اور یہاں اس کی جگہ ایک نوجوان خوب صورت لڑکی تھی۔ لڑکی نے مختلف قسم کے کرتب دکھائے' قلابازیاں لگائیں۔ چھوٹے سے لوہے کے دائرے میں سے گزر کر دکھایا۔ اس کے بعد جب لڑکے نے تلوار اٹھائی اور کہا کہ میں آپ کی آنکھوں کے سامنے اس کا گلا کاٹ دوں گا تو ہماری قوتِ برداشت نے جواب دے دیا۔ ہم تو مرغی ذبح ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے بھلا ایک خوب صورت لڑکی کر گردن کٹتے ہوئے کیسے دیکھ سکتے تھے' مگر دوسرے لوگ بڑے اشتیاق سے دیکھ رہے تھے اور وہاں سے جانے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ آخر ہم نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے مگر انگلیوں کی جھریوں سے کبھی کبھی جھانک کر دیکھ لیا کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ لڑکی کا گلا کاٹ کر ان صاحب نے علیحدہ کر دیا اور اس نازک موقعے پر جب کہ عورتیں سہم کر رہ گئی تھیں اور مردوں کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے انہوں نے اپنا ہیٹ اٹھا کر حاضرین سے پیسے اکٹھے کرنے شروع کر دیے۔ اب ایک طرف تو لڑکی کا سر کٹا ہوا پڑا تھا اور بے سر کا دھڑ پھڑک رہا تھا۔ فٹ پاتھ خون سے رنگین تھا۔ اور دوسری جانب وہ صاحب ہیٹ ہاتھ میں لے کر ہر ایک کے سامنے جا کر وصولی کر رہے تھے۔ کئی کمزور دل خواتین کی تو چیخیں نکل گئیں۔ آخر ایک بڑی بی سے نہ رہا گیا تو غصے سے بولیں "سنگدل ظالم! اس کی گردن تو جوڑو' تمہیں پیسے اکٹھے کرنے کی پڑی ہے۔"

نوجوان نے مسکرا کر کہا "میڈم! اس کی فکر نہ کریں۔ ادھر ہیٹ میں پیسے ڈالیں۔"

بڑی بی نے کہا "اور اگر وہ سچ مچ مرگئی تو کیا ہو گا؟"

نوجوان نے جواب میں ہیٹ ان کے بالکل سامنے کر دیا۔ خاصا سسپنس پیدا ہو گیا

تھا۔ ایک چھوٹی بچی نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا اور چلا رہی تھی "پولیس' پولیس۔ ہیلپ۔ پلیز ہیلپ۔"

پولیس کی ایک پٹرول کار آگئی اور اس میں سے دو سپاہی اتر کر فٹ پاتھ کی جانب بڑھے۔

بچی نے کہا "آفیسر! اسے پکڑلیں' یہ قاتل ہے۔ اس نے بے چاری لڑکی کی گردن کاٹ دی ہے۔"

پولیس والے نے نوجوان کو دیکھا اور زور زور سے ہنسنے لگا "ارے بازی گر! تم تلوار کو بھی چھٹی نہیں کرتے۔"

بازی گر نے ہیٹ ان کے سامنے بھی پھیلا دیا اور سپاہی نے اس میں ایک سکہ ڈال دیا۔ بچی نے پولیس والے سے کہا "تم اسے پکڑتے کیوں نہیں؟"

وہ ہنسنے لگا "بے بی! یہ بازی گر ہے۔ تماشہ دکھا رہا ہے۔ جب سچ مچ کوئی جرم کرے گا تو ہم اسے پکڑلیں گے۔"

ہم لوگوں نے بھی ہیٹ میں نوٹ اور سکے ڈال دیے۔ ہیٹ قریب قریب بھرا ہوا تھا۔ سب سے پیسے وصول کرنے کے بعد بازی گر نے لڑکی کے کٹے ہوئے سر کی طرف توجہ دی اور ایک چھڑی اٹھا کر کوئی جنتر منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر کٹی ہوئی گردن اٹھا کر دھڑ کے پاس رکھ دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی نے ایک قیامت خیز انگڑائی لی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تماشائیوں نے بے اختیار تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ للّی نے ہمیں کہنی سے ٹھوکا دیا اور کہا "بس آنکھیں کھول لیجئے' وہ زندہ ہو گئی ہے۔"

ہم نے اسے صحیح سلامت ون پیس میں دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا۔ لڑکی نے مسکرا کر رقص کے انداز میں گھومتے ہوئے سب کا شکریہ ادا کیا۔ اب فٹ پاتھ پر نہ خون کا نشان تھا نہ کوئی اور علامت موجود تھی کہ کچھ دیر پہلے یہاں کشت و خون ہو چکا ہے۔

شبنم کو اچانک برین ویو آئی اور انہوں نے کہا "پرویز صاحب کو بولیں کہ یہ سین اپنی فلم میں رکھیں۔"

خیال تو بہت اچھا تھا۔ ندیم اور شبنم گھومتے پھرتے ایک جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں تماشہ ہو رہا ہے ہم نے شبنم سے کہا "پردھان آپ تو بہت ذہین ہیں۔"

وہ دونوں اپنا سامان سمیٹ کر ایک شاندار کار میں رکھ چکے تھے اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اس شخص نے اس لڑکی کی گردن کاٹ دی تھی۔ ہم ان کے پاس گئے اور کہا "ایکسکیوزمی؟" وہ فوراً ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔

ہم نے انہیں بتایا کہ ہم لوگ پاکستان سے ایک فلم کی شوٹنگ کے لئے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ کے اس ایکٹ کو بھی ہم فلما لیں۔

وہ دونوں حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگے۔ پھر ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر زور زور سے ہنسے "سوری سر' ہم ایکٹر نہیں ہیں۔"

"ایکٹر کی کیا بات ہے۔ آپ جو کچھ کریں گے ہم اسے فلما لیں گے۔"

انہوں نی صاف انکار کر دیا۔

پوچھا "آخر کوئی وجہ؟"

بولے "بس' ہم کو اچھا نہیں لگتا۔"

پھر ہم سے پوچھنے لگے کہ کیا آپ کے ملک میں بازی گر ہوتے ہیں؟ ہم نے بتایا کہ وہاں ہر طرح کے بازی گر اور جادو گر ہوتے ہیں' مگر اب شہروں کی سڑکوں پر مجمع نہیں لگاتے کیونکہ بچوں کے لئے دوسری تفریحات اور دلچسپیاں موجود ہیں مثلاً فلم' ٹی وی' ویڈیو وغیرہ۔

لڑکی ٹھنڈی آہ بھر کر بولی "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ سب ہمارے دشمن ہیں۔ ہمارا تو دھندہ ہی خراب ہو گیا ہے۔"

ہم نے کہا "آپ دونوں اتنے اسمارٹ اور خوبصورت ہیں۔ کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے؟"

معلوم ہوا کہ یہ ان کا خاندانی پیشہ ہے۔

"کیا آپ دونوں رشتے دار ہیں؟"

وہ دونوں پھر ہنسنے لگے۔ لڑکی نے کہا "صرف جذباتی رشتہ ہے۔ ہم دونوں ساتھ رہتے ہیں۔ اتفاق سے یکجا ہو گئے ہیں ورنہ یہ جنوبی امریکہ کا ہے اور میں کیلی فورنیا میں پیدا ہوئی تھی۔"

تو پھر تمہاری شادی کہاں ہوئی؟"

کی نے کہا "ہماری شادی نہیں ہوئی' ہم تو صرف دوست ہیں۔"

اچھا۔ بائی" یہ کہا اور کار میں سوار ہو کر رخصت ہو گئے۔

ٹورنٹو دوسرے مغربی ملکوں سے مختلف نہیں ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو مختلف بھی ہے۔ سب سے نمایاں بات تو یہ ہے کہ امریکہ اور انگلستان کی بہ نسبت یہاں کالے بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ قباحتیں بھی بہت کم ہیں جو کالے حضرات و خواتین سے منسوب ہیں۔ جرائم یہاں سے امریکہ کے مقابلے میں بہت کم ہیں اور خوف و خطر کا بھی وہ عالم نہیں ہے۔ وہاں تو آپ کو ہر قدم پر یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ یہ علاقہ کون سا ہے؟ یہاں کالوں کی زیادہ آبادی تو نہیں ہے؟ وغیرہ وغیرہ مگر ٹورنٹو میں ایسا اندیشہ نہیں ہے' کیونکہ کالوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس لئے ان سے وابستہ مسائل بھی بہت کم ہیں۔ ان کے مقابلے میں ایشیائیوں کی یہاں بہتات ہے۔ خصوصاً "پیلی نسل" کے لوگوں کی تو ریل پیل ہے۔ فلپائینی' کورین' چینی' جاپانی' ویت نامی' ہانگ کانگی (اس ترکیب کے لئے معاف کر دیجئے گا) سنگا پوری' ملائشیائی' ان سب کی کافی بڑی تعداد یہاں آباد ہے اور کاروبار میں' خصوصاً چھوٹے کاروبار میں' ان کی موجودگی کا احساس ہر جگہ ہوتا رہتا ہے

ٹورنٹو شہر اور اس کے نواحی علاقوں میں پاکستانیوں اور بھارتیوں کی خاصی بڑی تعداد آباد ہے۔ شہر میں چند علاقے صرف ان ہی کے ہیں۔ "چاندنی چوک" کا حال ہم پہلے ہی آپ کو سنا چکے ہیں جہاں ہندوستانی اور پاکستانی کھانے' کپڑے' زیورات جوتے' چوڑیاں اور دوسرا سامان دستیاب ہوتا ہے۔ ان علاقوں میں ویڈیو کی دکانیں بھی کافی تعداد میں ہیں جہاں سے بھارتی فلموں کے ویڈیو کیسٹ بڑی آسانی سے مل جاتے ہیں۔ ان دکانوں پر ہر وقت ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ یہیں آپ کو اردو کے رسائل' گانوں کے کیسٹ' کتابیں وغیرہ بھی مل جاتی ہیں۔ کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کتابیں موجود نہ ہوں۔ ایک طرف ناول ہیں' افسانوں کے مجموعے ہیں' نظموں اور غزلوں کی کتابیں ہیں تو

برابر میں فلمی ڈائریکٹری بھی رکھی ہے۔ اس کے پاس ہی فلمی ہدایت کاری سیکھنے کے بارے میں ایک کتاب سجی ہوئی ہے' مذہبی کتابیں بھی یہیں سے مل جاتی ہیں۔

اگر دکان دار مسلمان ہے تو قرآن شریف' احادیث کی کتابیں اور جائے نمازیں بھی خریدی جا سکتی ہیں۔ مسلمانوں کی دکانوں پر کتبے بھی آویزاں نظر آجاتے ہیں۔ قرآنی آیات اور دوسری ہدایات بھی ان کے ساتھ ساتھ دیکھ لیجئے۔ دیوار کے بالکل برابر میں پرانے فلمی گانوں کے ریکارڈز بھی بڑی احتیاط سے رکھے گئے ہیں۔ حقہ بھی موجود ہے اور اس قسم کی دوسری خالص پاکستانی اور مشرقی اشیا بھی ہیں۔ ویڈیو شاپ کے برابر میں ایک دکان ہے۔ کہنے کو تو یہ مٹھائی کی دکان ہے مگر دہی بھلے' چائے کافی' سموسے' مٹھائی' پان' سگریٹ' سب ہی کچھ یہاں سے مل جاتا ہے۔ ویڈیو شاپوں پر عموماً بھارت والوں کا قبضہ ہے۔ اگر چند دکانیں پاکستانیوں کی ہیں بھی تو وہ بھی بھارتی فلموں کے کیسٹ ہی فراہم کرتے ہیں۔

ہم نے ایک خاتون کو دیکھا شلوار قمیص میں ملبوس تھیں۔ چہرے سے بھی مسلمان لگتی تھیں اور دکان میں بھی انہوں نے قطعات وغیرہ سجا رکھے تھے۔ بڑی سلیس اور شستہ اردو بول رہی تھیں مگر ایک گاہک سے انہوں نے ٹھیٹ پنجابی میں باتیں کر کے ہمیں حیران کر دیا۔ جب ذرا رش کم ہوا تو ہم ٹہلتے ہوئے ان کے پاس چلے گئے۔ اور پوچھا آپ کے پاس پاکستانی فلمیں بھی ہوتی ہیں؟

بولیں "جی نہیں' صرف ہندوستانی فلمیں ہیں۔"

ہم نے کہا "کیا آپ بھی ہندوستانی ہیں؟"

بولیں "جی نہیں' میں پاکستانی ہوں اور خدا کے فضل سے مسلمان ہوں۔"

"بہت خوشی کی بات ہے مگر آپ صرف بھارتی فلموں کے کیسٹ کیوں رکھتی ہیں؟"

فرمایا "آپ مجھے پاکستانی معلوم ہوتے ہیں۔"

ہم نے کہا "آپ نے صحیح پہچانا۔"

کہنے لگیں "دیکھئے جناب' بھارتی فلموں کے کیسٹ رکھنے کی دو بڑی وجوہات ہیں' مگر ان کو سننے سے پہلے آپ یہ بتایئے کہ کیا کھانا پینا پسند کریں گے؟"

ہم نے کہا "ارے اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔"

بولیں "دیکھئے، ہم تو یہاں جب سے آئے ہیں تکلف کرنے اور کرانے کو بھی ترس گئے ہیں۔ اب آپ ہماری بات رکھ لیجئے بلکہ بہتر ہو کہ آپ چائے پی لیجئے۔ آپ کی بیگم کے لئے میں سموسے منگوا لیتی ہوں۔ بچیاں آئس کریم کھا لیں گی۔" ہمارا جواب سننے سے پہلے وہ لپک جھپک دکان سے باہر گئیں اور برابر والی دکان میں سے ان تمام چیزوں کا آرڈر دینے کے بعد واپس آئیں۔ لبنیٰ کو دیکھ کر مسکرائیں اور پوچھا "آپ پان کھانا تو پسند کرتی ہوں گی؟"

"جی مگر کبھی کبھی"

"بس، تو میں نے آپ کے لئے میٹھا پان بھی کہہ دیا ہے۔"

"مگر......"

"اب کسی مگر کی گنجائش باقی نہیں ہے۔ خاموش رہنا ہی بہتر ہو گا۔ ہاں تو میں آپ کو محض بھارتی فلمیں رکھنے کی وجوہات بتانے جا رہی تھی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ بھارتی فلموں کے وڈیو ہمیں آسانی سے مل جاتے ہیں اور ان کے پرنٹ بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جسے دیکھئے وہ بھارتی فلموں کا دیوانہ ہے۔ ہندوستانی، پاکستانی، فلپائنی، چینی، سیاہ فام یہاں تک کہ سفید کینیڈین بھی ان فلموں کو دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، کہانی کا تھوڑا بہت اندازہ ضرور لگا لیتے ہیں اور سب سے زیادہ پسند کی چیز تو ناچ اور گانے ہیں۔ بول بالکل نہیں سمجھتے مگر گانے سن کر جھومتے رہتے ہیں۔"

ہم نے کہا "لیکن اگر آپ پاکستانی فلموں کے کیسٹ بھی رکھیں تو یہ انہیں بھی پسند کریں گے۔ ناچ گانے تو ہماری فلموں میں بھی کم نہیں ہوتے۔"

کہنے لگیں "مگر پاکستانی فلموں کے کیسٹ لاؤں کہاں سے؟ نہ کوئی ادارہ ایسا ہے جو فراہم کرے، نہ کوئی دکان ہے۔ پاکستانی سفارت خانہ بھی ان کے نام پر سر ہلا دیتا ہے۔ وہ تو خود بھارتی فلمیں دیکھتے ہیں۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ بھارتی فلموں کے وڈیو کیسٹ فراہم کرنے کے لئے تو فلم ساز معاہدہ کر لیتے ہیں اور ان کی مرضی سے وڈیو ڈیلرز بہت اچھے پرنٹس نکالتے ہیں۔ مگر پاکستانی فلموں کے لئے کوئی معاہدہ نہیں ہوتا اس لئے اگر کسی

کے پاس کوئی وڈیو کیسٹ ہے بھی تو بہت خراب ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ کے پاکستانی فلم ساز ایسا معاہدہ کیوں نہیں کرتے؟ آپ کو یہ اندازہ ہی نہیں ہے کہ بھارتی فلمیں دیکھ دیکھ کر پاکستانی مسلمانوں کے ذہن کتنے خراب ہو رہے ہیں۔ یقین کیجئے کہ اگر پاکستانی فلموں کے کیسٹ ملا کریں تو سارے پاکستانی دکاندار ان کا بھی کاروبار کرنے لگیں۔"

اتنی دیر میں برابر والی دکان سے ایک نوجوان، سانولی سلونی لڑکی ایک ٹرے میں کھانے پینے کا سامان لے آئی۔ وہ ساری باندھے ہوئے تھی۔ ماتھے پر بندیا بھی لگی ہوئی تھی، اس لئے صاف ظاہر تھا کہ ہندو ہے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر مسکرائی

"نمستے جی۔" ٹرے ایک جانب رکھ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔

ہماری میزبان نے کہا "سرلا" یہ پاکستانی مہمان ہیں۔ آج کل ٹورنٹو آئے ہوئے ہیں۔"

وہ بولی "ماں جی نے کہا ہے کہ آپ کے مہمان ہیں تو یہ ہمارے بھی مہمان ہیں۔ ہمیں بھی ان کی سیوا کا موقع دیں یہ سب ہماری طرف سے بھینٹ سمجھیں۔"

"بھینٹ" کا لفظ سن کر ہماری بیگم کے کان کھڑے ہو گئے۔ دراصل وہ پاکستان کی پیدائش ہیں، اس لئے ہندی زبان سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ جو تھوڑی بہت واقفیت ہے وہ چند بھارتی فلموں کی بدولت ہے۔ فلموں میں "بھینٹ" کا لفظ عام طور پر "قربانی" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس لئے وہ کچھ پریشان ہو گئیں۔

ہماری میزبان نے کہا "دیکھو سرلا" یہ میرے مہمان ہیں۔ تم ان کی پھر کبھی خاطر داری کر لینا، اس وقت تو رہنے دو۔"

سرلا مسکرائی "بہن جی، یہ جھگڑا پھر کبھی کر لینا۔ انہیں کھانے تو دو۔"

سرلا یہ کہہ کر رخصت ہو گئی۔ ہم نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں میں بہت سلوک ہے۔"

کہنے لگیں "ہاں، یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ ویسے تو ملک سے باہر جا کر پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے رہنا چاہئے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا اور میں آپ کو بالکل سچ بتاؤں کہ اس میں پہل

ہندوستانیوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ بلاوجہ جھگڑے کی باتیں نکالتے ہیں۔ ان کی ذہنیت اچھی نہیں ہے۔ نہ جانے مسلمانوں کے ساتھ انہیں کیا دشمنی ہے؟"

ہم نے کہا "دراصل اسی ذہنیت کی وجہ سے مسلمانوں نے پاکستان بنایا تھا اور جب تک یہ نہیں بدلے گی ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات ٹھیک نہیں ہو سکتے۔"

"سب لوگ تو کہتے ہیں کہ اگر کشمیر کا مسئلہ طے ہو جائے تو دونوں ملکوں کے تعلقات ٹھیک ہو جائیں گے؟"

ہم نے کہا "وہ لوگ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ اول تو کشمیر کا مسئلہ طے ہونا بہت مشکل ہے' کیونکہ بھارت کے نزدیک ہر مسئلے کا درست حل وہی ہے جو وہ چاہتا ہے۔ تو پھر مسئلہ طے کیسے ہو؟ اور فرض کیجئے کہ ہو بھی جائے تو جب تک ان لوگوں کی ذہنیت نہیں بدلے گی جھگڑے کی اور بہت سی وجوہات پیدا ہو جائیں گی۔ آپ نے شفیق الرحمٰن کی کہانیاں تو پڑھی ہوں گی؟"

بولیں "جی نہیں' مگر نام بہت سنا ہے۔"

ہم نے انہیں شفیق الرحمٰن کے مشہور کردار "شیطان" کا نکتہ نظر بتایا۔ شیطان کی زبانی شفیق الرحمٰن نے ایک قیامت کی بات کہلوائی "انہوں نے لکھا کہ شیطان کے خیال میں دنیا میں نظریات صرف دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ذاتی نظریہ اور دوسرا غلط نظریہ۔ مطلب یہ کہ ان کا اپنا جو نظریہ ہے اس کے سوا دوسرے تمام نظریے غلط ہیں۔ بھارت والے بھی اسی اصول پر قائم ہیں۔"

وہ ہنسنے لگیں۔ بولیں "واقعی' کتنی اچھی بات کہی ہے انہوں نے۔ اچھا' آپ کچھ کھائیے۔"

ہم نے کچھ کھایا پیا لبنیٰ نے پان بھی کھایا' چائے بھی پی۔ کچھ دیر کتابیں الٹ پلٹ کرتے رہے اور صاحب دکان کا دل رکھنے کی خاطر تھوڑی سی خریداری بھی کرلی۔ جب رخصت ہونے کا وقت آیا تو ہمیں اچانک احساس ہوا کہ ہم لوگوں نے ایک دوسرے کا نام تو دریافت ہی نہیں کیا۔ ایسے موقعوں پر ہمیں ہمیشہ بٹ صاحب یاد آجاتے ہیں جو سب سے پہلے ہرپاس سے گزرنے والی چیز کا نام دریافت کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا نام شگفتہ تھا۔ وہ خود بھی کافی شگفتہ تھیں۔ صورت کے اعتبار سے بھی اور مزاج کی بھی۔

چلا کہ شادی شدہ ہیں اور ان کے شوہر کسی جگہ ملازمت کرتے ہیں چھٹی کے روز ہاتھ بٹانے دکان پر بھی آجاتے ہیں۔ دو بچے ہیں جنہیں وہ بڑے اہتمام سے قرآن شریف پڑھاتی ہیں اور نماز بھی سکھا رہی ہیں۔ وہ خود بھی شلوار قمیض پہنتی ہیں اور کبھی فراک یا اسکرٹ زیب تن نہیں کیا۔

"اور ساری؟" ہماری بیگم نے پوچھا۔

کہنے لگیں "یہ سچی بات ہے کہ ساری عورتوں کے لئے بہت خوب صورت لباس ہے اگر جسم اور قد اچھا ہو اور ساری باندھنے کا ڈھنگ بھی آتا ہو تو اس لباس کے کیا کہنے۔"

"تو پھر آپ ساری کیوں نہیں باندھتیں؟"

کہنے لگیں "یہاں عموماً ہندو عورتیں ہی ساری باندھتی ہیں۔ جب میں پاکستان میں تھی اس وقت میں بھی ساری باندھا کرتی تھی اور بندیا بھی لگا لیا کرتی تھی۔ مگر کینیڈا میں آکر سوچا کہ ہم پاکستانیوں اور ہندوستانیوں میں کوئی فرق ہونا چاہئے۔ اگر دیکھنے میں ہم ایک ہی جیسے نظر آئیں تو یہ تو ہماری پہچان نہیں ہوگی۔"

شگفتہ کے ان خیالات نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ دراصل ایسے ہی پاکستانی ہیں جو دوسرے ملکوں میں اپنے ملک کی شناخت ہیں اور جنہوں نے ہر قیمت پر اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔

واپسی پر فٹ پاتھ پر ہم نے لبنیٰ سے کہا "کتنی اچھی عورت ہے اور خیالات کتنے اچھے ہیں۔"

انہوں نے کہا "مگر وہ شادی شدہ ہے۔"

اب بتائیے' ان عورتوں کی ذہنیت کا کیا علاج ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ چاہے دنیا بدل جائے مگر عورت کی اور ہندو کی ذہنیت کبھی نہیں بدل سکتی۔ ننھے صاحب نے ہمیں اپنے ایک دوست کا لطیفہ سنایا تھا کہ وہ دوسری شادی کرنے کے خواہش مند تھے اور ہر طرح سے اپنی بیوی کو اس بات پر رضا مند کرنا چاہتے تھے مگر وہ اللہ کی بندی ٹس سے مس نہیں ہوتی تھی۔ آخر انہوں نے ایک نئی تکنیک اختیار کی۔ مختلف بہانوں سے اپنی بیوی کی تعریفیں شروع کر دیں۔ ہر ایک سے کہتے اجی ہماری مسز کی کیا بات ہے۔

صورت، شکل، عقل، ڈھنگ، مزاج، ہر لحاظ سے بے مثال ہیں۔ بیوی نے چند روز تک یہ تعریفیں سنیں تو اس کا دل بھی موم ہونے لگا۔ اس نے سوچا کہ میرا شوہر کتنا قدردان ہے، کس قدر چاہتا ہے مجھے۔ اس طرح دونوں میاں بیوی کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے۔
ایک دن اپنے دوستوں کی محفل میں انہوں نے اپنی بیوی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے اور پھر کہنے لگے۔ "میری بیوی تو لاجواب ہے۔ اتنی اچھی ہے کہ کیا بتاؤں۔ ایسی اچھی اگر دو چار بیویاں بھی ہوں تو خوش بختی ہی ہے۔ اچھی چیز تو جتنی زیادہ ہو اتنا ہی بہتر ہے۔"

بیوی اس وقت تو خاموش رہی مگر گھر پہنچ کر بہت ڈانٹ ڈپٹ کیا اور کہا "خبردار، آج کے بعد میری تعریف کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

دبی زبان سے بولے "وہ تو اب بھی کوئی نہیں ہے۔" مگر دوسری شادی کا خیال دل سے نکال دیا۔

کینیڈا کے لوگ امریکیوں کے مقابلے میں زیادہ فرصت میں رہتے ہیں یا شاید ہمیں کچھ ایسا ہی محسوس ہوا، کیونکہ امریکہ میں تو ایک دوسرے سے ملاقات کرنا ایک طویل المعیاد منصوبہ ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ منصوبہ اکثر نامکمل ہی رہ جاتا ہے۔ مگر کینیڈا میں دیکھا کہ لوگوں کے پاس ملنے جلنے اور گپ شپ کے لئے کچھ وقت نکل ہی آتا ہے۔ ایک بار نواب عبدالخالق صاحب طارق صاحب کے پاس لے گئے طارق صاحب کا تعارف یہ ہے کہ برصغیر کے مشہور معروف فلم ساز ہدایت کار ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کے صاحب زادے ہیں اور کافی عرصے سے کینیڈا میں ہی رہتے ہیں۔ اب ذرا اس رشتے کی وضاحت بھی سن لیجئے۔ طارق صاحب دراصل احمد صاحب کی بیگم (اب وہ مرحومہ ہو چکی ہیں) شاہدہ کے صاحب زادے ہیں جو نینا کے نام سے فلموں میں کام کیا کرتی تھیں اور جب احمد صاحب نے انہیں اپنی فلم میں پیش کیا تو ان کی پبلسٹی پراسرار نینا کے نام سے کی گئی۔ نینا احمد صاحب سے شادی کرنے سے پہلے بمبئی میں اسٹوڈیو کی لیبارٹری میں کام کرنے والے محسن عبداللہ کی بیگم تھیں۔ یہ طارق صاحب محسن عبداللہ اور شاہدہ بیگم کے صاحب زادے ہیں۔ گویا احمد صاحب کے سوتیلے بیٹے۔

ہدایت کار فرید احمد بیگم شاہدہ کے سوتیلے بیٹے ہیں۔ یعنی ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کی

پہلی بیوی کے صاحب زادے۔ یہ رشتے ہم نے اندازاً بتائے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں خود اپنے رشتے داروں کے باہمی رشتے بھی یاد نہیں رہتے۔

خیر، یہ تو جملہ معترضہ سمجھ لیجئے۔ ہوا یہ کہ ہم طارق صاحب کے گھر گئے جو بہت خوب صورت علاقے میں واقع ہے اور سجاوٹ بھی خوب ہے۔ طارق صاحب شادی شدہ ہیں اور ان کی بیگم پاکستانی ہیں۔ مگر نواب صاحب کی مانند طارق صاحب کا حلقہ ملاقات بھی سفید فام غیر ملکیوں تک ہی محدود ہے حالانکہ وہ ایک اچھے پاکستانی ہیں۔ ان کو بھی یہی شکوہ ہے کہ جہاں ہمارے چار پاکستانی بھائی اکٹھے ہوتے ہیں ان کی باہمی سیاست شروع ہو جاتی ہے۔ دوسروں کی برائیاں، دوسروں پر نکتہ چینی، دوسروں کی عیب جوئی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ باہر کے ملکوں میں رہنے والے ہر پاکستانی کی اپنی سیاست ہے۔ طارق صاحب اور نواب صاحب کا کہنا ہے کہ اگر کچھ لوگ یکجا ہوتے ہیں تو اس لئے کہ اچھی اچھی باتیں کریں اور گپ شپ میں اچھا وقت گزاریں۔ ان جھگڑوں اور برائیوں کی سیاست پر وقت ضائع کرنے کا فائدہ؟ ایک لحاظ سے وہ سچے بھی ہیں۔

طارق صاحب کے گھر پر ایک ڈنر کا اہتمام تھا۔ اس میں کباب وغیرہ بھی تھے، بریانی بھی تھی، مغربی سلاد اور دوسری چیزیں بھی موجود تھیں۔ دیسی لوگوں میں ہماری فیملی، نواب صاحب اور خود طارق اور ان کی بیگم موجود تھیں۔ باقی مہمان انگریزی تھے جنہیں پاکستانی صرف "گورا" کہہ کر کام چلا لیتے ہیں۔ گوروں کے ساتھ ظاہر ہے کہ کچھ گوریاں بھی تھیں۔ کھانے کے بعد لان میں محفل آرائی ہوئی اور خوب ادھر ادھر کی گپ شپ ہوئی۔ سیاست، فلم، ادب وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ گفتگو انگریزی ہی میں ہو رہی تھی۔ طارق صاحب نے ہمارا یہ کہہ کر تعارف کرایا تھا کہ یہ حال ہی میں امریکہ سے ہو کر آئے ہیں۔ اس پر وہاں کی باتیں چھڑ گئیں۔ کینیڈا کے لوگ امریکہ سے اسی طرح مرعوب تھے یعنی ان کی ہر چیز ہمیں اپنے مقابلے میں اچھی اور بہتر لگتی تھی چنانچہ کینیڈا والوں نے امریکہ کی تعریفیں شروع کر دیں۔ بہت بڑا ملک ہے، خوب صورت ہے، امیر ہے، طاقت ور ہے، ترقی یافتہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم چپ چاپ سنتے رہے۔ ایک نوجوان اور طرح دار خاتون بہت بڑھ چڑھ کر بول رہی تھیں۔ وہ امریکی تھیں اور سیرو سیاحت کی غرض سے پہلی بار کینیڈا آئی تھیں۔ جب سب لوگ اپنی بولیاں بول چکے تو انہوں نے ہمیں مخاطب کیا اور

بولیں "آپ امریکہ میں رہے ہیں اور اب کینیڈا بھی دیکھ لیا ہے' تو یہ بتایئے کہ آپ کو ان دونوں میں سے کون سا ملک زیادہ اچھا لگا؟"

ہم نے کہا "دونوں ملک بہت اچھے ہیں۔"

پوچھا "آپ کے پاکستان سے اچھے ہیں؟"

ہم نے کہا "پاکستان ملک نہیں ہے' وہ تو ہمارا وطن ہے اس سے زیادہ اچھا تو کوئی اور ملک ہو ہی نہیں سکتا۔"

انہوں نے مسکرا کر شانے اچکائے اور کہا "اوہ سوری' میں نے غلط سوال پوچھ لیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو امریکہ اور کینیڈا میں سے زیادہ اچھا کون سا ملک لگا؟"

ہم نے کہا "دونوں ہی اچھے ہیں۔ ترقی یافتہ ہیں' امیر ہیں۔"

کہنے لگیں "پھر بھی' آپ کسے ترجیح دیں گے؟"

ہم نے کہا "ہمیں تو کینیڈا زیادہ اچھا لگا ہے۔ یہاں زیادہ شوروغل نہیں ہے۔ ہنگامے اور جرائم بھی اتنے زیادہ نہیں ہیں۔ امریکہ کے مقابلے میں زیادہ پُرسکون ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں لوگوں کے پاس ایک دوسرے سے ملنے کی لئے فرصت بھی ہے ورنہ اس طرح فراغت سے بیٹھ کر باتیں کرنا' امریکہ میں کہاں نصیب ہوتا ہے۔"

انہیں ہماری یہ بات پسند نہیں آئی' کہنے لگیں "بات یہ ہے کہ کینیڈا امریکہ کے مقابلے میں کم ترقی یافتہ ہے۔ اس لئے یہاں لوگوں کی مصروفیات بھی کم ہیں فرصت زیادہ ہے۔"

ہم نے کہا "یہاں جرائم بھی کم ہیں' اس لئے خوف و خطر نہیں ہے۔"

بولیں "اس لئے کہ یہاں ابھی آبادی کم ہے اور خاص طور پر کالے بہت کم ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں سڑکوں پر رش کتنا کم ہے۔؟"

نواب صاحب بے اختیار ہنسنے لگے۔ سب نے ان کی جانب دیکھا۔ امریکی خاتون نے بھی انہیں گھورا اور بڑے تیزابی لہجے میں پوچھا "کیا میں نے کوئی ہنسی والی بات کہہ دی ہے۔"

نواب صاحب نے کہا "جس بات پر ہنسی آجائے وہی ہنسی والی ہوتی ہے۔ محترمہ' آپ نے ان سے پوچھا ہے کہ انہیں امریکہ اور کینیڈا میں سے زیادہ کون سا ملک پسند آیا۔ انہوں نے اپنی پسند بتا دی ہے تو آپ نے وضاحت پیش کرنی شروع کر دی۔ ہو سکتا ہے انہیں کینیڈا اسی لئے پسند ہو کہ یہ کم ترقی یافتہ ہے اور یہاں کے لوگ ابھی مکمل طور پر مشین نہیں بنے ہیں۔"

اس کے جواب میں مس ٹالبوٹ نے (غالباً ان کا یہی نام تھا) امریکی آئین اور حقوق انسانی کے احترام کے موضوع پر ایک لیکچر جھاڑ دیا۔ دیکھنے میں تو وہ بہت خوب صورت اور خوش مزاج نظر آتی تھیں' مگر ان کی گفتگو بہت بور اور اکتا دینے والی تھی۔ پھر انہوں نے امریکی جمہوریت اور عدل و انصاف کی تعریف شروع کر دی۔ اس دوران میں مسز طارق نے آئس کریم لا کر دی۔ پھر کافی کا دور چلا مگر ان کی تقریر کسی طرح ختم نہیں ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے ایسی امریکن پہلی (اور آخری بار) ہی دیکھی تھی۔ آئس کریم تو وہ اپنی تقریر کے ساتھ ہی کھا گئی تھیں مگر جب کافی کا گھونٹ لینے کے لئے رکیں تو سب پہلو بدل رہے تھے اور ہر ایک کی خواہش تھی کہ موضوع گفتگو تبدیل ہو جائے۔ پس منظر میں ایک بہت خوب صورت نغمہ بج رہا تھا۔ "ون وے ٹکٹ" یہ ان دنوں ساری دنیا میں بہت مقبول تھا مگر مس ٹالبوٹ نہ تو خود گانا سن رہی تھیں اور نہ کسی اور کو سننے کا موقع دے رہی تھیں اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اپنی تقریر شروع کرتیں ہم نے ان سے عرض کیا "مس ٹالبوٹ' معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو پولیٹیکل سائنس سے بہت دلچسپی ہے؟"

کہنے لگیں "اوہ' یہ تو میرا پسندیدہ مضمون ہے۔ میں نے اس موضوع پر بہت پڑھا ہے۔"

ہم نے کہا "مگر آپ نے صرف امریکی نظریئے کے تحت پڑھا ہے دوسروں کے بارے میں نہیں پڑھا۔ ہمیں بھی اس مضمون سے بہت دلچسپی ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم اس سلسلے میں بعد میں گفتگو کر لیں گے۔ ذرا تفصیل کے ساتھ۔"

کہنے لگیں "اصل بات یہ ہے کہ لوگوں کو امریکہ کے بارے میں بہت غلط فہمیاں ہیں۔"

ہم بولے "ہو سکتا ہے' مگر امریکیوں کو بھی باقی دنیا کے بارے میں بہت غلط فہمیاں ہیں۔ اول تو وہ دوسروں کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں ہیں اور جو کچھ جانتے ہیں وہ بھی غلط ہوتا ہے۔"

انہوں نے غصے میں کافی کی پیالی میز پر رکھ دی اور جھگڑا شروع کرنے کے انداز میں بولیں "آپ امریکہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ اتنے تھوڑے عرصے میں آپ کو اتنے بڑے ملک کے بارے میں کیا معلومات حاصل ہو سکتی ہیں؟"

ہم نے کہا "ہم امریکہ آنے سے پہلے ہی اس کے بارے میں اتنا کچھ جانتے تھے کہ خود آپ ساری عمر یہاں رہنے کے باوجود نہیں جانتیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے اخبارات دنیا بھر کی خبریں، معلومات اور تبصرے شائع کرتے رہتے ہیں۔ پھر ہمارا نصاب تعلیم بھی ایسا ہے کہ خود اپنے ملک کے مقابلے میں دوسرے ملکوں سے زیادہ روشناس کراتا ہے۔ ہمارے ہاں امریکہ کے بارے میں جاننا بھی فیشن میں داخل ہے۔ ہم بہت باخبر اور قابل قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔"

سب مسکرانے لگے مگر مس ٹالبوٹ بل کھانے لگیں، ہم نے کہا "ذرا ایک منٹ صبر کیجئے۔ ہم ابھی ثبوت پیش کر دیتے ہیں" یہ کہہ کر ہم نے اپنی بچیوں نادیہ اور پارو کو آواز دی جو دوسرے کمرے میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ نادیہ کی عمر اس وقت نو سال اور پارو کی پانچ سال ہو گی۔ ہم نے پوچھا "تم ٹی وی پر کیا دیکھ رہی تھیں؟"

انہوں نے پروگرام کے بارے میں بتایا اور اس کی خوبیاں بھی بیان کر دیں۔

"تمہیں اور کون سے پروگرام پسند ہیں؟ ہم نے پوچھا۔

انہوں نے جواب میں ایک لمبی فہرست گنوا دی اور مشہور معروف پروگرام کرنے والوں کے نام بھی بتا دیے۔ اس موضوع پر دونوں بہنوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور انہوں نے ایک دوسرے سے بحث شروع کر دی جو کہ خالص امریکی لب و لہجے میں جاری تھی۔ سب لوگ بہت دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ آخر ہم نے ان سے کہا کہ باقی بحث وہ دوسرے کمرے میں جا کر کریں۔

ان دونوں کے جانے کے بعد مس ٹالبوٹ نے پوچھا "کیا یہ بچیاں امریکہ میں پیدا ہوئی ہیں؟"

ہم نے کہا "جی نہیں، انہیں امریکہ آئے ہوئے صرف چھ سات مہینے ہوئے ہیں۔"

وہ حیران رہ گئیں "مگر یہ ٹی وی پروگراموں کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہیں اور ان

کا لب و لہجہ تو خالص امریکی ہے۔"

ہم نے کہا "یہ انہوں نے پچھلے چند مہینوں میں سیکھا ہے۔"

"مگر یہ اتنی اچھی انگریزی کیسے بولتی ہیں؟"

"یہ بھی انہوں نے یہیں سیکھی ہے۔ نادیہ لاہور میں کانونٹ میں تھی، اس لئے پہلے سے انگریزی جانتی تھی مگر پارو نے یہیں آکر انگریزی سیکھی ہے۔"

"ونڈر فل!" وہ حیران رہ گئیں "یقین نہیں آتا۔"

ہم نے کہا "شاید اب آپ کو ہماری قوم کے بارے میں کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا؟"

وہ مسکرانے لگیں اور کہا "میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔"

امریکیوں میں یوں تو دنیا بھر کی خوبیاں ہوں گی مگر سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اپنے سامنے کسی دوسرے کو کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے غرور کا مظاہرہ کرتے ہیں یا ان کے ساتھ حقارت کے ساتھ پیش آتے ہیں، مگر ان کا رویہ ایسا ہوتا ہے جیسے کہہ رہے ہوں "تم چپ رہو۔ اپنی اوقات میں رہو" ان کے مقابلے میں کینیڈا والوں کو ہم نے خاصا کشادہ دل اور باخبر پایا۔

فلم کی شوٹنگ کا جہاں تک تعلق ہے ٹورنٹو میں کسی قسم کی مشکل پیش نہیں آئی۔ نہ کسی محکمے سے اجازت لینے کی ضرورت پڑی۔ نہ ہی کسی مقام پر شوٹنگ کے لئے پولیس کی مدد لینی پڑی۔ اول تو پرہجوم مقامات پر شوٹنگ کرنے سے پرہیز ہی کیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہاں زیادہ ہجوم ہوتا بھی نہیں تھا۔ لوگ بھی کم ہیں اور دوسروں کے معاملات سے سروکار بھی نہیں رکھتے۔ مگر اس کے باوجود بعض اوقات ایسے واقعات پیش آجاتے تھے جو ان سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔

ایک بار ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو میں ایک پر رونق جگہ پر ننھے اور خرم کا ایک سین فلمانے کا پروگرام بنایا گیا' مگر پھر اس خیال سے ملتوی کر دیا گیا کہ وہاں تو لوگ بہت ہوں گے۔ ننھے صاحب کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ سیدھے پرویز صاحب کے پاس گئے اور پوچھنے لگے "سر' ایک بات تو بتائیں۔ کیا آپ کسی سے ڈرتے ہیں؟"

وہ حیران ہو گئے "نہیں تو' مگر کیوں؟"

"تو پھر اس شاپنگ سینٹر میں شوٹنگ کیوں نہیں کرتے؟"

"بھئی وہاں لوگ بہت ہوتے ہیں۔"

"ہوتے ہیں تو ہوا کریں۔ دیکھئے' اب ہماری مونچھ نیچے نہ کیجئے' شوٹنگ ہو گی تو وہیں ہو گی۔"

خیال ان کا بہت معقول تھا۔ ان کے اصرار پر وہاں شوٹنگ کا پروگرام طے ہو گیا۔ سین یہ ہے کہ خان صاحب اپنے کینیڈین پوتے کے ہمراہ بازار گئے ہیں اور تھک ہار کر ایک بینچ پر بیٹھ گئے ہیں۔ اب مشکل یہ ہے کہ پوتا بھی ان سے کچھ کہنا چاہتا ہے اور دادا بھی اپنے پوتے سے پیار و محبت اور اخلاص کی باتیں کرنا چاہتے ہیں مگر بات کریں تو کیسے

اور کس زبان میں؟ دونوں کی زبانیں مختلف ہیں۔

پرویز صاحب نے ان دونوں کو بینچ پر بیٹھا دیا اور کہا کہ پہلے آپ لوگ سین کی ریہرسل کر لیں۔ ننھا خالص پٹھانی لباس میں تھے۔ چوڑے گھیر والی شلوار' لمبا کرتہ' سر پر کلاہ' پیروں میں پشاوری چپل' چہرے پر بڑی رعب دار مونچھیں' قمیص کے اوپر انہوں نے ایک واسکٹ بھی پہن رکھی تھی اور سو فیصد اصلی پٹھان نظر آرہے تھے۔ ان کے مقابلے میں پوتے کا یہ حال تھا کہ ایک بنیان نما شرٹ اور انتہائی مختصر نیکر پہنے ہوئے تھا جسے امریکی "شورٹ" کہتے ہیں۔ ننھا صاحب نے بینچ پر بیٹھ کر پوتے کا سرتاپا جائزہ لیا اور پھر کہنے لگے "سر' پہلے اسے کپڑے تو پہنائیں۔"

"کپڑے پہنے تو ہوئے ہیں اس نے؟"

"میرا مطلب ہے شریفانہ کپڑے پہنائیں۔ یہ تین بٹا چار تو ننگا ہے۔ بے شرم کہیں کا۔ ہمارے ملک میں پٹھان لوگ مردوں کے لئے ایسا لباس پسند نہیں کرتے۔"

"مگر یہ تو بچہ ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟ ہے تو مرد کا بچہ۔"

"ارے بھئی یہ کینیڈا میں پیدا ہوا ہے۔ یہیں پرورش پائی ہے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔"

"مگر مجھے تو شرم آرہی ہے"' یہ کہہ کر وہ منہ پھیر کر مسکرانے لگے۔

پرویز صاحب نہایت سنجیدگی سے سمجھانے لگے "ننھا' کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہی تو ہماری فلم کی تھیم ہے کہ مغرب میں پلنے والا بچہ کیا ہوتا ہے اور مشرق سے آنے والا دادا کیا محسوس کرتا ہے۔ اب آپ یہ سوچئے کہ آپ خالص پٹھان ہیں اور یہ آپ کا پوتا ہے اگر سچ مچ ایسا ہوتا تو آپ کیا کرتے؟"

"خوچہ ام اس کو ایک دم گولی مار دیتا۔ بے حیائی برداشت نہیں کرتا" یہ کہہ کر انہوں نے واسکٹ کی جیب سے نسوار کی ڈبیا نکالی اور نہایت ماہرانہ انداز میں ایک چٹکی زبان کے نیچے رکھ لی "خوچہ پرویز سیب' آپ کو ام کیا بتائے؟ ایسا ناخلف' ناہنجار اولاد کو تو ام برداشت نہیں کر سکتا۔ خوچہ ام کو ایک بندوق وندوق لا کر دو۔ ام اس کو گولی مار دے گا۔"

پرویز صاحب سچ مچ پریشان ہو گئے مگر شاہ جی نے کہا "پرویز صاحب' آپ تو سچ مچ سیریس ہو گئے۔ یہ آپ کو تنگ کر رہا ہے۔"

"اچھا' تو پھر ریہرسل شروع کریں۔"

ریہرسل شروع ہوئی تو دیکھنے والوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ پوتا انتہائی ٹھیٹ امریکی' کینیڈین لہجے میں انگریزی بول رہا تھا اور دادا جو انگریزی سے مطلق نابلد تھے چیخ چیخ کر پٹھانی لہجے میں اردو بول کر اور خالص پشتو زبان میں پوتے کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ خوچہ' ام تمارا بات نئیں سمجھتا۔ صورت یہ تھی کہ جاوید چوہدری کا بیٹا شان' جو ان کے پوتے کے روپ میں تھا' واقعی کینیڈا میں پیدا ہوا تھا۔ وہیں پلا بڑھا۔ اردو بھی اسے برائے نام ہی آتی تھی۔ یوں سمجھئے کہ رنگ و روپ' وضع قطع سے "گورا" لگتا تھا۔ گورا رنگ' شربتی رنگ' کے بال' ہری آنکھیں جو اس نے اپنے باپ سے ورثے میں پائی تھیں۔ شان تو مشکل اردو ویسے بھی نہیں سمجھتا تھا۔ بولنا تو خیر اسے آتی ہی نہیں تھی۔ اس لئے جب اس سین کی ریہرسل شروع ہوئی تو اس پر اصل کا گمان گزرتا تھا۔

ایک موٹی سی گوری خاتون برابر سے گزریں تو انہوں نے دیکھا کہ ایک موٹا تازہ شخص جو کسی نامانوس لباس میں ہے' ایک انگریز بچے کو ڈانٹ ڈپٹ رہا ہے۔ ان سے یہ ظلم برداشت نہیں ہو سکا تو وہ بڑھ کر ان دونوں کے نزدیک پہنچ گئیں جہاں "پوتا" سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اور "دادا" شور مچا رہے تھے کہ آخر تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے ہو؟ خاتون نے دور رکھے ہوئے کیمرے کو بالکل نہیں دیکھا اور شان کے ساتھ اظہار ہمدردی کے طور انگریزی میں پوچھا "کیا بات ہے' یہ موٹا آدمی تمہیں کیوں تنگ کر رہا ہے؟" موٹے کے لفظ پر ننھے نے بھی ان خاتون کی جانب دیکھا جو بذات خود کم و بیش ان ہی کے سائز کی تھیں۔

شان نے کہا "میڈم' یہ میرا گرینڈ فادر ہے مگر میری زبان نہیں سمجھتا۔"

میڈم نے حیران ہو کر ان دونوں کو دیکھا اور پھر بولیں "کتنے شرم کی بات ہے' اتنا بڑا ہو گیا ہے اور انگریزی نہیں جانتا۔ ینگ مین' تم نے اپنے گرینڈ فادر کو انگریزی کیوں نہیں سکھائی؟"

"یہ سیکھنا نہیں چاہتا بس اپنی زبان بولتا ہے۔"

اتنی دیر میں واجد صاحب بھی ٹہلتے ہوئے ان لوگوں کے پاس چلے گئے تھے۔ میڈم سے کہنے لگے "میڈم' یہ آدمی انگریزی نہیں سیکھ سکتا۔ بڈھے طوطے بھی کہیں پڑھتے ہیں۔"

وہ کہنے لگیں "مگر یہ تو بچے کے ساتھ ظلم ہے۔ بیٹے' تمہارے گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟"

"گرینڈ فادر' ڈیڈ اور ممی۔"

میڈم نے کہا "وہ دونوں اس اولڈ مین کو کیوں نہیں سمجھاتے؟"

اب ننھے سے خاموش نہیں رہا گیا۔ انگریزی میں کہنے لگے "ارے وہ ہمیں کیا سمجھائیں گے' ہم بہت خطرناک آدمی ہیں۔ دیکھا نہیں تم نے؟"

میڈم انہیں اچانک انگریزی بولتے ہوئے پا کر حیران رہ گئیں' کہنے لگیں "تو کیا تم انگریزی جانتے ہو؟"

کہنے لگے "بالکل جانتے ہیں۔"

"تو پھر بچے کو کیوں تنگ کر رہے ہو؟"

"میری مرضی۔"

"کیا مطلب میری مرضی۔ یہ ایک مہذب ملک ہے۔ یہاں بچوں کو تنگ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا آپ کو تنگ کروں؟"

"کیا؟" وہ غصے اور حیرت سے منہ کھولے رہ گئیں۔

"دیکھئے میڈم' یہ ہمارا آپس کا خاندانی معاملہ ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ چاہے جو سلوک کریں' آپ کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔"

"مگر تم بچے کو تنگ کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لئے کہ مجھے اس بات کے پیسے ملتے ہیں۔"

"اوہ مائی گاڈ!" وہ حیران رہ گئیں "یہ میں کیا سن رہی ہوں! اس معصوم بچے کو تنگ کرنے کے لئے تمہیں کون پیسے دیتا ہے؟"

ننھے نے بڑے اطمینان سے پرویز صاحب کی طرف اشارہ کر دیا جو کچھ فاصلے پر

کھڑے شاہ صاحب کے ساتھ باتیں کر رہے تھے "اس آدمی کو آپ دیکھ رہی ہیں' اونچا لمبا' گورا سا' پتلون اور بش شرٹ پہنے ہوئے ہے؟"

"ہاں' ہاں' بالکل دیکھ رہی ہوں۔"

"بس' یہ سب اسی شخص کی مہربانی ہے۔"

"غضب خدا کا۔ دن دہاڑے' کھلے بازار میں ایک معصوم کے ساتھ ایسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ میں شکایت کروں گی۔ یہ آدمی ہے کون؟"

"یہ فلم ڈائریکٹر ہے۔"

"فلم ڈائریکٹر!"

"جی ہاں' آپ کی اطلاع کے لئے ہم لوگ ایک فلم کی شوٹنگ کر رہے ہیں' اور اس کام کے لئے بہت دور سے آئے ہیں۔ شاید آپ کو علم نہیں ہے کہ آپ ہمارا نقصان کر رہی ہیں۔"

موٹی خاتون پریشانی سے چاروں طرف دیکھنے لگیں۔ پھر ان کی نظر دور رکھے ہوئے کیمرے پر بھی پڑی۔ فلم یونٹ کے لوگ بھی نظر آگئے جو کپڑے کی چھجے دار ٹوپیاں پہنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

"اوہ! واقعی میں بے حد شرمندہ ہوں' آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"پہلے آپ نے پوچھا ہی نہیں تھا" ننھا نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اور پھر "خوچہ ام اپنا طبیعت درست کرے گا" کہہ کر واسکٹ کی جیب سے نسوار کی ڈبیا نکالی اور ایک چٹکی نسوار اپنے رخسار میں ڈال لی۔ میڈم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں کہنے لگیں "آپ نشہ کرتے ہیں؟"

"جی نہیں نسوار تو بس ذرا تازہ دم کرنے کے لئے ہوتی ہے اور یہ تو نسوار بھی نہیں ہے' پسی ہوئی سونف ہے۔"

ان کی یہ بات بالکل درست تھی۔ ظاہر ہے کہ ننھے کو سچ مچ نسوار استعمال کرنے کی عادت تو نہیں تھی۔ کردار میں اصلیت کا رنگ پیدا کرنے کے لئے انہیں پسی ہوئی سونف نسوار کے طور پر استعمال کرنے کو دی گئی تھی جسے وہ بڑی مہارت کے ساتھ چٹکی بھر کر اپنی زبان کے نیچے رکھ لیا کرتے تھے اور پھر یوں گفتگو کرتے تھے جیسے سچ مچ نسوار

ان کے منہ میں رکھی ہوئی ہے۔

اتنی دیر میں پرویز صاحب ضروری تبادلہ خیال سے فارغ ہو کر ان لوگوں کے پاس چلے آئے "کیوں بھئی' آپ لوگوں نے ریہرسل مکمل کرلی ہو تو شوٹنگ کریں؟"

"شوٹنگ کیا خاک کریں گے سر۔ پہلے میڈم سے تو نجات دلائیں۔" پھر ننھے نے میڈم سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا "یہی ڈائریکٹر ہیں' آپ کے مجرم۔"

میڈم ہنس پڑیں اور پرویز صاحب سے معذرت کرنے لگیں۔ انہوں نے سارا واقعہ سنا تو بہت ہنسے' پھر ننھے سے ان کا باقاعدہ تعارف کرایا گیا کہ یہ ہمارے ملک کے بہت اچھے کامیڈین ہیں' وہ بھی خاصی زندہ دل تھیں' مسکرا کر بولیں "وہ تو دیکھنے میں ہی نظر آرہے ہیں۔"

ننھے نے میڈم سے تو کچھ نہیں کہا مگر پرویز صاحب سے کہنے لگے "سر' ہم دونوں کا بہت اچھا جوڑا بن سکتا ہے۔"

واجد صاحب نے میڈم کو کافی کی دعوت دی جو انہوں نے اصرار کے باوجود قبول نہ کی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں آپ لوگوں کا مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ ابھی تو آپ کا کافی بریک بھی نہیں ہوا۔ واجد صاحب نے انہیں سمجھایا کہ یہ فلم والے ہیں۔ ان کے لئے ہر وقت کافی اور چائے بریک ہو سکتا ہے۔ مگر وہ شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئیں۔ دراصل انہیں کسی سے ملاقات کے لئے جانا تھا اور ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ اس لئے تاخیر کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ان کے جانے کے بعد یہ دلچسپ منظر فلما لیا گیا۔

ننھے صاحب کو اپنا یہ لباس اور گیٹ اپ اتنا پسند آیا تھا کہ وہ شوٹنگ کے بغیر بھی اسی حلئے میں بازار چلے جایا کرتے تھے۔ ٹورنٹو میں یہ لباس اور کلاہ عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتا' اس لئے لوگ بہت حیران ہو کر انہیں دیکھتے تھے اور پوچھتے تھے کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ وہ اس سوال سے اس قدر تنگ آ گئے کہ ایک دن جب ایک بچے نے پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں تو جل کر بولے "کوہ قاف سے۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آیا "کوہ قاف سے؟ مگر آپ ہیں کون؟"

"میں جن ہوں' تم نے چراغ الہ دین والی فلم دیکھی تھی۔"

"ہاں۔"

"تو بس' میں ویسا ہی ایک جن ہوں۔ کوہ قاف میں جن اور پریاں رہتی ہیں۔"

بچہ حیرت زدہ ہو کر انہیں دیکھتا رہا پھر چلا گیا۔ ننھے نے دکان میں اپنی پسند کی ٹائیاں دیکھنا شروع کر دیں۔ اتنی دیر میں وہ بچہ اپنی ماں کو لے کر آ گیا "یہ دیکھیں مما' یہ جن ہیں۔ کوہ قاف سے آئے ہیں۔"

مما نے سر سے پیر تک ننھے کا جائزہ لیا' پھر ہنسنے لگیں "ارے نہیں' یہ تو آدمی ہیں' ہمارے تمہارے جیسے۔"

"یہ ہمارے جیسے تو نہیں ہیں۔"

"صرف لباس ہی کا تو فرق ہے نا' اگر یہ جن ہوتے تو ان کے دو سینگ بھی ہوتے' سر پر آگے کی طرف۔"

"مما' اپنے سینگ انہوں نے اونچی ٹوپی کے اندر چھپا لئے ہیں۔ یہ سچ مچ کے جن ہیں۔ ان سے کہیں کہ سینڈوچ کی پلیٹ ہوا میں سے نکال کر دیں۔"

جب بچے کی ضد ختم نہ ہوئی تو اس کی والدہ ننھے کے قریب گئیں اور کہا "معاف کیجئے' میرا بچہ سمجھ رہا ہے کہ آپ جن ہیں۔ جادو سے ہر چیز منگوا سکتے ہیں۔"

ننھے نے سنجیدگی سے کہا "معاف کرنا' میں جن ہوں کوئی جادوگر نہیں ہوں۔"

"کیا واقعی؟"

"اور کیا' یقین نہیں آتا' تو ان سے پوچھ لیجئے" انہوں نے پاس کھڑے ہوئے جاوید چوہدری کی جانب اشارہ کر دیا۔ وہ پہلے ہر انکار میں سر ہلا رہے تھے "بالکل نہیں ہیں' یہ جن ون نہیں ہیں۔"

"تو پھر کیا ہیں؟"

"یہ ایکٹر ہیں۔ ایک فلم کی شوٹنگ کے لئے پاکستان سے آئے ہیں۔"

بچہ بہت غور سے یہ گفتگو سن رہا تھا' پوچھنے لگا' مما' کیا پاکستان کوہ قاف میں ہے؟"

"نہیں بیٹا! کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتے ہو؟ پاکستان تو افغانستان میں ہے۔" لیجئے والدہ صاحبہ بچے سے بھی زیادہ باخبر نکلیں۔

ننھے نے بچے سے کہا "بیٹے' اگر تم کہتے ہو تو میں تمہارے لئے سینڈوچ بھی لا سکتا ہوں۔"

بچہ خوش ہو گیا "ہوا میں سے؟"

"نہیں میکڈانلڈ سے' یہاں تازہ ملتے ہیں۔ کوہ قاف سے آتے آتے تو باسی ہو جائیں گے۔"

بڑی مشکل سے بچے کو یقین آیا کہ وہ محض مذاق کر رہے تھے۔ ننھے بہت زندہ دل اور ہنس مکھ انسان تھے۔ فلم میں کینیڈین لڑکی وریٹا جو ان کی بہو کا کردار ادا کر رہی تھی' اس سے وہ اکثر ہنسی مذاق دل لگی کرتے رہتے تھے۔ ایک دن ان کے فلمی بیٹے اعجاز نے ان سے کہا "ڈیڈی' کچھ تو لحاظ کیجئے۔ یہ آپ کی ڈاٹر ان لاء ہے۔"

کہنے لگے "برخوردار! کہیں تم اسے سچ مچ تو اپنی بیوی نہیں سمجھ بیٹھے ہو؟"

وہ کھسیانے سے ہو گئے "نہیں تو۔"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ یہ بے چاری سچ مچ تمہاری بیوی نہیں ہے ورنہ اب تک نہ جانے کیا کر چکی ہوتی۔"

"مثلاً کیا کر چکی ہوتی؟"

"مثلاً یہ کہ تم کو طلاق دے کر مجھ سے شادی کر چکی ہوتی۔"

ویریٹا کو انگریزی میں اس گفتگو کا ترجمہ کر کے سنایا گیا تو وہ بولی "یہ بات پچاس صد درست ہے۔"

"وہ کیسے؟"

کہا "شوہر کو طلاق تو میں ضرور دے دیتی مگر مسٹر نانا سے شادی ہرگز نہیں کرتی۔"

سب ہنسنے لگے، ننھے بولے "ان گوری عورتوں میں کم از کم یہ خوبی ضرور ہے جھوٹ نہیں بولتیں۔ منہ پر سب کچھ کہہ ڈالتی ہیں۔"

پرویز ملک صاحب نے بڑی تحقیق اور تلاش کے بعد چند لوکیشنز تلاش کی تھیں۔ ندیم اور خرم کے بہت دلچسپ سین تھے جن میں سے بہت سے فلم میں نہیں رکھے گئے۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ خرم کی کوشش ہر طرح سے یہ تھی کہ کسی طرح باپ کو واپس پاکستان چلنے پر مجبور کر دے۔ اس مقصد کے لئے وہ مختلف قسم کی حرکتیں کرتا تھا۔ ندیم صاحب کی عادت تھی کہ اسے ہر لمحے یہ کہا کرتے تھے کہ یہ کینیڈا ہے، یہاں ایسا ہی ہے۔ تنگ آکر بیٹے نے بھی ایسی ہی حرکتیں شروع کر دیں۔ ایک دن شبنم نے اسے گھر بلایا تو اس نے اپنے باپ سے کہا کہ آج شام اسے ڈیٹ پر جانا ہے۔

"ڈیٹ پر! کیا بک رہے ہو؟"

"پاپا، آپ حیران کیوں ہو رہے ہیں؟"

"اس لئے کہ تم ابھی بچے ہو، جھوٹے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہئے۔"

"شرم کی کیا بات ہے پاپا! یہ کینیڈا ہے، یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"مگر مگر تم تو پاکستانی ہو۔"

"پاکستانی تو آپ بھی ہیں۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں واپس پاکستان جانا ہے۔"

"واپس تو ایک دن آپ کو بھی جانا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ خیر یہ الگ بات ہے مگر تم ڈیٹ پر نہیں جاسکتے۔"

"کیوں نہیں جاسکتا؟ یہاں تو بچے بھی ڈیٹ پر جاتے ہیں۔"

ندیم کچھ سٹپٹا گئے "جاتے تو ہیں، مگر ماں باپ کی اجازت کے بغیر نہیں جاسکتے۔"

"میں آپ سے اجازت ہی لینے آیا ہوں۔"

ندیم سوچ میں پڑ گئے "کس کے ساتھ ڈیٹ ہے؟"

"ایک لڑکی کے ساتھ۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ وہ تو ظاہر ہے کہ لڑکی ہی ہوگی، مگر کون ہے؟ کیسی ہے؟"

"بہت اچھی لڑکی ہے پاپا۔"

"کہاں رہتی ہے؟"

"آپ باتوں باتوں میں اس کا پتا دریافت کرنا چاہتے ہیں؟"

"بکو مت۔"

"دیکھئے پاپا، آپ نے مجھ سے معاہدہ کیا ہے کہ نہ میں آپ کے معاملات میں دخل دوں گا نہ آپ مجھے کچھ کہیں گے۔ یہاں کا یہی دستور ہے۔ جس کا جو جی چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ میں نے تو آپ کو کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

مجبور ہو کر ندیم نے اُسے ڈیٹ پر جانے کی اجازت دے دی۔ شام کو صاحب زادے کالا سوٹ پہن کر اور بوٹائی لگا کر آ گئے "پاپا، میں آپ کی خوشبو لگا سکتا ہوں؟"

پاپا نے جل بھن کر اجازت دے دی "مگر تم جاؤ گے کیسے؟ میں تمہیں ڈراپ کر دوں؟"

"جی نہیں، شکریہ۔ میں بس پر چلا جاؤں گا۔"

ادھر شبنم نے اپنی ماں کو بتایا ہے کہ اس کی ایک لڑکے سے ڈیٹ ہے۔ وہ شام کو ہمارے گھر آئے گا۔ ماں یہ سن کر بہت حیران ہوتی ہے کیونکہ اس سے پہلے شبنم نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ جب شام کو اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجتی ہے اور خرم صاحب اندر داخل ہوتے ہیں تو ماں بیٹی کا ہنس ہنس کر برا حال ہو جاتا ہے۔ شبنم بھی جانتی ہے، بلکہ اس سازش میں شریک ہے۔

ندیم نے بیٹے کو اجازت تو دے دی مگر دھیان اسی طرف لگا ہوا ہے۔ دراصل اسی طرح یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ پاکستانی چاہے کتنا بھی مغرب زدہ ہو جائے، اندر سے خالص پاکستانی ہی رہتا ہے۔ پاکستانیوں کی ساری مغربیت اور فیشن پرستی ان کی ذات تک محدود

ہوتی ہے۔ اپنے گھر والوں اور اولاد کے لئے ان کا معیار اور نظریہ کچھ اور ہوتا ہے۔

ایک اور سین بہت دلچسپ تھا جو طوالت کی وجہ سے فلم میں نہیں رکھا جا سکا۔ ندیم اپنے بیٹے کے اصرار پر ایک دن اسے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ صاحب زادے غسل کرنے کے لئے اوپر باتھ روم میں جاتے ہیں۔ ادھر پاپا نیچے کھڑے آوازیں دے رہے ہیں کہ کیا کر رہے ہو' بس باہر نکل آؤ۔ خرم پکار کر کہتا ہے کہ میں نہا رہا ہوں۔

ندیم "جو کچھ بھی کر رہے ہو اسی وقت چھوڑ دو اور فوراً تیار ہو کر آجاؤ۔"

سعادت مند بیٹا ایسا ہی کرتا ہے اور باتھ ٹب کا شاور بند کئے بغیر جلدی جلدی لباس پہن کر نیچے پہنچ جاتا ہے۔ پانی پہلے باتھ ٹب میں جاتا ہے پھر غسل خانے میں پھیل جاتا ہے یہاں تک کہ غسل خانے سے باہر بہتا ہوا سیڑھیوں پر سے گزر کر نیچے پہنچتا ہے اور پھر بیرونی دروازے سے باہر نکلنے لگتا ہے۔ جب پانی بہت زیادہ مقدار میں باہر نکل کر آس پاس کے میدان کو بھی بھر دیتا ہے تو پڑوسیوں کو پریشانی ہوتی ہے اور فائر بریگیڈ کو مدد کے لئے فون کرتے ہیں۔

دوسری طرف خرم جہاں بھی اپنے پاپا کے ساتھ جاتا ہے کوئی نہ کوئی پرابلم پیدا کر دیتا ہے۔ سب سے قابلِ اعتراض بات تو یہ کہ وہ ہر لڑکی کو بتا دیتا ہے کہ یہ میرے پاپا ہیں اور پاپا اسے گھور کر رہ جاتے ہیں۔ بیزار ہو کر پاپا اسے واپس لے کر گھر پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آس پاس کے لوگ کھڑے ہوئے تماشا دیکھ رہے ہیں اور گھر کے اندر سے پانی کا چشمہ ابل رہا ہے۔

اس قسم کے کچھ دلچسپ مناظر تھے۔ پھر دوسری طرف مغربی زندگی کی قباحتیں بھی اجاگر کی گئی تھیں کہ جب لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو بوڑھوں کے گھروں میں پناہ لیتے ہیں اور تن تنہا زندگی گزارتے ہیں' حالانکہ ان لوگوں کی اپنی اولاد بھی ہے جو شہروں میں رہتی ہے۔ مگر نہ تو وہ بوڑھے والدین کو اپنے پاس رکھتے ہیں اور نہ ہی ان سے ملنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ غریب' بے سہارا' کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس بیٹے یا بیٹی کا خط یا کارڈ آتا ہے تو سارے ہوم میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

مغربی زندگی کی خوبیاں اپنی جگہ مگر اس سسٹم میں خرابیاں بھی ہیں۔ سب سے بڑی ی تو یہ ہے کہ یہ انسانی رشتوں اور جذبوں کو ختم کر دیتا ہے۔ مشرق کے رہنے والوں لئے یہ بہت تکلیف دہ بات ہے۔ دراصل یہ ہم لوگوں کی فطرت اور مزاج کے خلاف ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نہ کسی مرحلے پر پاکستانیوں کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ ں نے اپنی تہذیب' اپنا وطن اور اپنے رسم و رواج کو چھوڑ کر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ وہ یں اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں مگر گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا۔ سب سے بڑھ کر ، وہ وہاں کی زندگی میں اتنے پھنس چکے ہوتے ہیں کہ واپسی کے راستے بھی بند نظر ہیں۔

ہم نے مغربی ملکوں میں جو بات سب سے زیادہ شدت سے محسوس کی وہ یہ کہ وہاں ے والے اپنی مذہبی رسوم اور دوسری معاشرتی قدروں سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں۔ ا بیاہ کے موقع پر یکجا ہونا تو دور کی بات ہے' مرنے پر بھی ایک دوسرے کے شریک یں ہو سکتے۔ یہی حال عید بقر عید کا بھی ہے۔ بقر عید کے موقع پر کسی کو اتنی فرصت وفیق کہاں کہ قربانی کرنے کے بارے میں سوچے۔ پھر ایک ٹیکنیکل پرابلم یہ ہے کہ ہر ا اپنی مرضی سے ہر جگہ قربانی بھی نہیں کر سکتا۔ وہاں تو مویشی ذبح کرنے کے لئے مذبح ے (سلاٹر ہاؤس) ہوتے ہیں۔ اس جگہ کے سوا کسی اور جگہ مویشی ذبح نہیں کیا جا ۔ یہ خلاف قانون ہے' پھر اپنے گھر کے آس پاس مویشی کاٹنے کی اجازت کون دے ہے؟ کیونکہ اس روز نہ تو چھٹی ہوتی ہے اور نہ ہی ملنے ملانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ اکثر ، تو عید کی نماز کے لئے بھی چھٹی نہیں کر سکتے۔ کچھ لوگ البتہ کچھ دیر کی چھٹی لے کر یں شریک ہونے کے لئے پہنچ جاتے ہیں یا پھر اس روز کسی نہ کسی بہانے چھٹی منا

لیتے ہیں۔ ہم نے دیارِ مغرب میں کئی عیدیں منائی ہیں۔ ایک عید ٹورنٹو میں بھی منائی اب ذرا اس عید کا احوال سنئے۔

ایک روز واجد صاحب کے گھر گئے تو دیکھا کہ خلاف معمول ان کے تمام بھائی موجود تھے۔ ان کی بہن عفت نے جلدی جلدی کھانا پکا کر میز پر لگا دیا۔ رفعت ان کی چھوٹی بہن ہیں۔ کہیں جاب کرتی تھیں مگر ان دنوں نوکری ووکری چھوڑ کر سوشل سیکیوریٹی کے چیک پر عیش کر رہی تھیں۔ واجد صاحب کے چھوٹے بھائی شعیب جنرل موٹرز کی فیکٹری میں اچھی خاصی کمائی کر رہے تھے مگر پھر کیا سوجھی کہ وہ بھی جاب چھوڑ کر بیٹھ گئے اور سوشل سیکیوریٹی سے اپنا وظیفہ وصول کرنے لگے۔ واجد صاحب کی بیگم نازنین بھابی عام طور پر گھر ہی میں رہتی ہیں' اس لئے ظاہر ہے کہ کوئی جاب نہیں کرتیں۔ کبھی موڈ آجائے تو کر لیتی ہیں ورنہ گھر بیٹھے وظیفہ وصول کرتی ہیں۔ گویا اس گھر میں لے دے کر صرف واجد صاحب ایک ایسے شخص تھے جو "بر سرِ روزگار" تھے لہٰذا ان کے گھر میں صبح شام' رات ہر وقت رونق رہتی تھی۔ ماموں اپنے چھوٹے سے بھانجے اور اس سے قدرے بڑی بھانجی کے ساتھ کھیلتے رہتے تھے یا پھر ویڈیو پر فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ عفت کو فلمیں دیکھنے کے بعد دوسرا شوق مختلف قسم کے کھانے پکانے کا تھا۔

میں نے شاید پہلے بھی بتایا ہے کہ واجد صاحب یوں تو کراچی سے ٹورنٹو پہنچے تھے مگر اس سے پہلے ان کا خاندان حیدر آباد دکن میں مقیم رہا تھا۔ زبان ان لوگوں کی بہت صاف تھی۔ قاف کو قاف ہی بولتے تھے' خاف نہیں کہتے تھے۔ گزرے ہوئے تمام دنوں کو پرسوں نہیں کہتے تھے۔ نہ آنے والے زمانے کو پرسوں کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ پتا نہیں کس قسم کے حیدر آبادی تھے۔ البتہ کھانوں سے پتا چلتا تھا کہ سچ مچ حیدر آبادی ہیں۔ بڑے لذیذ کھانے' مگر اکثر میں کھٹاس۔ حیدر آبادی کھانوں کی ایک مخصوص لذت ہوتی ہے عفت اور ان کی بھابی ان پکوانوں پر پورا عبور رکھتی تھیں۔ چنانچہ واجد صاحب کی ہر وقت یہی کوشش ہوا کرتی تھی کہ ہم لوگ ان کے گھر چلیں' گپ شپ کریں اور کھانا کھائیں۔ اس روز کا پروگرام بھی یہی تھا کہ پہلے چائے' پھر کھانا۔ اس کے بعد پھر چائے اور اس کے بعد پھر کھانا۔ اس کے بعد پھر چائے اور پھر...... ظاہر ہے کہ کھا کھا کر سب لوگ خوب سیر ہو چکے تھے اور جب لطیفہ بازی کی ہمت بھی نہ رہی تو ویڈیو پر فلمیں دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ واجد صاحب کے گھر میں بھی وہی رواج تھا جو عموماً سارے گھروں میں تھا۔ یعنی گھر میں داخل ہوتے ہی سب لوگ جوتے اتار کر گھر میں ننگے پیر گھوما کرتے تھے۔ گھر میں فرش پر ہر جگہ قالین تھے' اس لئے ننگے پیر پھرنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ اس رواج کا فائدہ یہ ہے کہ گھر میں داخل ہوتے ہی آپ کو پتا لگ جاتا ہے کہ گھر میں کتنے لوگ موجود ہیں۔ اول تو باہر پارکنگ سے بھی یہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اگر کاریں زیادہ ہیں تو لوگ بھی زیادہ ہوں گے۔ معلومات کی باقی کمی آپ جوتوں کی تعداد دیکھ کر پوری کر لیتے ہیں۔

ہم لوگ ڈرائنگ روم میں صوفوں میں دھنسے ہوئے تھے' مگر زبانیں سب کی مصروف تھیں۔ عفت سیڑھیوں پر سے اتر کر آئیں "چائے کون کون پئے گا؟" ایک دو کے سوا کسی نے ہاتھ اونچا نہیں کیا' بھئی چائے پینے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

"آفاقی بھائی' آپ بھی چائے نہیں پئیں گے؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا' ان کی حیرانی بھی بجا تھی اس لئے کہ ہم عام طور پر چائے کی دعوت کو رد نہیں کرتے' مگر اس وقت صورت حال کچھ ایسی تھی کہ چائے پیتے پیتے تھک گئے تھے۔

"تو پھر کوک لے آؤں؟"

"نہیں' شکریہ۔"

"فریش جوس؟"

ہم نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"پھر تو آئس کریم ضرور چلے گی۔"

آئس کریم اللہ میاں کی بنائی ہوئی (انسانوں اور مشینوں کے ذریعے) ایک ایسی نعمت ہے جس سے انکار کو ہم واقعی کفرانِ نعمت خیال کرتے ہیں۔ پیٹ کتنا ہی کیوں نہ بھرا ہوا ہو' ہمارے ایک پروفیسر کے بقول آئس کریم کا خانہ ہر وقت خالی رہتا ہے۔ ہمارے اقرار پر وہ آئس کریم لینے چلی گئیں۔ شعیب ٹی وی لاؤنج سے آئے تو کچھ سیب وغیرہ ہمراہ لے آئے اور ہر ایک کو پیش کرنے لگے۔ پھر پوچھا "کل عید کی نماز کے لئے کون کون جائے گا؟"

"کون سی عید؟" ہم نے پوچھا

"چھوٹی عید' سویوں والی۔"

"اوہو' ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا کہ اگلے دن عید الفطر بھی ہے۔" "اور پتا لگتا بھی کیسے جب کہ کبھی رمضان اور روزے کا کوئی ذکر ہی نہیں سنا۔ ان دنوں ہم نواب خالق کے پینٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ حسب معمول بیرونی ملکوں کے دوروں پر تھے۔ کبھی واپس آتے تو لبنیٰ سے مختلف قسم کے کھانوں کی فرمائشیں کرنے میں مصروف ہو جاتے اور وہ بھی ان سے داد وصول کرنے کے لالچ میں انواع و اقسام کے دیسی کھانے پکانے میں مصروف ہو جاتیں۔ اس زمانے میں انہوں نے ایسے ایسے کھانے پکائے جو کبھی ہم نے اپنے گھر میں نہیں کھائے تھے۔ اس کا سبب وہ یہ بتایا کرتی تھیں کہ ان میں سے بہت سے کھانے تو وہ پکاتی رہی تھیں مگر ہمیں یاد نہیں رہے۔ کچھ ایسے کھانے تھے جن کا ہمیں علم ہی نہیں تھا۔ مگر نواب عبدالخالق نے وہ اپنے دل کی نوٹ بک میں لکھ رکھے تھے۔ جب کوئی پاکستانی مہمان خاتون ان کے گھر پہنچ جاتیں تو وہ یہ فہرست نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد کچھ کھانے ایسے تھے جن کی تعریف میں نواب صاحب زمین آسمان کے قلابے ملا دیا کرتے تھے "واہ صاحب واہ! کیا بات ہے۔ کیا مزہ ہے' لبنیٰ آپ نے سچ مچ کمال کر دیا۔ مغل بادشاہوں کے باورچی بھی اگر چکھ لیں تو کان پکڑ لیں گے آپ کے سامنے۔"

اس قسم کی تعریفیں جنہیں لبنیٰ "قدردانی" کا نام دیتی تھیں' ہمارے بس میں نہیں تھیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس سے پہلے ہم ان نعمتوں سے محروم ہی رہتے تھے۔ بہر حال نہ ہم نے کسی کو روزے رکھتے ہوئے دیکھا۔ نہ تراویح کے لئے جاتے ہوئے دیکھا۔ روزے اور رمضان کا کوئی ذکر ہی سننے میں نہیں آیا تھا۔ ادھر خود ہمارا یہ حال ہے کہ اگر ہمیں کوئی دن یاد رہتا ہے تو تاریخ یاد نہیں رہتی اور تاریخ یاد آجائے تو یہ بھول جاتے ہیں کہ دن کون سا ہے؟ اس لئے یہ توقع رکھنا کہ ہم یہ حساب بھی یاد رکھیں کہ اب اسلامی کیلنڈر کا کون سا مہینہ ہے اور عیدالفطر کب منائی جائے گی' ممکن نہیں تھا۔ اپنے ملک میں تو مختلف بہانوں سے آپ کو یہ پتا چلتا رہتا ہے کہ اب کون سا اسلامی مہینہ چل رہا ہے اور اس کے بعد آنے والا مہینہ کون سا ہے اور کچھ نہیں تو اخبارات دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے مگر ٹورنٹو کے اخبارات کو کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ انگریزی مہینے کے ساتھ اسلامی مہینے بھی شائع کر دیتے۔

یہ طولانی تقریر یہ بتانے کی غرض سے پیش کی گئی ہے کہ جب واجد صاحب کے بھائی شعیب نے ہم سے پوچھا کہ کل نماز کے لئے کون کون جائے گا تو واقعی ہم حیران رہ گئے کہ دیکھئے' رمضان گزر گیا اور عیدالفطر آ گئی مگر ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ دراصل ہم لوگ پاکستان میں رہ رہ کر بہت سی باتوں کے عادی ہو گئے ہیں جو کم از کم مغربی ملکوں میں تو ناپید ہیں۔ مثلاً رمضان ہی کو دیکھ لیجئے۔ ہمارے ملک میں کتنے زور و شور سے منایا جاتا ہے۔ جو رمضان نہیں مناتے وہ احترام رمضان ضرور مناتے ہیں بلکہ اب تو انہیں زبردستی منانا پڑتا ہے۔ پہلے زمانے میں تو ہوٹل' ریستوران وغیرہ پردہ دار ہو جاتے تھے۔ رمضان کا مہینہ آیا تو ان دکانوں کے آگے پردے لٹک گئے۔ اب جسے کھانا پینا ہے وہ پردے کے پیچھے چلا جائے۔ چنانچہ بہت بڑی آبادی اس زمانے میں "باپردہ" ہو جاتی تھی۔ مگر اب چند سالوں سے یہ بات بھی نہیں رہی۔ کھانے پینے کی دکانیں قطعی بند ہو جاتی ہیں۔ پھر پبلک میں کھلے عام کھانا پینا بھی بند ہو جاتا ہے' اس لئے ہر قدم پر یاد دہانی ہوتی رہتی ہے کہ اے ایمان والو! یہ رمضان کا محترم مہینہ ہے۔ پھر جس طرف دیکھئے افطاری کا بندوبست ہو رہا ہے۔

روزہ کوئی رکھے نہ رکھے افطاری بہت زبردست ہوتی ہے۔ جو روزے دار ہیں وہ سحری کے لئے بھی خوب اہتمام کرتے ہیں گویا اس طرح بھی یہ معلوم ہوتا رہتا ہے کہ رمضان کا مہینہ آ گیا ہے۔ اس مہینے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر شخص ایک ایک دن بڑے اہتمام سے گنتا ہے۔ جو روزے دار ہے وہ تو اس لئے گنتا ہے تاکہ پتا رہے کہ اب کتنے روزے باقی رہ گئے ہیں اور اس نے اب تک کتنا ثواب کمایا ہے' دیکھئے صاحب آخر گناہ و ثواب کا حساب کتاب رکھنا بھی تو ضروری ہے۔ چنانچہ نیک اور جنتی لوگ ثواب کا حساب رکھتے ہیں۔ دوسری طرف روزے خور ایک ایک دن گنتے رہتے ہیں کہ اب ان کے لئے احترام رمضان میں اور کتنے دن باقی رہ گئے ہیں بلکہ ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ روزہ نہ رکھنے والے زیادہ بے صبری اور بے تابی سے دن گنتے ہیں۔ گویا اپنے گناہوں کو شمار کرتے رہتے ہیں۔ اللہ بچائے' وہی روزہ دار اور روزہ خور دونوں کو معاف کرنے والا ہے۔ ورنہ اگر یہ معاف کرنے کا اختیار کہیں مولویوں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا تو پھر

کسی کا جنت کے قریب پھٹکنا بھی مشکل ہو جاتا۔

ہم نے کہا "بھئی یہ بڑی زیادتی کی بات ہے کہ آپ لوگوں نے ہمیں رمضان کا بتایا تک نہیں۔ سارا رمضان گزر گیا اور ہمیں کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔"

لبنیٰ نے کہا "اگر بتا دیتے تو کیا آپ پورے روزے رکھ لیتے؟"

اب بتائیے' ان خواتین کو کوئی کیا سمجھائے؟ انہیں یہ تک علم نہیں ہے کہ حالت سفر میں مومنوں کے لئے کتنی رعایتیں دی گئی ہیں۔ ان کی ایسی ہی حرکتوں کے باعث ان میں سے کسی ایک کی پوری گواہی تک نہیں مانی جاتی۔ ایک گواہی کے لئے دو خاتون گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر شاید اس لئے مولویوں کے گھروں کے اندر سربراہی بیگمات ہی کی ہوتی ہے۔ ان کی ساری زبردستی بھی بس گھر کے باہر والوں ہی کے لئے رہ گئی ہے۔

واجد صاحب نے کہا "آفاقی صاحب' یہاں کا روزہ بہت لمبا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں دن کتنا بڑا ہوتا ہے۔ علی الصبح سورج نکلتا ہے تو پھر پندرہ گھنٹے تک غروب ہونے کا نام نہیں لیتا۔"

ان کی بیگم نے کہا "تو پھر کیا ہوا' اس کا ثواب بھی تو زیادہ ہو گا۔"

"کیا یہ آپ کا فتویٰ ہے؟"

لیجئے' یہاں تو مسئلے مسائل شروع ہو گئے اور یہ ایک ایسا جھگڑا ہے جو آج تک طے نہیں ہونے پایا ہے۔ اس لئے ہم نے بحث شروع ہونے سے پہلے ہی معاملہ رفع دفع کرا دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ دیکھئے جناب' روزہ تو ہم نے ایک بھی نہیں رکھا مگر عید کی نماز پڑھنے کے لئے ضرور جائیں گے۔ ہمارے اس اعلان کا رد عمل کچھ ملا جلا ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ جو لوگ عید کی نماز پڑھنے جاتے تھے ان کا جانا تو لازمی تھا ہی مگر جو نہیں جاتے تھے مہمان کے احترام میں 'انہیں بھی نماز کے لئے جانا پڑ گیا۔ ہم نے لبنیٰ سے کہا کہ کل صبح ہماری اکلوتی شلوار قمیص نکال دیں۔ دراصل ہمیں شلوار قمیص بہت ہی اچھا لباس لگتا ہے مگر اس وقت جب یہ کسی دوسرے نے زیب تن کیا ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ خود ہمارے لئے یہ لباس مناسب نہیں ہے۔ کم از کم یہ لباس پہن کر ہم خود اپنی نگاہوں میں گر جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے لمبا قد اور بھرا ہوا جسم ہونا چاہئے۔ جب کہ ہم ان

دونوں شرطوں پر پورے نہیں اترتے۔ پھر جوں جوں زمانہ ترقی کر رہا ہے 'شلوار کا گھیر اور قمیص کی لمبائی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ شلوار کو کیسے سنبھالیں اور گھیر سے کس طرح عہدہ برآ ہوں۔ اس گھیر کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ آخر یہ جائے تو کہاں جائے؟ اسے سامنے اکٹھا کرو تو پیٹ یوں پھول جاتا ہے جیسے..... خیر' یوں سمجھئے کہ بہت زیادہ پھول جاتا ہے۔ اگر اسے پچھلی جانب رکھیں تو گومڑا سا نکل آتا ہے اور ہم خود کو کیڑا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے' شلوار اور بہت لمبی قمیص کے دامنوں کو سنبھالنا بھی خاصا مشکل کام ہے۔ شاید اسی سائز کے لمبے چوڑے دامن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے کہ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔

مگر ہماری بیگم کا اصرار تھا کہ شلوار قمیص کیونکہ ہمارا قومی لباس ہے اس لئے لازمی طور پر پہننا چاہئے۔ اسی لئے وہ جب موقع پاتی ہیں۔ ہمارے لئے شلوار قمیص کا ایک سوٹ خرید لاتی ہیں۔ جب سے ریڈی میڈ لباس کا دستور نکلا ہے یہ ضروری نہیں رہا کہ انسان درزی کے پاس جا کر ناپ بھی دے۔ ایک بیوی کے طور پر یہ لبنیٰ کا حق ہے کہ وہ شلوار قمیص سوٹ خرید لیں مگر ظاہر ہے کہ وہ خود تو یہ سوٹ پہننے سے رہیں اس لئے یہ شلوار قمیص سوٹ عموماً الماریوں میں لٹکے رہتے ہیں۔ مگر جب ہم گھر سے باہر جاتے ہیں تو کم از کم ایک شلوار قمیص ہمارے سامان میں ضرور پیک کیا جاتا ہے۔ جو عام طور پر استعمال ہوئے بغیر ہی گھر واپس پہنچ جاتا ہے' مگر عید بقر عید کے موقع پر اس کا استعمال لازمی ہو جاتا ہے۔

اب دوسرے لوگوں نے بھی عید کے لئے کپڑوں کا انتخاب شروع کر دیا۔ شعیب اور ناصر کے پاس تو شاید شلوار قمیص سوٹ تھا ہی نہیں' اس لئے انہوں نے پتلون اور بش شرٹ کا انتخاب کر لیا۔ واجد صاحب شادی شدہ آدمی ہیں اور ان کی بیگم نازنین بھی خاصی سگھڑ بیوی ہیں' اس لئے انہوں نے شلوار قمیص کا بندوبست کر کے رکھا ہے۔

رفعت نے فوراً عید کے لئے سویاں بنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان شہروں میں جہاں جہاں ہندوستانی اور پاکستانی کافی تعداد میں رہتے ہیں' ایشائیوں کی دکانوں میں ہر قسم کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ چکلہ بیلن' توا' پرات قسم کی چیزیں بھی دستیاب ہیں اور کھانا پکانے کے لئے بھی ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ جو ہندوستان اور پاکستان سے آتا ہے۔ سویاں بھی

دکانوں میں مل جاتی ہیں۔ خشک میوہ ہر جگہ ملتا ہے۔ چھوارے اور کھجوریں بھی تلاش کرنے سے ہاتھ آجاتی ہیں۔ اگر سویاں کسی وجہ سے نہ ملیں تو سمجھ دار خواتین سپ گیتھی سے کام چلالیتی ہیں۔ ان دونوں چیزوں میں بظاہر تو یہ فرق ہے کہ سویاں بہت باریک ہوتی ہیں جبکہ سپ گیتھی کی سویاں ذرا موٹی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ غالباً ان کی پکانے کی ترکیب اور ان میں استعمال کیا جانے والا سامان بھی مختلف ہے۔ سب سے بڑا فرق تو یہ ہے کہ سپ گیتھی اٹلی کی ایجاد ہے اور ہمیشہ نمکین ہی استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں سویاں برصغیر پاک و ہند سے مخصوص ہیں اور ہم نے زندگی میں جب کھائیں میٹھی سویاں ہی کھائیں۔ نمکین سویاں کھانے کا کوئی تصور ہمارے ہاں موجود نہیں ہے۔

رفعت نے فوراً اپنے بھائیوں کو سویاں لانے پر مامور کردیا۔ خشک میوہ' چھوارے یا کھجوریں لانے کے سلسلے میں بھی ضروری ہدایات جاری کردیں اور پھر عید کے دن کا مینو تیار کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان صاحب کا عالم یہ تھا کہ عام دنوں میں بھی جب تک یہ آئے گئے مہمان کے سامنے کم سے کم چار پانچ قسم کے کھانے پکا کر نہ رکھیں انہیں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اگلے دن تو عید تھی۔ ظاہر ہے کہ عید کی ضیافت کے لئے خاص اہتمام اور تیاری ضروری تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اچھی خاصی گہما گہمی پیدا ہو گئی اور ہمیں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اگلے روز عید ہے اور ہم سب مسلمان ہیں۔ واجد صاحب کو یہ سہولت ہے کہ سب بہن بھائی ایک ساتھ رہتے ہیں اور عادتوں کے اعتبار سے خاصے دیسی ہیں' اس لئے یہاں "عید" کا انتظام بھی شروع ہو گیا۔ ورنہ جو لوگ تنہا یا محض جوڑے کی صورت میں دور دور رہتے ہیں ان کے گھروں میں عید آکر چپکے سے گزر جاتی ہے۔ نہ نماز' نہ روزے' نہ سویاں اور شیر خورمہ۔

واجد صاحب نے ہم سے پوچھا "اچھا" یہ بتائیے کہ آپ ٹرف پر پڑھیں گے یا گھاس پر؟"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا اور کہا معاف کیجئے' آپ عید کی نماز پڑھنے جا رہے ہیں یا ہاکی میچ کھیلنے کا ارادہ ہے۔"

وہ ہنسنے لگے "بات دراصل یہ ہے کہ یہاں ایک نماز تو بہت دور ہوتی ہے اور ایک

جماعت بیس بال گراؤنڈ میں ہوتی ہے۔ یہاں ٹرف بچھا ہوا ہے۔"

ہم نے کہا "ہم تو ٹرف پر نماز پڑھیں گے تاکہ یادگار تو رہے۔ ورنہ مسجدوں اور عید گاہوں میں تو بہت سی نمازیں پڑھ چکے ہیں۔ اور پھر یہ بھی محسوس کریں گے کہ ٹرف پر نماز پڑھنے میں اور مسجد کے صحن میں نماز پڑھنے میں کیا فرق ہے؟"

دوسرے دن ہم تیار ہو کر ان کے ہمراہ بیس بال گراؤنڈ پہنچ گئے۔ یہ بہت وسیع و عریض گراؤنڈ تھا جس کے اردگرد تماشائیوں کے لئے اسٹینڈ بنے ہوئے تھے۔ اس وقت نماز دیکھنے کے لئے تماشائیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ گراؤنڈ کا بھی محض ایک حصہ نماز کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ مغربی ملکوں میں یہ دستور عام ہے کہ جہاں عید گاہ یا مسجد نہیں ہوتی اس علاقے میں کھیل کے میدان یا بال روم نماز کے لئے کرائے پر لے لئے جاتے ہیں۔ کھیل کے میدان کی حد تک تو خیر ٹھیک ہے مگر بال روم میں نماز کے بارے میں اگر مولوی صاحب سے دریافت کیا جائے تو وہ فوراً اسے "ناجائز" قرار دے دیں گے۔ جس جگہ غیر محرم مرد اور نامحرم عورتیں بے حیائی کے ساتھ ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈال کر ناچتے رہے ہوں وہاں عید کی نماز پڑھی جائے' کم از کم کسی مولوی کا جذبہ ایمانی قبول نہیں کر سکتا۔ مگر مجبوراً ایسا بھی کرنا پڑتا ہے کیونکہ نماز کے لئے اور کوئی بڑی جگہ میسر نہیں ہوتی۔ اب وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی آبادیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور مختلف علاقوں میں مسجدوں اور اسلامی مراکز بھی بنائے جا رہے ہیں' اس لئے بہت سے مقامات پر مسجدیں تعمیر ہو چکی ہیں۔

بیس بال گراؤنڈ میں واقعی میلے کا سا سماں تھا۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد قمیص شلوار' کرتا پاجامہ اور شیروانیوں میں ملبوس تھی۔ سروں پر مختلف قسم کی ٹوپیاں تھیں۔ خاصا "روح پرور" سماں تھا۔ بیس بال گراؤنڈ کا ذکر سن کر ہمارے ذہن میں نمازیوں کا جو تصور قائم ہوا تھا' یہ منظر اس سے بالکل مختلف تھا۔ بڑی عمر کے لوگوں کے ہمراہ بچے بھی تھے اور خواتین کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی جن کے لئے علیحدہ نماز کا بندوبست کیا گیا تھا۔ عورتوں کو تو اللہ موقع دے۔ انہوں نے عید سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خوب میک اپ

کیا تھا۔ زرق برق لباس' زیورات' نئے نئے ہیر اسٹائل' اونچی ایڑی کے جوتے' مختلف قسم کی خوشبوئیں' خوب رونق تھی بچے بھی اچھے اچھے ملبوسات میں تھے۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر پتلون اور سوٹ میں نظر آئے۔ بچیاں بھی فراک پہنے ہوئے تھیں مگر مشرقی لباس میں بھی کافی بچیاں نظر آئیں۔ مجموعی طور پر یہ ایک اچھا منظر تھا' جو ظاہر ہے کہ ہمارے ملک سے کسی حد تک مختلف تھا۔

نماز شروع ہوئی تو سب نے صفیں باندھیں اور بار بار یہ اعلان کرنا پڑا کہ حضرات' صفیں سیدھی کر لیجئے۔ جن صفوں میں جگہ خالی ہے' پہلے انہیں پر کیجئے۔ اس کے بعد ہدایات شروع ہوئیں کہ نماز پڑھنے کا کیا طریقہ ہے۔ نیت کیسے کرنی چاہئے۔ کتنی تکبیریں ہوں گی۔ کون سی تکبیر کے بعد ہاتھ باندھنے ہیں اور کون سی تکبیر کے بعد رکوع میں جانا ہے۔ خیر' یہ تو وہ ہدایات ہیں جو ہر عید پر ہم پاکستان کی مسجدوں میں بھی سنتے رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عید چونکہ سال میں صرف دوبار ہی آتی ہے۔ اس لئے لوگ تفصیلات بھول جاتے ہیں اور امام حضرات کو یاد دہانی کے طور پر یہ سب کچھ بتانا پڑتا ہے۔ اگر نہ بتائیں تو ذرا سوچئے کہ کتنا کنفیوژن پیدا ہو جائے اور نماز بھی "فری فار آل" ہو جائے۔ کوئی صاحب تکبیر پر ہاتھ باندھ لیں' کوئی کھول لیں' اور کوئی رکوع میں چلے جائیں۔ گویا ہر عید پر نماز کی ترکیب اور تفصیل بتانا بہت کار آمد چیز ہے بلکہ اسے کار ثواب کہنا چاہئے۔ اس کے بعد یہ اعلان بھی ہر جگہ کیا جاتا ہے کہ نماز کے بعد خطبہ سننا بہت ضروری ہے۔ جب تک خطبہ ختم نہ ہو اپنی جگہ بیٹھے رہیں۔

یہاں اس کے علاوہ اور بھی اعلان سننے میں آئے۔ مثلاً فلاں فلاں نمبر کی کار کی روشنیاں جل رہی ہیں' مالک اسے بجھا دیں۔ ایک صاحب نے اپنی کار ایسی جگہ کھڑی کر دی تھی جہاں نماز ہونی تھی۔ پھر یہ اعلان بھی ہوئے کہ فلاں صاحب کی مسزان کے بارے میں پریشان ہیں کہ وہ کہاں گم ہو گئے ہیں۔ گم شدہ بچوں کے متعلق بھی اعلان ہوتے رہے کہ نماز کے بعد اس حلئے اور اس نام کے بچے یا بچی کو فلاں جگہ سے آ کر لے لیں۔ اس عید کی نماز میں سب سے خوشی کی بات ہمارے لئے یہ تھی کہ ایک بھی فقیر نظر نہیں آیا۔ ورنہ فقیر اور فقیرنیاں نمازیوں سے بھی زیادہ تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کو شاید عید کی نماز بھی معاف ہے کیونکہ یہ نماز میں شریک نہیں ہوتے۔ بس اپنے شکار کی تلاش میں

رہتے ہیں۔ ادھر خطبہ ختم ہونے کے بعد لوگوں نے عید ملنی شروع کی اور بھکاریوں اور بھکارنوں کے کورس شروع ہو گئے۔ اب تو انہوں نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ نمازیوں کی صفوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہی امام صاحب نے سلام پھیرا' انہوں نے کھڑے ہو کر بہ آواز بلند اعلان کرنا شروع کر دیا کہ حضرات میں بہت مصیبت زدہ ہوں' امداد کا مستحق ہوں' وغیرہ وغیرہ۔ بعض فقیر تو باقاعدہ خطاب شروع کر دیتے ہیں اور لوگوں کو امام صاحب کا خطبہ تک نہیں سننے دیتے۔ مگر ٹورنٹو میں بیس بال کے میدان میں کوئی ایک فقیر بھی موجود نہیں تھا جو ہمارے لئے درحقیقت ایک "روح پرور" منظر تھا۔

نماز کے دوران میں کچھ اور "روح پرور" نظارے بھی دیکھنے میں آئے۔ مثلاً ایک چھ سات سال عمر کے صاحب زادے تھے جنہوں نے خدا جانے کہاں سے ایک وڈیو گیم نکالا اور کھیلنا شروع کر دیا۔ کھیل کے ساتھ ہی وہ رواں تبصرہ بھی کرتے جا رہے تھے۔ مثلاً وہ مارا' بچ کر کہاں جائے گا' اوہ' نشانہ چوک گیا' وغیرہ وغیرہ۔ یہ تبصرے انگریزی میں تھے اور آپ جانتے ہیں کہ انگریزی کتنی زور دار زبان ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی یہ دلچسپیاں آس پاس کے نمازیوں کو پریشان کر رہی تھیں۔ ان کے والد صاحب تو ان کی سرگرمیوں سے قطعاً بے پروا تھے مگر دوسرے حضرات خاصے پریشان ہو رہے تھے۔ ایک دو بار انہوں نے کھنکار کر منع کرنے کی کوشش بھی کی مگر جو بچہ کھیل میں محو ہو وہ بھلا اس قسم کی آوازوں کو کیا خاطر میں لائے گا؟

ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ بائیں جانب جو نمازی کھڑے تھے ان کے نزدیک بیٹھی ہوئی چھ سات سالہ بچی نے رونا شروع کر دیا۔ خدا جانے اسے کسی بات پر رونا آ رہا تھا۔ امام صاحب کی تقریر بھی جاری نہیں تھی کہ اس کے دل پر چوٹ پڑی ہو۔ ہو سکتا ہے والدہ صاحبہ کا کوئی ظلم یاد آ گیا ہو یا بیس بال کے گراؤنڈ کی کھلی فضا نے اسے ورزش پر آمادہ کر دیا ہو یا پھر ویسے ہی تفریحاً اس نے آواز نکالنے کی مشق شروع کر دی ہو۔ وڈیو گیم والے صاحب زادے نے اتنا پریشان نہیں کیا تھا جتنا ان کی صاحبہ نے اودھم مچا دیا۔ ہم نے دیکھا کہ ان کے والد صاحب جو شلوار قمیص میں ملبوس تھے اور سر پر قراقلی ٹوپی بھی خوب جما کر رکھی تھی' بچی کی اس حرکت سے خاصے برہم ہو گئے۔ انہوں نے پہلے تو "ہوں ہوں" کر کے اسے چپ کرانا چاہا مگر جب کوئی سنوائی نہ ہوئی تو دبی زبان میں "شٹ

اپ' ڈونٹ ڈو اٹ" کہہ کر خاموش کرانے کی کوشش کی مگر بچی پر کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا بلکہ اس کی "روں روں" کی آواز بتدریج بلند ہونے لگی۔

سارے نمازی اس صورت حال سے نالاں نظر آ رہے تھے۔ نماز اور امام صاحب کی تلاوت کی جانب کس کافر کی توجہ تھی۔ آدھے لوگ وڈیو گیم میں باقی آدھے بچی کے رونے کی آواز کی طرف متوجہ تھے۔ یوں بھی امام صاحب کی آواز صاف طور پر سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس لئے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اب وہ کیا کر رہے ہیں؟ البتہ وقتاً فوقتاً تکبیر کی آوازیں گونج اٹھتی تھیں کیونکہ تکبیر کہنے والے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی امام صاحب تکبیر کہتے ان کے آس پاس والے فوراً صدائے بازگشت بلند کرتے اور اس طرح دور والے نمازیوں کو کم از کم یہ تو پتا چل رہا تھا کہ اب رکوع میں جانا ہے یا سجدے کی باری ہے۔ ہاتھ چھوڑنے اور باندھنے کے معاملے میں البتہ خاصا' کنفیوژن ہو رہا تھا۔ دراصل امام صاحب کی ہدایات لوگوں نے غور سے نہیں سنی تھیں اور جنہوں نے سنی تھیں انہیں یاد نہیں رہی تھیں۔ اب بتایئے ان حالات میں نماز پر ارتکاز کیوں کر ہوتا؟

بچی کے والد نے بالآخر ایک حل تلاش کر لیا۔ حل تو دراصل ان کے پاس پہلے بھی موجود تھا مگر خدا جانے انہوں نے پہلے اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟ بچی کے رونے کی آوازیں جب امام صاحب تک پہنچنے لگیں (حالانکہ امام صاحب کی آواز لاؤڈ اسپیکر کے باوجود نمازیوں تک نہیں پہنچ رہی تھی) تو بچی کے والد نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک ٹافی نکال کر بچی کے منہ میں ڈال دی بچی فوراً چپ ہو گئی اور اس وقت تک چپ رہی جب تک وہ ٹافی ختم نہ ہو گئی۔ مگر والد صاحب بھی نچلے تو نہیں بیٹھے تھے۔ مسلسل اس کی تاک میں تھے۔ جیسے اس نے اپنے حلق سے دوبارہ آوازیں بلند کرنے کا ارادہ کیا' انہوں نے ایک اور ٹافی یا لیمن ڈراپ جیب سے نکال کر اس کے منہ میں ڈال دیا۔ اس طرح کم از کم بقیہ نماز ضرور آرام اور سکون سے پڑھ لی گئی' اگرچہ وڈیو گیم کا مسئلہ بدستور جوں کا توں رہا۔

نماز ختم ہوئی تو سب نمازیوں نے گھور کر صاحب زادے کو دیکھا۔ ایک صاحب نے ان کے والد سے پوچھا "یہ بچہ آپ کا ہے؟"

"آپ کو کچھ اعتراض ہے؟"

بولے "مجھ ہی کو نہیں ساری کمیونٹی کو سخت اعتراض ہے۔ بھائی صاحب، اگر اسے آپ نے نماز نہیں سکھائی ہے تو کم از کم اتنا تو سکھا دیتے کہ یہ ویڈیو گیم کھیلنے کی جگہ نہیں ہے، مسجد ہے مسجد۔"

"سوری، یہ مسجد نہیں بیس بال کا گراؤنڈ ہے۔"

"مگر اس وقت اسے مسجد کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔"

"بچے ان باریکیوں سے واقف نہیں ہوتے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم اتنے بہت سے مسلمان آج تک علاقے میں ایک مسجد یا اسلامک سینٹر تک نہیں بنا سکے ہیں۔"

لیجئے انہوں نے موضوع ہی بدل دیا۔

امام صاحب نے اعلان کے مطابق خطبہ شروع کر دیا تھا، اس لئے یہ بحث زیادہ طول نہ کھینچ سکی۔ بہت سے لوگوں نے کھڑے ہو کر عید ملنی شروع کر دی اور خوب زور و شور سے "عید مبارک" کے نعرے لگانے لگے۔ ایک صاحب نے قدرے برہمی سے کہا "کم از کم خطبے کا تو احترام کریں۔"

"کون سا خطبہ؟"

"امام صاحب خطبہ پڑھ رہے ہیں۔"

"مگر یہاں تو آواز نہیں آ رہی۔ تو پھر کیا فرق پڑتا ہے؟"

یہ کہہ کر انہوں نے "عید مبارک" کا نعرہ مارا اور اپنے برابر والے کے گلے لگ گئے۔

کچھ دیر بعد خطبہ بھی ختم ہو گیا تو لوگوں نے زیادہ کھلے دل سے عید ملنی شروع کر دی۔ اب جو صفیں بکھریں تو اندازہ ہوا کہ لوگ کیسے کیسے لباس پہن کر عید کی نماز پڑھنے آئے تھے۔ کچھ لوگ تو شلوار قمیص یا سلیپنگ سوٹ پر گون پہن کر آ گئے تھے۔ کوٹ پتلون والوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ مگر اصل فیشن پریڈ تو خواتین کے حلقے میں دیکھنے میں آئی۔ ایک سے بڑھ کر ایک زرق برق لباس، فیشن ایبل ملبوسات، میک اپ، ہیر اسٹائل، خوشبوؤں کی لپٹیں کچھ خواتین زیورات سے بھی سج کر آئی تھیں اور حسب معمول دوسری خواتین نے ان سے دریافت کرنا شروع کر دیا تھا کہ یہ کہاں سے بنوایا ہے؟

گویا ٹورنٹو کی عورتیں بھی ہمارے ملک کی عورتوں سے مختلف نہیں نکلیں۔ کم از کم ملبوسات، فیشن اور زیورات کی حد تک ان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔

شعیب ایک صاحب کو ہم سے ملانے کے لئے لائے۔ خاصے بلند قامت اور تنومند آدمی تھے۔ انہوں نے سلیپنگ سوٹ کے پاجامے کے اوپر کرتا پہن رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ شلوار نہ جانے کہاں رکھ کر بھول گیا۔ جلدی میں مل نہ سکی۔

پوچھا "کاہے کی جلدی؟"

بولے "نماز کی، اور کس بات کی۔ ارے جناب، ہم لوگ اپنے کام کے لئے تو عین وقت پر پہنچ جاتے ہیں تو کیا نماز کے لئے وقت پر پہنچنا ضروری نہیں ہے؟" پھر انہوں نے چاروں طرف دیکھ کر جائزہ لیا اور بولے "کتنا اچھا گراؤنڈ ہے، بڑے تاریخی گیم ہو چکے ہیں۔ یہاں پر" اس کے بعد انہوں نے ان تاریخی میچوں کی داستان سنانا شروع کر دی۔ ظاہر ہے ہمیں بیس بال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دراصل یہ وہ گیم ہے جو ہمارے خیال میں گلی ڈنڈے اور کرکٹ کے میل ملاپ سے وجود میں آیا ہے۔ ہمیں تو کبھی اچھا نہیں لگا مگر امریکیوں کا یہ حال ہے کہ بیس بال کا میچ دیکھتے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ہمارے ہاں کرکٹ کا جو کریز ہے اگر اسے پچاس سے ضرب دی جائے تو وہ امریکیوں کے بیس بال کے شوق میں بدل جائے گا۔ امریکہ اور کینیڈا والے بھی بہت دلچسپ لوگ ہیں۔ دراصل کینیڈا بھی شمالی امریکہ ہی کا ایک تسلسل ہے، اس لئے امریکیوں میں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان لوگوں کا کمال یہ ہے کہ جب نئی دنیا آباد کی تو تمام چیزیں انگلستان سے لے آئے مگر ہر ایک میں کوئی تبدیلی یا جدت ضرور کی۔ واجد صاحب کے الفاظ میں ہر ایک کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔

بیس بال کے بارے میں آپ سن ہی چکے ہیں۔ اب فٹ بال کا حال زار بھی سن لیجئے۔ فٹ بال یورپ والوں کا بہت پسندیدہ کھیل ہے بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ یورپ کا قومی کھیل ہے۔ امریکہ میں بھی فٹ بال پہنچ گئی مگر بدلی ہوئی صورت میں۔ سب سے پہلے تو ان لوگوں نے اس کا نام ہی بدلا۔ فٹ بال سیدھا سادہ اور عام فہم لفظ ہے۔ مگر انہوں نے اسے بدل کر "رگبی" کر دیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کا حلیہ بھی بدل دیا۔ فٹ بال ایک گول مٹول چیز ہوتی ہے۔ جب کہ رگبی کی گیند بیضوی شکل کی ہے۔ سردے یا گرما

کی صورت سمجھ لیجئے۔ سائز میں فٹ بال سے کچھ بڑی اور مزید جدت یہ فرمائی کی فٹ بال تو پیروں سے کھیلی جاتی ہے مگر "رگبی" ہاتھوں سے کھیلی جاتی ہے۔ کھیلی کیا جاتی ہے' یوں سمجھئے کہ کوئی ایک صاحب یہ لمبوتری سی فٹ بال اپنے قبضے میں کرتے ہی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور دوسرے تمام کھلاڑی' اپنے ہوں یا پرائے' سب ان کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں اور ان سے بال چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ صاحب اس چھینا جھپٹی میں زمین پر گر جاتے ہیں تو دونوں ٹیموں کے سارے کھلاڑی بھی اس غریب پر گر جاتے ہیں۔ گویا بال تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی دوران میں رگبی کی گیند کسی اور صاحب کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ وہ انسانوں کے اس انبار میں سے گیند لے کر نکلتے ہیں اور بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے تمام کھلاڑی بھی ان کے تعاقب میں دوڑ پڑتے ہیں اور پھر وہی چوہا دوڑ بلی آئی' والا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔

اس کھیل میں چھین جھپٹ اور اٹھا پٹخ زیادہ ہوتی ہے۔ اول تو یہ شرط ہے کہ کھلاڑی دیو قامت ضرور ہو۔ اونچا لمبا' چوڑا چکلا' اور بے حد طاقت ور' کھلاڑی اچھے خاصے پہلوان یا باڈی بلڈر نظر آتے ہیں۔ پھر یہ سب کے سب جس بے رحمی سے گیند لے کر بھاگنے والے پر گرتے ہیں اگر کوئی شریف اور معقول آدمی ہو تو اس کی ہڈی پسلی سلامت نہ رہے۔ ہم جیسا تو ایسے ہی کچل کر مر جائے۔ اس لئے کھلاڑیوں کو حفاظتی تدابیر کے طور پر مختلف قسم کے زرہ بکتر پہنائے جاتے ہیں۔ کھلاڑی کا سر' چہرہ' گھٹنے' بازو سب ہی کی حفاظت کے لئے بندوبست ہوتا ہے۔ دیکھنے میں کھلاڑی کا حلیہ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جنگجو لڑائی کے لئے میدان جنگ میں جا رہا ہو۔ اس کے باوجود ہم تو بہت حیران ہوتے ہیں کہ آخر ان کھلاڑیوں کے ہاتھ پیر کیوں کر سلامت رہتے ہیں؟

پھر یہ بھی ناقابل فہم بات ہے کہ جب کوئی کھلاڑی رگبی کی بال لے کر بھاگتا ہے تو مخالف ٹیم والے تو خیر اس کے پیچھے بھاگتے ہی ہیں مگر خود اس کی اپنی ٹیم کے کھلاڑی اس کا پیچھا کیوں کرتے ہیں۔ غالباً بوقت ضرورت اس سے گیند لے کر اپنی تحویل میں لینے کی غرض سے۔ اس کھیل میں اٹھا پٹخ اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ایک منٹ بھی یکسوئی کے ساتھ کھیل جاری نہیں رہتا۔ ادھر کوئی کھلاڑی گیند لے کر مخالف گول کی جانب بھاگا اور ادھر سب کے سب اس پر جھپٹ پڑے۔ وہ گیند سمیت زمین پر گرا تو دھب دھب کر کے سب

ہی کھلاڑی اس پر گر گئے۔ ایسے ہجوم میں کوئی ایک کھلاڑی کس ترکیب سے گیند نکال کر لے جاتا ہے یہ معمہ بھی کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آسکا۔ خیر' امریکہ والوں کی اور بھی بہت سی عادتیں ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آئیں۔ ان ہی میں سے ایک "رگبی" کا کھیل بھی ہے۔

عید ملنے ملانے کا سلسلہ کافی دیر جاری رہا اور بہت سارے لوگوں سے ملاقات ہوئی جنہیں ہم مطلق نہیں جانتے تھے مگر وہ ہم سے واقف تھے۔ سب سے مزے دار بات یہ ہوئی کہ جب ہم لوگ بیس بال گراؤنڈ سے واپس جا رہے تھے تو ایک چھوٹا سا بچہ انگریزی میں اپنے ڈیڈی سے پوچھ رہا تھا کہ ڈیڈی' میچ کا نتیجہ کیا نکلا؟

ہم جس بیس منزلہ عمارت میں ٹھہرے ہوئے تھے اس میں تمام تر مقامی لوگوں کی رہائش تھی۔ ہم تو خیر عارضی مہمان تھے اور ان کی اکثریت وہاں کافی عرصے سے مقیم تھی۔ مگر کیا مجال جو "ہائی" کے علاوہ آپس میں کوئی بات ہو ملنے ملانے کا تو ظاہر ہے کہ سوال ہی نہیں تھا۔ ہمیں لوگوں کی شکلیں عموماً یاد نہیں رہتی ہیں اور پھر یہاں تو ہم نے یوں بھی کسی کو غور سے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس لئے کبھی پتا ہی نہیں چلا کہ عمارت میں اور کون کون رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے برابر میں جو لوگ رہتے تھے ہمیں ان کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں تھا۔ مگر کچھ بچے اس لئے یاد رہ گئے کہ وہ اسکیٹنگ کرتے ہوئے لفٹ میں داخل ہوتے تھے اور لفٹ رکنے پر اسکیٹنگ کرتے ہوئے ہی باہر نکل جاتے تھے۔ بعد میں اکثر یہ فٹ پاتھ پر نظر آتے تو بہت زور و شور سے "ہائی" کہتے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے پاس سے گزر جاتے۔ اک نو عمر لڑکی ہمیں اکثر لفٹ میں ملا کرتی تھی۔ وہ کبھی جینز اور قمیص میں ملبوس ہوتی، کبھی فراک اور اسکرٹ میں نظر آتی۔ گرمی کا موسم تھا اس لئے کئی بار مختصر سے نیکر (شورٹ) اور اس سے بھی مختصر بلاؤز میں بھی نظر آئی۔ کبھی اس کے بال کھلے ہوئے شانوں پر بکھرے ہوتے، کبھی فرنچ بریڈ کی صورت میں گندھے ہوتے، کبھی پونی ٹیل کی شکل میں ہوتے۔

یہ لڑکی گراؤنڈ فلور سے پہلے اپنی سائیکل کو لفٹ میں سوار کراتی، اس کے بعد خود بھی سمٹ سمٹا کر لفٹ میں داخل ہو جاتی۔ اکثر ہم نے یہ بھی نوٹ کیا کہ وہ دن میں مختلف لباسوں میں نظر آتی۔ صبح جینز میں ہے تو شام کو شرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے ہے۔ یہ لڑکی اگر فٹ پاتھ یا سڑک پر نظر آتی تو بہت زور شور سے "ہائی" ضرور کہتی اور ہاتھ بھی ہلاتی۔ ایک دن ہم نے واجد صاحب کی توجہ اس کے بدلتے ہوئے حلیوں اور لباسوں کی جانب مبذول کرائی اور پوچھا کہ آخر یہ لڑکی بار بار بہروپ کیوں بدلتی ہے۔ دن میں بار بار لباس تبدیل کرنے کا مغربی ملکوں میں دستور نہیں ہے۔ بلکہ بعض قسم کے لڑکے لڑکیاں تو سرے سے لباس بدلنے کے قائل ہی نہیں ہیں۔

واجد صاحب ہنسے اور بولے "آفاقی صاحب، آپ نے شاید کبھی اس لڑکی کو غور سے نہیں دیکھا"

ہم نے کہا "کیوں نہیں دیکھا؟ اتنی اچھی شکل کی لڑکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے بغور دیکھنا ہی پڑتا ہے۔"

کہنے لگے "تو پھر آپ کو آج تک یہ پتا ہی نہیں چل سکا کہ وہ ایک لڑکی نہیں ہے بلکہ تین مختلف لڑکیاں ہیں۔"

پہلے تو ہمیں یقین نہیں آیا۔ پھر ذرا دماغ پر زور ڈالا تو ان کی بات میں کچھ وزن بھی نظر آیا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ لڑکی کبھی پندرھویں فلور پر لفٹ سے نکل جاتی تھی، کبھی بیسویں فلور تک لفٹ کے ذریعے سواری کرتی تھی۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ وہ ایک لڑکی نہیں تھی۔ تین لڑکیاں تھیں۔ اگلے دن ننھے صاحب نے چائے پر بلایا تو ہم نے ان سے بھی یہ تذکرہ کیا۔ وہ ہنسے اور کہنے لگے "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ کو لڑکیوں کی پہچان بھی نہیں ہے؟"

ہم نے احتجاج کیا "کیوں نہیں ہے؟ ہم کوئی اندھے تو نہیں ہیں۔"

بولے "اللہ نہ کرے، مگر آپ کی نظر ضرور کمزور ہے۔"

ہم نے کہا "تو پھر کیا ہوا؟ ہم عینک بھی تو لگاتے ہیں۔"

کہنے لگے "آپ اپنی عینک کا نمبر بدلوائیے۔ وہ سچ مچ تین لڑکیاں ہیں۔ ایک کا نام میرل ہے، دوسری گیلین ہے اور تیسری کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ میرل کی آنکھیں نیلی ہیں۔ گیلین کی آنکھیں سبز ہیں اور تیسری والی کی آنکھوں کی رنگت کے مطابق ہے۔ میرل جینز پہنتی ہے۔ گیلین فراک اور اسکرٹ پہنتی ہے اور تیسری والی برائے نام کپڑے پہنتی ہے۔

ہم نے مشتبہ انداز میں انہیں دیکھا اور پوچھا "آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟"

جواب دیا "خود ان لڑکیوں نے۔ دیکھئے سر، میں اس بات کا قائل ہوں کہ اچھے

انسان کو اپنے ہمسایوں کی خبر گیری ضرور کرنی چاہئے۔ ان کے حالات سے باخبر رہنا بھی انسانی فرض ہے۔"

ہم نے کہا "اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں تو بے شمار لوگ رہتے ہیں۔ آپ کو اور کتنے لوگوں کے نام اور آنکھوں کی رنگت کا علم ہے؟"

کہنے لگے "آخر میں انسان ہوں۔ کمپیوٹر تو نہیں ہوں۔ ہر کام میں تھوڑی دیر تو لگتی ہی ہے۔"

ہم نے سوچا کہ ننھے کی ان گپوں کی تصدیق ضرور کرنی چاہئے۔ اگلے ہی دن ہمیں اس کا موقع مل گیا۔ جینز اور قمیص والی لڑکی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے والے مختصر سے لان میں ٹانگیں پسارے نیم دراز تھی۔ برابر میں اس کی سائیکل بھی دراز تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے مسکرا کر "ہائی" کہا۔ ہم نے بھی "ہائی" میں جواب دیا۔ یعنی وعلیکم السلام' اور ذرا رفتار ہلکی کر دی۔ اس نے آسمان کی جانب دیکھا اور کہنے لگی "نائس ویدر۔"

حالانکہ کافی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہوا میں خنکی ضرور تھی مگر دھوپ کی تمازت میں پسینہ آرہا تھا۔ مگر ہم نے بھی اخلاقاً کہا "ہاں' بہت خوش گوار موسم ہے۔" پھر پوچھا "ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟"

اس نے اپنی ٹانگیں سمیٹے بغیر کہا "شیور۔"

چنانچہ ہم بھی گھاس پر بیٹھ گئے۔ جیب سے سگار نکالا اور پوچھا "آپ کو اعتراض تو نہیں ہو گا؟"

وہ بے پروائی سے بولی "کوئی پروا کرتا ہے' اتنی کھلی جگہ پڑی ہے۔"

ہم نے سگار سلگا لیا' اب اس نے ذرا غور سے ہماری طرف دیکھا اور پوچھا "آپ بھی اس گروپ کے ساتھ ہیں جو فلم بنا رہا ہے؟"

ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کہنے لگی "آپ کی ہیروئین بہت پیاری ہے اور بہت کو آپریٹو بھی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بہت اخلاق سے مسکرا کر بات کرتی ہے" پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بولی "کاش میرا رنگ بھی اس کی طرح خوب صورت ہوتا۔"

بتایئے' جس رنگ کو ہم سانولا کہہ کر کوئی اہمیت نہیں دیتے اور جسے گورا کرنے کے لئے ہمارے ملک میں سینکڑوں قسم کی غلط سلط کریمیں بن چکی ہیں اسے یہ گوری چٹی (لڑ)کی "خوب صورت" بتا رہی تھی۔ پھر کہنے لگی "مگر آپ کا ہیرو بہت مغرور ہے۔ آنکھ بھر کر دیکھتا تک نہیں ہے۔"

ہم نے تسلی دی "سارے ہیرو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کسی کو خاطر میں نہیں (لا)تے' ہیروئینوں کے سوا اور وہ بھی محض کیمرے کے سامنے۔"

خدا جانے اس نے ہماری بات سنی بھی یا نہیں۔ خلا میں دیکھتے ہوئے کہنے لگی "کتنا (ہی)نڈسم ہے۔"

ہم نے اس تبصرے کا کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا' اس لئے چپ رہے۔

یکایک وہ ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئی اور آپ ہی آپ مسکرانے لگی' بولی "وہ موٹا (کا)میڈین بہت دلچسپ آدمی ہے۔ کیا نام ہے اس کا........ہاں' نانا۔"

"نانا نہیں' ننھا" ہم نے تصحیح کی "ہماری زبان میں نانا تو گرینڈ فادر کو کہتے ہیں۔"

"او ننھا؟"

"ننھا کا مطلب ہوتا ہے چھوٹا۔ عام طور پر چھوٹے بچوں کو ننھا کہتے ہیں لٹل بے (بی)۔"

وہ ہنسنے لگی "واقعی' وہ بالکل بے بی ہی لگتا ہے۔ بگ سائز بے بی۔ کیا وہ بہت اچھا (کا)میڈین ہے؟"

ہم نے کہا "وہ بہت مقبول ایکٹر ہے۔ بہت اچھا کامیڈین بھی ہے اور سیریس کردار (بھ)ی بہت اچھے کرتا ہے۔ دراصل وہ کیریکٹر ایکٹر ہے۔"

"وہ بہت باتونی ہے' اور اتنی تیزی سے باتیں کرتا ہے۔ ہماری پہلی ملاقات لفٹ (می)ں ہوئی تھی۔"

ہم نے پوچھا "کیا یہ تمام معلومات پہلی ملاقات میں ہی مل گئی تھیں؟"

کہنے لگی "نہیں' وہ تین ملاقاتوں میں۔"

ہمیں ننھا کی باتوں پر یقین آگیا۔ اس کے دوست ٹھیک ہی کہتے تھے کہ وہ بہت (فا)سٹ ورکر ہے۔ پردیس میں اتنے مختصر عرصے میں اتنا بہت سا کام اس بات کا ثبوت تھا۔

ہم نے پوچھا "تمہارا نام میرل ہے؟"

اس نے حیران ہو کر دیکھا "ہاں، مگر تمہیں کیسے پتا چلا۔"

ہم نے کہا "ننھے نے بتایا تھا۔"

وہ ہنسنے لگی، ہم نے پوچھا "تم یہاں اپنی فیملی کے ساتھ رہتی ہو؟"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی، کہنے لگی "نہیں، میں اکیلی رہتی ہوں۔ ایک جگہ جاب کرتی ہوں۔"

میرل کی روداد بھی ایک افسانے کی مانند تھی۔ اس کا باپ بیس بال کا کھلاڑی تھا۔ ماں ایک دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور بہت نخرے والی تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور بے حد حسین تھی۔ میرل کے باپ کی شہرت اور مقبولیت نے اسے متاثر کیا اور باپ کو اس کے حسن و جمال نے مسحور کر دیا۔ تھوڑے دن ان کی دوستی رہی، پھر شادی ہو گئی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ان کے گھر ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کی شکل و صورت معمولی تھی، اس لئے ماں کے دل کو نہیں لگی۔ اس نے اپنی بیٹی کو کبھی پیار سے گلے نہیں لگایا، بلکہ وہ اس سے کچھ بیزار ہی رہتی تھی مگر باپ اس کا دیوانہ تھا۔ ایک سال بعد میرل پیدا ہوئی اور اپنی خوب صورتی کے باعث ماں کی آنکھ کا تارا بن گی۔ بچپن ہی سے دونوں بہنیں ایک دوسرے کو سخت ناپسند کرتی تھیں اور بہت حاسد تھیں۔ باپ نے بڑی بیٹی کے ساتھ بیوی کی بے رخی دیکھی تو قدرتی طور پر اسے زیادہ چاہنے لگا۔ اس طرح چھوٹی بیٹی اور باپ کے درمیان بھی ایک فاصلہ پیدا ہو گیا۔

ماں اور باپ میں ہم آہنگی نہیں تھی اس لئے کچھ عرصے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ بڑی بیٹی باپ کے پاس چلی گئی اور چھوٹی ماں کے حصے میں آئی، مگر ماں نے بہت جلد دوسری دلچسپیاں تلاش کر لیں اور بیٹی کو تنہائی کا احساس شدید ہو گیا۔ باپ کے لئے اس کے دل میں پہلے ہی کوئی لگاوٹ نہیں تھی۔ اب ماں سے بھی بے گانہ ہو گئی۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے ایک ہم عمر لڑکے سے دوستی کی اور ایک بچے کی ماں بن گئی مگر ماں کو ذرا بھی تشویش نہ ہوئی۔ بچہ اس نے ایک یتیم خانے میں دے دیا اور دوست لڑکے سے چند ماہ بعد علیحدگی اختیار کر لی۔ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچی تو اپنی سالگرہ کے دن اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنا سامان سوٹ کیس میں بھرا اور گھر سے

رخصت ہو گئی۔ وہ دن اور آج کا دن، اس نے پھر دوبارہ پلٹ کر اپنی ماں کے گھر رخ نہیں کیا۔ نہ ہی اپنی بہن کی شکل دیکھی۔ یہاں تک کہ ان کے درمیان خط و کتابت اور ٹیلی فون کا رابطہ بھی نہیں ہوا۔ باپ سے ایک دوبار ٹیلی فون پر ملاقات ہوئی مگر اس سے زیادہ میل ملاپ نہیں ہو سکا۔ اب وہ اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں تنہا رہتی تھی۔ ایک دفتر میں سیکریٹری کے طور پر کام کر رہی تھی۔ اس وقت بھی اس کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

سیکریٹری کے طور پر کام کرنے کا سنا تو ہم نے حیران ہو کر پوچھا "اتنی کم عمری میں تم سیکریٹری کیسے بن گئیں؟ کیا تمہیں کافی دفتری تجربہ ہے؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی "دفتری تجربہ تو زیادہ نہیں ہے، مگر مجھے مرد ذات کا بہت تجربہ ہے۔ پندرہ سال کی عمر سے ان ہی لوگوں سے واسطہ پڑ رہا ہے۔ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر یہ کہ دفتر کا باس مجھ پر مہربان ہے۔ اس کی دوسری سیکریٹری تمام دفتری کام کرتی ہے۔ میں اس کے ذاتی کاموں میں مصروف رہتی ہوں۔ کافی بنا دیتی ہوں، ناشتا تیار کر دیتی ہوں اور بھی بہت سے ضروری کام کر دیتی ہوں" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔

"تمہارا باس شادی شدہ ہے یا کنوارا؟"

کہنے لگی "ہے تو شادی شدہ مگر بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ چند مہینوں کے بعد طلاق ہو جائے گی۔"

میں سوچ رہا تھا کہ طلاق کے بعد باس اس سے شادی کر لے گا۔ اس نے میرا ذہن پڑھ لیا، کہنے لگی "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم دونوں کی شادی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ شادی تو میں ایک اور شخص سے کروں گی۔ وہ بھی اپنی بیوی سے طلاق حاصل کرنے کا منتظر ہے۔" بہت خوب صورت، کیا اچھا تکون بنا ہے؟ کسی فلمی کہانی یا معاشرتی افسانے کے لئے بہت اچھا مواد ہے۔

"اچھا میرل، اگر برا نہ مانو تو ایک اور ذاتی سوال پوچھوں؟"

"پوچھو گے تو پتا چلے گا کہ سوال برا ماننے کا ہے یا نہیں۔"

"یہ بتاؤ تم نے اپنا بچہ ایک یتیم خانے کے حوالے کر دیا تھا۔ کیا اب تم جانتی ہو کہ وہ بچہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟"

سنجیدہ لہجے میں کہنے لگی "بالکل نہیں' اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ جب میں اس بچے کو پال نہیں سکتی' اپنے ساتھ رکھ نہیں سکتی' تو پھر تعلق رکھنے کا کیا فائدہ؟ میرا خیال ہے کہ کسی جوڑے نے اسے اڈاپٹ کر لیا ہو گا اور وہ آرام سے ہو گا۔"

ہم نے کہا "ہو سکتا ہے وہ یتیم خانے ہی میں ہو یا اسے تمہاری امداد کی ضرورت ہو؟"

شانے ہلا کر کہنے لگی "ہو سکتا ہے۔"

"تمہیں تنہائی نہیں محسوس ہوتی۔

"کیسی تنہائی؟ میری کافی مصروفیات ہیں' سوشل لائف ہے' ملنے والے ہیں' میرے سارے دوست مرد ہیں۔ میں عورتوں سے دوستی رکھنا پسند نہیں کرتی۔ کوئی فائدہ نہیں ہے نقصان البتہ ہو سکتا ہے۔"

"تمہارے دادا دادی' نانا نانی تو ہوں گے؟"

"نانا اور نانی کا تو کچھ پتا نہیں۔ ان کی تو میں نے کبھی شکل نہیں دیکھی۔ نہ ہی ممی نے کبھی ان کا تذکرہ کیا۔ دادا ابھی زندہ ہیں اور اسی اسٹیٹ میں رہتے ہیں۔"

"تم دادا کے پاس کیوں نہیں رہتیں؟ اکیلی کیوں رہتی ہو؟"

"دادا تو خود ہی بوڑھوں کے گھر میں رہتے ہیں اور پھر ان کے پاس رہ کر مجھے کیا فائدہ ہو گا؟"

اس وقت بلڈنگ سے ایک اور لڑکی سائیکل لے کر باہر نکلی اور فٹ پاتھ پر سائیکل سواری شروع کر دی۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ ضرور گیلین ہو گی۔ مگر گیلین اور میرل نے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ میرل تو پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ اسے لڑکیوں سے دوستی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ایک دم گھاس پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے کپڑے جھاڑے اور سائیکل اٹھا کر "اوکے' بائی" کہہ کر رخصت ہوئی۔ ہم یہ سوچتے رہ گئے۔ کہ اتنی بڑی بلڈنگ میں' اتنے بڑے شہر میں' اتنے بڑے ملک میں' بلکہ اتنی بڑی دنیا میں' وہ بالکل تن تنہا ہے۔ مگر اس کو ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ کتنی بہادر لڑکی ہے۔

ہم لوگ اپنی فلموں میں گانے اور ناچ دیکھ دیکھ کر اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اب بالکل عجیب نہیں لگتے مگر کوئی باہر والا جب ہمارے ناچ گانے دیکھتا ہے تو بہت حیران ہوتا ہے۔ بلکہ وہ لوگ ہماری فلموں کے رومانی مناظر دیکھ کر بھی حیران ہو جاتے ہیں۔ بھلا یہ کیا رومان ہوا کہ ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے سے کئی گز کے فاصلے پر بیٹھے ہیں اور چپ چاپ ایک دوسرے کو تک رہے ہیں' یا پھر اگر نزدیک بھی ہیں تو اس طرح سمٹ کر بیٹھے ہیں جیسے سامنے والے کے جسم میں کوئی بجلی کا کرنٹ دوڑ رہا ہے۔ اگر غلطی سے چھو بھی لیا تو جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ آؤٹ ڈور میں جو گانے فلمائے جاتے ہیں وہ اور بھی نرالے ہوتے ہیں۔ ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کو پکڑنے کے لئے دوڑتے رہتے ہیں۔ جب نزدیک پہنچتے ہیں تو پھر دور چلے جاتے ہیں اور پھر قریب جانے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں۔ ایک پارک میں شبنم پر گانا فلمایا جا رہا تھا' وہ بنی سنوری' خوب صورت لباس پہنے کھڑی تھیں۔ کیمرا اسٹارٹ ہوا تو انہوں نے گانے کے بول اٹھاتے ہوئے ایک طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ دوسرے شاٹ میں وہ کسی اور جانب رواں دواں نظر آئیں۔ ایک ٹورسٹ جوڑا بھی کچھ فاصلے پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جب ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تو انہوں نے واجد صاحب سے رجوع کیا جو ایک جانب کرسی پر نیم دراز تھے۔

"معاف کرنا' کیا آپ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہیں؟"

مرد نے پوچھا۔

"کن لوگوں کے ساتھ؟"

"یہی جو یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔"

"یہ ایک فلم یونٹ ہے جو پاکستان سے آیا ہے۔ آپ پاکستان ہو کر آئے ہیں۔"

"ہاں، میں ایک تعمیراتی فرم کے ساتھ تھا تو اس سلسلے میں کراچی گیا تھا۔"

"بس تو یہ فلم یونٹ اسی پاکستان سے آیا ہے، شوٹنگ کرنے کے لئے۔"

"تو پھر یہ شوٹنگ کیوں نہیں کرتے؟"

"کر تو رہے ہیں۔"

"یہ شوٹنگ ہو رہی ہے؟" دونوں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"اور کیا۔"

"مگر یہ لڑکی کیا کر رہی ہے؟"

"یہ لڑکی اس فلم کی ہیروئن ہے اور فلم کے ہیرو کے ساتھ گانا گا رہی ہے۔"

"ہیرو کے ساتھ؟" انہوں نے آنکھیں پھاڑ کر شبنم کو دیکھا "مگر یہ تو اکیلی ہے۔"

"وہ سامنے آپ کو ایک درخت کے نیچے ایک ہینڈ سم سا آدمی بیٹھا ہوا نظر آرہا ہے؟"

"ہاں۔"

"وہ اس فلم کا ہیرو ہے۔"

"تو پھر وہ اتنی دور کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ کیا ہیروئن سے ناراضگی ہے؟"

"ارے نہیں، وہ اپنی باری کا انتظار کر رہا ہے۔ دراصل ہیروئن اس کے لئے گا رہی ہے۔ جب ضرورت ہو گی ان دونوں کو یکجا کر دیا جائے گا۔ فی الحال ہیروئن کے سولو شاٹ فلمائے جا رہے ہیں۔"

ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ خاتون کہنے لگی "ہم ٹورسٹ ہیں۔ بس ایسے ہی گھوم رہے ہیں۔ کیا ہم یہاں بیٹھ کر شوٹنگ دیکھ سکتے ہیں؟"

"بڑے شوق سے۔"

وہ دونوں گھاس کے ایک تختے پر براجمان ہو گئے۔ مرد نے خاتون سے کہا "تم یہاں بیٹھو، میں کافی لے کر آتا ہوں۔"

واجد صاحب کے اندر سویا ہوا مشرقی میزبان بیدار ہو گیا، کہنے لگے "آپ بیٹھئے میں آپ کو یہیں کافی لا دیتا ہوں" وہ تیزی سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ شخص

بولا "یہ تو بہت اچھا پروگرام ہے۔ تفریح بھی مفت اور کافی بھی مفت۔"

واجد صاحب کافی کے دو کاغذ کے کپ لے کر ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر فلم کے بارے میں مختلف سوالات کرنے شروع کر دیئے۔ کچھ دیر بعد ندیم صاحب بھی گانے میں شریک ہو گئے۔ گانا بار بار بج رہا تھا۔

ہم نے پوچھا "آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟"

کہنے لگے "ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔ مگر ٹیون اچھی ہے۔ یہ کیا کہہ رہی ہے؟"

"اپنی محبت کا اظہار کر رہی ہے۔"

"کب تک کرتی رہے گی؟"

ہم نے کہا "اس گانے کی طوالت چار ساڑھے چار منٹ کی ہے۔"

"تو کیا ساڑھے چار منٹ تک یہ لوگ اسی طرح کرتے رہیں گے؟"

ان کی حیرت دیکھنے کے قابل تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ انگریزی زبان میں جو فلمیں بنتی ہیں وہ موضوعاتی ہوتی ہیں۔ زیادہ لمبی بھی نہیں ہوتیں۔ اگر جاسوسی فلم ہے تو محض جاسوسی ہے۔ اگر کوئی معاشرتی مسئلہ ہے تو بس اسی سے تعلق ہے۔ اگر میوزیکل ہے تو بات بے بات ہیرو اور ہیروئن گانا شروع کر دیتے ہیں اور مصروف رقص ہو جاتے ہیں۔ اگر کامیڈی ہے تو فلم میں کامیڈی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ مگر ہمارے ہاں معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ایک فلم میں دنیا کا ہر مسالہ ڈال دیا جاتا ہے۔ ڈراما بھی ہے، سراغ رسانی بھی ہے، ایکشن بھی ہے، ناچ اور گانے بھی ہیں، کامیڈی بھی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی فلم بین فلموں میں یہ سب چیزیں اکٹھی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں برصغیر کے فلم سازوں کے لئے ایک اچھی اور کامیاب کمرشل فلم بنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ انہیں ہر قسم کے ذوق کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور پھر قابلیت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ تمام چیزوں کا وزن برابر ہو۔ تب کہیں جا کر فلم ہٹ ہوتی ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کسی کھانے کی ہانڈی ہوتی ہے۔ پکانے والے کا کمال یہ ہوتا ہے کہ سارے مسالے اس میں موجود ہوں مگر ان کا توازن قائم رہے۔ اگر نمک زیادہ ہو جائے تو مزا خراب ہو جاتا ہے، مرچ زیادہ یا کم ہو جائے تو بھی ذائقے پر اثر پڑتا

ہے۔ اسی طرح تمام مسالوں کا توازن درست ہونا لازمی ہے ورنہ کھانے والا منہ بناتا رہ جاتا ہے۔ یہی معاملہ فلم سازوں کے ساتھ بھی ہے ہمارے ملک میں صحیح معنوں میں ایک اچھی اور کامیاب فلم وہ سمجھی جاتی ہے جس میں فارمولا بھی ہو اور جو پڑھے لکھے لوگوں کے ذوق پر بھی پوری اترے۔ اتنی بہت سی شرائط کے ہوتے ہوئے ایک اچھی اور کامیاب فلم بنانا کس قدر مشکل ہے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شبنم اور ندیم کا رومانی سین شروع ہوا اور بہت جلد ختم ہو گیا۔ ہماری فلموں میں محبت کا اظہار بھی گانوں اور مکالموں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہیرو' ہیروئن کے حسن کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیا کرتا تھا۔ پھر موسم کا تذکرہ درمیان میں آگیا۔ اس کے بعد سماج کی دیواریں زیر بحث آنے لگیں۔ پھر جب ترقی پسند لوگوں کا دور آیا تو انہوں نے اس میں امیری غریبی کا مسئلہ بھی شامل کر دیا لیکن اس قسم کے رومانی مناظر میں کوئی کہاں تک رنگینی اور جدت پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں انگریزی فلموں میں رومانی مناظر بہت مختصر ہوتے ہیں۔ زبان اور الفاظ تو یہ لوگ استعمال ہی نہیں کرتے۔ بہت زیادہ بولیں گے تو یہ کہ "آئی لو یو" اور جواب ملے گا "آئی لو یو ٹو۔" اس کے بعد ان کی گفتگو ختم ہو جاتی ہے اور ایکشن شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو یہ رومانی سین پہلے بھی سنسر شدہ دکھائے جاتے تھے اس لئے اور بھی مختصر نظر آتے تھے۔

ٹورنٹو میں ایک دن ایک پاکستانی بقراط صاحب دیسی فلموں پر بہت شدید نکتہ چینی کر رہے تھے۔ آخر میں کہنے لگے "ان لوگوں کی ذہنی مفلسی کا یہ عالم ہے کہ یہ رومانی سین تک نئے انداز میں نہیں دکھا سکتے۔ وہی سین آج بھی چلا آ رہا ہے جو ہمارے باپ دادا کے زمانے میں دکھایا جاتا ہے۔ یہ تو انگریزی فلموں سے بھی کچھ نہیں سیکھتے۔"

ہم نے عرض کیا "جان کی امان پائیں تو کچھ عرض کریں۔"

بولے "جی فرمائیں؟"

ہم نے کہا "آپ کا یہ الزام درست نہیں ہے کہ ہماری فلموں کے رومانی سین ایک ہی انداز کے ہوتے ہیں' حالانکہ مختلف فلموں میں مختلف قسم کے مناظر ہوتے ہیں اور انداز بھی مختلف ہوتا ہے۔ مگر آپ یہ فرمائیے کہ انگریزی فلموں کے رومانی سین دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔"

کہنے لگے "مگر آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ کس قدر نیچرل انداز ہے۔ ایک ہماری فلمیں ہیں۔ حقیقی زندگی میں کون اس طرح اظہار محبت کرتا ہے؟"

ہم نے کہا "نیچرل چیزوں کی نہ ہمارا سنسر اجازت دیتا ہے اور نہ معاشرہ۔ یہ تو سب فرضی کہانیاں اور فرضی ماحول ہوتا ہے۔ اگر آپ فرضی اور خیالی داستانیں سمجھ کر دیکھیں گے تو آپ بھی لطف اندوز ہوں گے۔"

جل کر کہنے لگے "بس' آپ لوگوں کو پریوں کی کہانیاں سناتے رہیے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔"

ہم نے کہا "آپ نے شاید غور نہیں فرمایا کہ ہم ہر معاملے میں ابھی تک پرانے دور میں رہ رہے ہیں۔ مثلاً ٹرانسپورٹ ہی کو دیکھ لیجئے۔ تانگہ' ریڑھا' گڈا' ہاتھ ریڑھی' آپ کو اب کس شہر میں نظر آتی ہے۔ ہمارے ملک میں آج بھی۔ یہ چیزیں اسی طرح رواں دواں ہیں جس طرح سالہا سال پہلے تھیں بلکہ بہت سے شہروں میں تو ٹرانسپورٹ کا کوئی اور نظام ہی موجود نہیں ہے۔ دراصل المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کی مجموعی ترقی کو تو دیکھتے نہیں ہیں' بس کسی ایک شعبے کو ہدف ملامت بنانا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ ہماری سوچ بدلی ہے' نہ ہم نے معاشرتی اور صنعتی طور پر دوسرے ملکوں کی طرح ترقی کی ہے۔ مگر ہر شعبے سے تعلق رکھنے والا دوسرے کو لعنت ملامت کرنے میں مصروف ہے۔ خود اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔"

ایک دن ہم ٹورنٹو سے انڈر گراؤنڈ ٹرین میں سوار ہو کر مارکھم پہنچے۔ انڈر گراؤنڈ ٹرینیں شہروں میں تو چلتی ہیں مگر نواحی علاقوں میں کاریں ہی استعمال ہوتی ہیں۔ بہت ہوا تو بس کا سہارا لے لیجئے۔ یہاں بس کا یہ معاملہ ہے کہ ایک ہی ٹکٹ کے ذریعے آپ انڈر گراؤنڈ اور بس دونوں میں سفر کر سکتے ہیں۔ ٹورنٹو میں ٹکٹ خریدنے اور چیک کرنے کا سسٹم آٹومیٹک ہے۔ یعنی نہ آدمی نہ آدم زاد۔ بس مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ ان میں سکے ڈالئے اور اپنا مطلوبہ ٹکٹ حاصل کر لیجئے۔ داخلے یا اخراج کے موقعے پر بھی کوئی چیکر نما انسان نظر نہیں آتا۔ ٹکٹ مشین میں ڈالیں گے تو دروازہ کھل جائے گا' ورنہ نہیں۔

ہم مارکھم کے اسٹیشن پر ٹرین سے باہر نکل کر بس اسٹیشن پر پہنچے۔ پتا چلا کہ ہماری بس ابھی ابھی رخصت ہوئی ہے۔ کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ یہاں بس کا انتظار زیادہ

طویل نہیں ہوتا اور پھر گردو پیش کا ماحول بھی خاصا نظر فریب ہوتا ہے' اس لئے بار خاطر نہیں ہوتا۔ ہم اور لبنیٰ دکانوں کی طرف چلے گئے۔ آئس کریم خریدی۔ پارو کے لئے چاکلیٹ اور ٹافیاں خریدیں اور پھر ایک جنگلے سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ ہم اس موضوع پر باتیں کرتے رہے کہ کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہمارے شہروں میں بھی انڈر گراؤنڈ ٹرینیں چلا کریں گی' آرام دہ اور خوب صورت بسیں ہوں گی' بس اسٹاپ اور ٹرینوں کے اسٹیشن خوب صورت' صاف ستھرے اور آراستہ ہوں گے۔ مسافر مہذب' منظم اور خوش لباس ہوں گے' جابجا شور و غل' گندگی اور بدنظمی نظر نہیں آئے گی' ٹرینیں اور بسیں وقت مقررہ پر چلا کریں گی اور.....اور.....

ڈرائیور ٹیکسی سے اتر کر ہماری جانب آیا اور بڑے صاف اور شستہ لہجے میں کہا "السلام علیکم آفاقی صاحب۔"

سلام کا جواب تو ہم نے دے دیا مگر حیران ہو کر رہ گئے کہ یہ کون شخص ہے جو ہمارا نام بھی جانتا ہے۔ آپ کی کچھ تصویریں بھی دیکھی ہیں۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے" ہم نے کہا "کیا آپ پاکستانی ہیں؟"

"بالکل جناب! بلکہ لاہور ہی کا ہوں۔ آپ کو میں نے اسٹوڈیو میں اور مال روڈ پر بھی دیکھا ہے۔ اب دو سال سے ٹورنٹو میں ہیں۔"

"اچھا!" ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ جواب میں کیا کہیں "یہاں آپ کیا کرتے ہیں؟"

کہنے لگا "بس جی ٹیکسی چلاتا ہوں اور پڑھتا ہوں۔ میں پڑھنے کے لئے ہی یہاں آیا تھا پھر گھر کے حالات خراب ہو گئے تو نوکری بھی کرنی پڑی۔ اب اپنا سارا خرچہ خود ہی اٹھاتا ہوں۔"

"یہ ٹیکسی آپ کی اپنی ہے؟" ہم نے سوال کیا۔

"ارے نہیں جی' یہ تو کمپنی کی ہے۔ یہ نام لکھا ہوا دیکھ رہے ہیں آپ؟ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ یہاں کب آئے؟" ہم نے بتایا تو بولا "کتنی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے پاکستان کے لوگ کینیڈا میں فلم بنانے کے لئے آئے ہیں۔ ندیم اور شبنم میرے فیورٹ اداکار ہیں۔ بہت شوق ہے مجھے ان سے ملنے کا۔ آپ انہیں میرا سلام کہئے

گا۔ ایک گمنام پرستار کا سلام۔"

"تم خود کیوں نہیں آجاتے ان سے ملنے کے لئے۔ میں تمہیں پتا بتا دیتا ہوں" یہ کہہ کر ہم نے اسے پتا بتایا اور پھر وہاں پہنچنے کا راستہ بھی نشانیوں سمیت سمجھا دیا۔

وہ بولا "اس طرح نہیں' آیئے ٹیکسی میں بیٹھئے' میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

"ارے نہیں بلاوجہ......"

"بلاوجہ کیوں؟"

"بس بڑے آرام سے پہنچا دیتی ہے۔"

"مگر اس وقت میں آپ کو بس میں نہیں جانے دوں گا۔ آیئے' بیٹھئے ٹیکسی میں۔"

ہم اس کے اصرار سے مجبور ہو کر ٹیکسی میں سوار ہو گئے مگر یہ افسوس تھا کہ بلاوجہ ٹیکسی کا کرایہ پڑ جائے گا پھر سوچا کہ چلو' اپنا پاکستانی بھائی ہے۔ طالب علم بھی ہے' اس کا کچھ بھلا ہو جائے گا۔ ٹیکسی میں بیٹھے تو اس کی زبان ٹیکسی کے میٹر سے بھی زیادہ تیزی سے چلنے لگی۔ کہنے لگا "دو سال کا کورس باقی رہ گیا ہے۔ بس اللہ پورا کرا دے۔ یہاں تعلیم حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ اتنی مہنگی پڑھائی ہے کہ اپنے ملک میں تو کالج اور یونیورسٹی کی پڑھائی اور اس کے مقابلے میں مفت ہی معلوم ہوتی ہے۔ اتنی محنت کرنی پڑتی ہے کہ پڑھنے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ سچ مچ پڑھنا پڑتا ہے' یہ نہیں کہ رٹا لگا کر پاس ہو جائیں۔"

ہم نے پوچھا "تمہارا یہاں دل لگ گیا ہے؟"

ہنسنے لگا "دل کا کیا ہے' ہر جگہ لگ جاتا ہے۔ پر مجھے تو دل لگانے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ کالج' گھر اور ٹیکسی۔ ان تین کے سوا چوتھی چیز کی شکل تک نظر نہیں آتی۔"

"تعلیم مکمل کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے؟ یہاں رہ جاؤ گے یا واپس جاؤ گے؟"

کہنے لگا "یہاں کیا کرنا ہے جی۔ وہاں میرے ماں باپ ہیں۔ بہن بھائی ہیں' رشتے دار اور دوست احباب ہیں۔ اپنے ملک کی کیا بات ہے۔ بندے کو روبوٹ بننا ہو تو یہاں چلا آئے۔"

ہم نے محسوس کیا کہ وہاں کی طرز زندگی سے کافی شاکی نظر آرہا تھا حالانکہ اس عمر میں نوجوانوں کو مغرب کے شہروں کی زندگی بہت زیادہ حسین اور پرکشش لگتی ہے۔ ان

ملکوں کی ہر چیز اور ہر ادا اچھی لگتی ہے۔ اپنے ملک کے مقابلے میں۔ نام اس نے مسعود یا مشہود احمد بتایا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں رہا' مگر اس نوجوانی کی عمر میں بھی اس کے دماغ میں ایک بوڑھی روح تھی۔ اس نے ٹورنٹو کی زندگی کا پوری طرح مزہ چکھا تھا۔ خوبیاں' برائیاں سب اس پر روز روشن کی طرح آشکارا تھیں۔

ہم نے پوچھا "ٹریفک پولیس تو تنگ نہیں کرتی؟"

"بہت تعاون کرتے ہیں سر ہماری پولیس میں اور ان کی پولیس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہاں تو لوگ پولیس والوں کو اپنا دوست سمجھتے ہیں اور وہ بھی لوگوں کو اپنا ہی سمجھتے ہیں۔ ہر طرح سے مدد کرتے ہیں۔ کسی جگہ پولیس کے سپاہی کو دیکھتے ہی یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب ہمارا محافظ آگیا ہے۔ کوئی زیادتی نہیں کر سکتا۔ ناجائز چالان' رشوت اور مک مکا کا تو نام و نشان تک نہیں ہے۔ کرسمس اور نیوائر کے موقع پر لوگ ٹریفک کے سپاہیوں کو بہت قیمتی تحائف دیتے ہیں۔ سپاہی جس جگہ کھڑا ہوتا ہے وہاں تحائف کے پیکٹوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ پولیس والے بھی اپنا فرض نبھاتے ہیں کسی ظلم یا زیادتی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن قانون شکنی پر کسی کا لحاظ نہیں کرتے' ورنہ اگر طرف داری کا واقعہ متعلقہ حکام کے نوٹس میں آجائے تو کسی کے ساتھ رعایت نہیں برتی جاتی۔

پولیس کے ساتھ ساتھ عورتوں اور بچوں کا رویہ بھی بہت اچھا اور قابل تعریف ہے۔

مسعود نے خود اپنا ایک واقعہ سنایا۔ شروع میں جب وہ ٹورنٹو پہنچا تو کالج آمد رفت کے لئے ایک کار کی ضرورت پیش آئی مسعود نے کئی کار شو روم دیکھے تھے جہاں بے شمار کاریں کھڑی نظر آئی تھیں۔ ان میں سے بعض کی قیمت بے حد کم ہوتی ہے۔ مسعود کو کار ڈیلر کی بیوی نے بذات خود کاریں دکھائیں اور ہر کار کی خوبیاں اور فوائد بیان کئے۔ مسعود نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدی اور کار ڈیلر نے پیسے وصول کرتے وقت یہ ضمانت بھی دی کہ یہ کار ایک سال تک کسی مرمت وغیرہ کے بغیر ہی چلے گی۔ مگر دوسرے ہی دن کار خراب ہو گئی۔ کار کی مرمت کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا' اس لئے شکایت پیش کرنے کے لئے ڈیلر کے پاس چلا گیا۔ وہاں اس کی خوب صورت اور انتہائی چالاک بیوی نے کار کا معائنہ کرنے کے بعد فیصلہ دیا کہ کار بالکل اے ون ہے۔ آپ کی غلطی سے اگر کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے تو یہ ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ یہ وہی عورت تھی جو ایک دن پہلے نتہائی خلوص اور محبت سے ملی تھی اور جس نے یقین دلایا تھا کہ یہ کار کم از کم ایک سال نک تو ہلے گی بھی نہیں۔ انجن' باڈی' سیٹیں سب ہی کچھ اے ون کنڈیشن میں ہے۔ مگر اج مطلب نکلنے کے بعد طوطے کی طرح آنکھیں پھیرے کھڑی تھی۔ مسعود نے اس کے ثوہر سے شکایت کی اور صورت حال بتائی۔ وہ بہت اطمینان سے سنتا رہا پھر بولا "دیکھئے سٹر مشینری کا اور انسان کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ کون جانے کس وقت اور کس جہ سے اچانک ختم ہو جائے۔"

مسعود نے کہا "مگر آپ نے تو ایک سال کی گارنٹی دی تھی۔"

بولا "گارنٹی تو آدمی کی زندگی کی بھی نہیں دی جا سکتی۔ ویسے بھی یہ سیکنڈ ہینڈ کار ہے۔ اگر آپ اسے احتیاط سے چلاتے تو خراب نہ ہوتی۔ بہرحال' میں اپنے انجینئر سے کہتا ہوں' وہ دیکھ لے گا کہ پرابلم کیا ہے؟"

میکینک نے کار کا انجن کھولا اور کچھ دیر بعد گاڑی اسٹارٹ ہو گئی' مسعود نے پوچھا "اب تو بند نہیں ہو گی؟"

جواب ملا "کون جانتا ہے؟ اور کون پروا کرتا ہے؟" مطلب یہ کہ اب تم دفع ہو جاؤ۔"

کار شاید میکینک کے ہاتھ کو پہچانتی تھی۔ خدا جانے اس نے کیا ترکیب کی تھی کہ وہ اسٹارٹ ہو کر چلنے لگی تھی۔ مگر جب اسی روز دوپہر کے وقت مسعود کالج سے واپس آرہا تھا تو کار نے ایک بارونق سڑک پر اچانک اسٹرائیک کر دی اور چند مبہم سی آوازیں نکالنے کے بعد خاموش ہو گئی۔ مسعود کی کوشش کے باوجود وہ دوبارہ حرکت میں نہ آسکی۔ جب ٹریفک میں خلل پڑنے لگا تو ایک ٹریفک کانسٹیبل بھی آگیا' پوچھا کیا معاملہ ہے؟ مسعود نے پرابلم بتائی۔ سپاہی نے گاڑی کا بونٹ کھلوایا۔ اندر جھانک کر دیکھا چند تار ہلائے اور گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ اس نے مسعود کو مشورہ دیا کہ تم یہ کار کسی میکینک کے پاس لے جاؤ۔ اس میں کچھ پرزے بدلے جائیں گے۔ اگر اسی طرح چلاتے رہو گے تو یہ دوبارہ کسی جگہ کھڑی ہو جائے گی۔ بلکہ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم اس کار سے چھٹکارا حاصل کر لو اور دوسری خرید لو کیونکہ تم کار کے انجن کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔

مسعود نے بتایا کہ یہ کار اس نے گزشتہ روز ہی ایک شو روم سے خریدی ہے اور

دکان کا مالک اس بارے میں کوئی ذمے داری قبول کرنے سے قاصر ہے۔ سپاہی نے چند لمحے غور کیا پھر مسعود کو مشورہ دیا کہ وہ جج کے پاس چلا جائے اور یہ ساری داستان اسے سنا دے۔

"جج کے پاس؟"

"ہاں' ہاں' میں تمہیں عدالت کا پتا بتا رہا ہوں" اس نے مسعود کو پتا لکھ کر دیا اور کہا "اب میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور بہت مصروف ہوں۔"

پولیس والے کے مشورے کے مطابق مسعود صاحب عدالت میں پہنچ گئے اور جج کے کمرے میں جا کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ چند مقدمات سے فارغ ہونے کے بعد جج نے مسعود کو دیکھا اور پاس آنے کا اشارہ کیا۔ یہ جج ایک ادھیڑ عمر خاتون تھیں مگر کافی بارعب۔

"ہاں مسئلہ بیان کرو؟" اس نے مسعود سے کہا۔

مسعود نے مختصر طور پر سارا واقعہ بیان کر دیا اور یہ بھی بتایا کہ میں ایک غریب طالب علم ہوں۔ بڑی مشکل سے پیسے جمع کر کے یہ پرانی کار خریدی تھی۔ جج نے یہ ساری داستان بڑی ہمدردی اور توجہ سے سنی پھر ایک سپاہی کو بلا کر اس سے کچھ کہا اور مسعود سے کہا کہ تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ سپاہی نے شوروم جا کر کار ڈیلر سے بات کی اور بتایا کہ مجھے فلاں جج نے بھیجا ہے۔

"کیا بات ہے؟ میں نے کون سا جرم کر دیا ہے؟"

پولیس والے نے بتایا کہ تم نے یہ مرمت طلب کار پرانے پرزوں کے ساتھ ایک غریب طالب علم کو فروخت کر دی ہے جو دھوکا بازی ہے۔ اب تم اسے واپس لو یا اسے کوئی دوسری کار اس کے بدلے میں دو۔

"دیکھو مسٹر! میں مجرم نہیں ہوں۔ معزز شہری ہوں' ٹیکس ادا کرتا ہوں۔ میری کمیونٹی میں عزت ہے۔ کاروباری آدمی ہوں۔ میں ان باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ کاریں بیچنا میرا بزنس ہے۔ اس شخص نے دیکھ بھال کر اپنی پسند سے یہ کار خریدی ہے۔ مہربانی فرما کر یہاں سے چلے جاؤ اور اس شخص کو بھی

اپنے ہمراہ لے جاؤ' ورنہ میں ابھی فون کر کے اپنے وکیل کو بلاتا ہوں۔"

سپاہی خاموشی سے اس کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا رہا پھر اس نے کہا "مجھے جج نے جو کچھ کہا تھا وہ میں نے تم تک پہنچا دیا۔ انہوں نے مجھے تمہارے لئے ایک اور پیغام بھی دیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ تمہارے بزنس کا انداز قابل اعتراض ہے۔ اگر اس نوجوان نے تمہارے خلاف باقاعدہ شکایت درج کرائی اور یہ ثابت ہو گیا کہ تم نے جان بوجھ کر ایک خراب کار اس طالب علم کو فروخت کی ہے تو بہت مشکل میں پھنس جاؤ گے اور پھر تم جانتے ہو کہ پولیس تمہارے شوروم میں موجود دوسری کاروں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرے گی۔

وہ کچھ پریشان تو ہوا مگر رعب سے بولا "کس قانون کے تحت؟"

"یہ تو تم اپنے وکیل سے پوچھنا' وہ تمہیں بتا دے گا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم جج کے حکم کی تعمیل کر رہے ہو یا نہیں؟"

کار ڈیلر کچھ دیر تو اسے گھورتا رہا' پھر کچھ اور بولا "ٹھیک ہے' ایک غریب طالب علم سمجھ کر میں اس لڑکے کی مدد کر دیتا ہوں۔"

سپاہی مسکرایا اور بولا "تمہاری نیک دلی کا شکریہ۔ مگر جج کا دوسرا مشورہ بھی یاد رکھنا ایک ہفتے کے اندر اپنے شوروم کی تمام کاریں ٹھیک کرا لو ورنہ کسی بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ بائی" کہہ کر پولیس والا تو رخصت ہو گیا مگر شوروم کا مالک سوچ میں پڑ گیا۔

مسعود نے پوچھا "میرے لئے کیا حکم ہے؟"

ڈیلر نے دانت پیس کر جواب دیا "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' میں تو تمہیں کار فروخت کر کے پچھتا رہا ہوں۔ آ جاتے ہیں کار خریدنے۔ جیب میں پیسے نہیں ہوتے اور اچھی کار خریدنے کی خواہش ہے" پھر اس نے میکینک کو بلا کر کہا "دیکھو' اس سے کار لے لو اور جو کار یہ پسند کرے چیک کرنے کے بعد اسے دے دو۔"

"مگر میں زیادہ پیسے نہیں دے سکوں گا" مسعود نے کہا۔

"ارے پیسے تم سے کون مانگ رہا ہے؟ ہم تمہیں اسی قیمت کی کار دیں گے" پھر اس نے میکینک سے کہا "اور دیکھو' اس مصیبت کو دوبارہ ہمارے شو روم میں آنے کی ضرورت نہ پڑے۔"

اس طرح مسعود کو ایک اچھی کار مل گئی۔ یہ کہانی سنانے کے بعد اس نے کہا "آپ ذرا یہ سوچئے کہ اگر یہی واقعہ میرے ساتھ پاکستان میں پیش آیا ہوتا تو پولیس عدالت اور ڈیلر کا رویہ کیا ہوتا؟" سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس قسم کے بے شمار واقعات ہم نے دیکھے تھے۔ ان میں سے بہت سے خود ہمارے ساتھ بیتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم اپنے ملک میں اس قسم کے انصاف اور داد رسی کا تصور بھی نہیں کر سکتے' حالانکہ ہروقت اسلام کے عدل اور انصاف کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ اب تو یہ باتیں سننے والوں کو ناگوار گزرنے لگی ہیں۔

ایک روز ٹیلی ویژن پر "اسلامی عدل و انصاف" سے متعلق ایک پروگرام میں تین حضرات تشریف فرما تھے۔ ان میں سے دو ہائیکورٹ کے جج تھے۔ ماشاء اللہ باریش اور نورانی چہروں کے مالک تھے۔ انہوں نے خلافت راشدہ کے زمانے کے واقعات سنائے کہ اس زمانے میں انصاف کیسے کیا جاتا تھا اور قانون کی نگاہ میں ہر شخص واقعی برابر تھا چاہے وہ خود خلیفہ وقت ہی کیوں نہ ہو۔ ایک نو عمر لڑکا بھی برابر میں بیٹھا ہوا یہ پروگرام سن رہا تھا۔ کہنے لگا "انکل' میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ ٹی وی پر ایسے ہی پروگرام سن رہا ہوں اور اخباروں میں بھی پڑھتا ہوں۔ پرانے خلیفاؤں کے زمانے کے چند واقعات ہیں جو یہ لوگ بار بار سناتے رہتے ہیں اور اب وہ مجھے زبانی یاد ہو گئے ہیں۔ مگر اس پروگرام کا مطلب کیا ہے؟ جب یہ لوگ آج ایسا انصاف نہیں دے سکتے تو پھر اس کو سنانے کا فائدہ؟"

شاید ایسے پروگرام پیش کرنے کا مقصد آج کی نسل کو یہ بتانا ہے کہ دیکھو' ہم لوگ کتنی بلندی سے کس قدر پستی میں پہنچ گئے ہیں۔ مگر جو لوگ اس قسم کے پروگرام پیش کرتے ہیں کیا وہ یہ نہیں سوچتے کہ ایسے پروگراموں سے موجودہ نظام کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ لوگ جب یہ سنتے اور دیکھتے ہیں کہ انہیں یہ سب کچھ ملنا چاہئے تھا مگر اب مل کیا رہا ہے' تو وہ آج کے نظام پر نفرین کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے

ہیں؟

مسعود نے ہمیں اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے پہنچا دیا۔ کرایہ دریافت کیا تو اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا اور کہا "آپ لوگ ٹورنٹو میں ہمارے مہمان ہیں۔ بھلا مہمانوں سے بھی کوئی کرایہ وصول کرتا ہے؟"

ہم نے چائے کافی کی دعوت دی اور یہ لالچ بھی دیا کہ ندیم اور شبنم سے ملاقات کرا دیں گے۔ وہ بے بسی سے مسکرایا اور بولا "میں پہلے ہی کافی وقت لے چکا ہوں۔ اب بالکل گنجائش نہیں ہے۔ مگر آپ میری طرف سے انہیں بہت بہت سلام پہنچا دیجئے گا۔" بے لوث' خلوص اور محبت کے اس مظاہرے نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ رخصت ہوتے ہوئے اس نے پوچھا "کیا آپ سگریٹ پیتے ہیں؟"

ہم نے انکار میں جواب دیا اس نے اپنی ٹیکسی کے سامنے والے حصے میں چسپاں ایک خوب صورت سگریٹ کیس وہاں سے نکال کر ہمیں پیش کیا اور کہا کہ یہ آپ اپنی گاڑی میں لگا لیجئے۔

ہم نے کہا "مگر ہم تو سگریٹ نہیں پیتے؟"

کہنے لگا "سگریٹ تو میں بھی نہیں پیتا۔ بس ڈیکوریشن کی چیز ہے۔ اسے دیکھ کر آپ کو میری یاد آجایا کرے گی۔" پھر وہ خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔ سفر کے دوران بھی کیسے کیسے لوگ ملتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے یاد رہ جاتے ہیں۔

شام کو پتا چلا کہ اگلے روز سینٹرل آئی لینڈ میں کچھ مناظر کی شوٹنگ ہے۔ سینٹرل آئی لینڈ ایک تفریح گاہ ہے جو مستقل طور پر تمام سال ہر عمر اور ہر مزاج کے لوگوں کو تفریح فراہم کرتی ہے۔ بچوں کے لئے کھیل تماشے ہیں‘ گھوڑوں کی سواری کا بندوبست ہے۔ فضا میں ہینگنگ چیئرز ہیں۔ دکانیں ہیں اور جہاں کھانے پینے کی تمام چیزیں مل جاتی ہیں۔ طرح طرح کے کھیل تماشے ہیں۔ بڑی عمر والوں کے لئے بھی خاصا اہتمام ہے‘ یہاں تک کہ جھیل کے کنارے بہت سے لوگ مچھلی پکڑنے کے لئے پانی میں ڈوریں ڈالے بیٹھے یا لیٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مچھلی پکڑنا بھی عجیب ہی مشغلہ ہے۔ غالباً یہ دنیا کا واحد کھیل ہے جس میں کھیلنے والا اس کے علاوہ دوسری چیزوں پر بھی اپنی توجہ مرکوز کر سکتا ہے۔ مثلاً پانی میں ڈور ڈال دی اور بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ کتاب پڑھ رہے ہیں‘ تصویریں بنا رہے ہیں۔ موسیقی سے شوق فرما رہے ہیں اور کچھ نہیں تو بیٹھے اونگھ رہے ہیں یا پھر سر کو ہیٹ سے ڈھانپے سوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر ڈور حرکت کرتی محسوس ہوئی تو اس طرف بھی توجہ دے دی۔ کھینچ کر نکالا اگر مچھلی ہوئی تو ہک سے نکال کر ٹوکری میں ڈال لی ورنہ دوبارہ ڈور پانی میں پھینک کر بیٹھ گئے۔ غالب نے یہ شعر غالباً مچھلی پکڑنے والوں کے لئے کہا ہے کہ بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے مچھلی پکڑنے سے زیادہ بہتر موقع نصیب نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک قابل ذکر بات اور بھی ہے وہ یہ کہ مچھلی پکڑنے کا مشغلہ عموماً بلکہ ہمیشہ مرد ہی اختیار کرتے ہیں۔ کم از کم ہم نے کسی خاتون کو مچھلیاں پکڑتے ہوئے نہیں دیکھا مگر سینٹرل آئی لینڈ میں ایک بار یہ ریکارڈ بھی ٹوٹ گیا جب جھیل کنارے ہم نے ایک درمیانہ عمر کی خاتون کو زمین پر کپڑا بچھائے‘ پانی میں ڈور ڈالے‘ سوئٹر بننے میں مصروف پایا۔ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ہی ایسا منظر

پھر ہمیں کہیں دیکھنے کو نہیں ملا۔

مغربی ملکوں میں اس قسم کی تفریح گاہیں قریب قریب ہر شہر میں ہوتی ہیں۔ ڈزنی لینڈ تو ہر شہر میں نہیں قائم ہو سکتا مگر مختلف دلچسپیوں اور تفریحات کے حامل ایسے مقامات ہم نے ہر جگہ دیکھے جو مستقل طور پر تمام سال ہر عمر کے لوگوں کو تفریح فراہم کرتے رہتے ہیں۔ ٹورنٹو میں بھی سینٹرل آئی لینڈ اور نمائش گاہ کے علاوہ نمائش گاہ کے سامنے ایک احاطہ ہر قسم کی دلچسپیوں کے لئے وقف ہے۔ یہاں بحری جہاز بھی ہیں۔ کشتیوں میں بھی سواری کی جاتی ہے۔ اور ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو جب آپس میں ٹکرایا جاتا ہے تو بہت لطف آتا ہے مگر یہ کبھی نہیں الٹتیں۔ اس کھیل میں بچے‘ بوڑھے‘ جوان‘ مرد عورت سب ہی حصہ لیتے ہیں۔

زندہ دلی کا یہ مظاہرہ مغربی ملکوں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر قسم کے کھیلوں میں ہر عمر کے لوگ شریک ہو جاتے ہیں۔ اسی جگہ بہت بڑا سینما ہال بھی ہے جس میں ہم نے زندگی میں پہلی بار ایسا سکرین دیکھا جو ہال کے تین حصوں پر پھیلا ہوا تھا اور یہاں فلم دیکھو تو یوں لگتا تھا جیسے ہم خود بھی اس فلم کا ایک حصہ ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ یہاں تو سیدھے سادے پارک دیکھنے کو نہیں ملتے۔ تفریح گاہوں کا کیا سوال ہے‘ حالانکہ دیکھا جائے تو مغرب والوں کے مقابلے میں ہمارے لوگوں کو تفریح کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ وہ چوبیس گھنٹے مصائب اور مسائل ہی میں گھرے رہتے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے غم دوراں سے نجات مل جائے تو ان کے لئے یہ نعمت سے کم نہ ہو گا۔ مگر شاید ہم لوگ ذہنی اور جسمانی تفریح کے قائل ہی نہیں ہیں۔

ہم شبنم کے اپارٹمنٹ پر گئے تو وہ مچھلی بنانے میں مصروف تھیں۔ شبنم کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک خوبی ہم نے یہ بھی دیکھی کہ جب انہوں نے لاہور میں رہائش اختیار کی تو ہر لحاظ سے "لاہور والی" بن گئیں۔ لباس میں ساری سے زیادہ شلوار قمیص استعمال کرنے لگیں اور تو اور کھانوں میں بھی انہوں نے لاہور والوں کا انداز اپنا لئے۔ بنگالیوں کا من بھاتا کھاجا "دال بھات" ہوتا ہے۔ یعنی سادہ چاول اور مچھلی یہ ان کے لئے دنیا جہان کی نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ پھر مچھلی بھی وہ اپنے مخصوص انداز میں تیل میں

پکاتے ہیں جو ہم لوگوں کو زیادہ پسند نہیں آتی۔ مگر شبنم کے گھر میں جب بھی کھانا کھایا میز پر وہی کھانے نظر آئے جو ہم لوگوں کے پسندیدہ ہیں۔ کبھی کبھی وہ مچھلی چاول بھی پکوا لیتی تھیں۔ یا پھر شاید کسی اور وقت آنے جانے والوں کی نظروں سے چھپ کر بنگالی کھانے کھا لیتی ہوں گی۔ جب وہ ڈھاکہ سے آئی تھیں تو اردو پڑھنا تو درکنار وہ اردو سمجھتی بھی نہیں تھیں۔ مگر چند سال کے اندر انہوں نے اردو پڑھنا بھی سیکھ لیا صحیح تلفظ اور روانی سے اردو بولنا انہیں نہیں آیا مگر فلموں کی حد تک انہوں نے اپنا تلفظ بالکل درست کر لیا تھا حالانکہ بعض لکھنے والے انہیں بہت موٹے موٹے، مشکل اور ثقیل الفاظ بھی لکھ کر دے دیا کرتے تھے۔

شبنم اس وقت فرائیڈ فش بنانے میں مصروف تھیں۔ روبن گھوش کسی میگزین کا مطالعہ کر رہے تھے۔ لاہور میں ان لوگوں کے گھر مہمانوں کے لئے ہر وقت کھانا تیار رہتا ہے۔ اگر دس بارہ آدمی بھی آ گئے تو کھانا موجود ہو گا، اور پھر مختلف قسم کا۔ ہم نے اسی لئے ان کے گھر کا نام "شبنم روبن ہوٹل" رکھ دیا تھا۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے مچھلی کی دعوت دی مگر ہم پہلے ہی کھانا کھا چکے تھے۔ لہٰذا کافی کا دور چلا۔ روبن نے فریج میں سے آئس کریم بھی نکال کر دی۔

"آج آپ کیسے راستہ بھول گئے؟" شبنم بولیں۔

"راستہ بھولے نہیں، ایک ضروری بات کرنے کے لئے آئے ہیں۔ آپ کو پتا ہے نا کل سینٹرل آئی لینڈ پر شوٹنگ ہے۔"

"پتا ہے"

"مگر یہ پتا نہیں ہے کہ کیا شوٹنگ ہو گی؟"

"شوٹنگ وہی ہوں گے جو اسکرپٹ میں لکھے ہیں؟"

انہوں نے اپنی بہترین اردو میں کہا۔

"وہ نہیں ہوں گے۔ کچھ اور شوٹنگ ہوں گے۔ دراصل پرویز صاحب نے ان سینوں میں تھوڑی تبدیلی کر دی ہے۔ اب کچھ انڈر واٹر سین بھی ڈال دئے ہیں۔"

"انڈر واٹر؟ وہ کون کریں گے؟ ندیم؟"

"نہیں وہ آپ کریں گے۔ انہوں نے آپ کے لئے غوطہ خوروں والا لباس بھی

منگوا لیا ہے۔"

"غوطہ خوروں والا لباس بھی منگوا لیا ہے؟ اوہ! اب کیا ہو گا؟ وہ پریشان ہو گئیں۔

"پریشانی کی کیا بات ہے؟ بھئی ساری دنیا میں انڈر واٹر فلمیں بنتی ہیں۔ آپ کو کشتی سے جھیل کے پانی میں پھینک دیں گے۔"

"اکیلے؟"

"نہیں، آپ کے ساتھ آکسیجن سلنڈر بھی ہوں گے۔"

وہ تو سچ مچ پریشان ہو گئیں "یہ تو بہت زیادتی کئے ہیں پرویز صاحب۔ پہلے سے بتائے بھی نہیں اور ایسا چینج کر دئے۔ روبن، یہ کیسے ہوں گے؟"

اتنی دیر میں روبن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ محض گپ ہے۔ مگر اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا "ہم کیا بول سکتا ہے؟ یہ ڈائریکٹر، رائٹر اور آرٹسٹ کا بات ہے۔ جو سین وہ بولے گا آرٹسٹ کو کرنا پڑے گا۔"

انہوں نے احتجاج کیا "مگر آرٹسٹ کو بھی تیاری کرنی پڑتے ہیں۔ موڈ بنانے پڑتے ہیں۔"

ہم نے کہا "دیکھئے پردھان، اصلی آرٹسٹ وہ ہے جو فوراً اپنے آپ کو کیریکٹر میں ڈھال لے۔ موڈ تو ایک منٹ میں بن جاتا ہے۔ یہ کوئی برگر تو نہیں ہے جسے بنانے میں دیر لگے۔"

"ہم نے تو اس کا ریہرسل بھی نہیں کیا۔"

"کوئی حرج نہیں ہے۔ شوٹنگ سے پہلے ہم آپ کو ریہرسل بھی کرا لیں گے۔ آپ کو غوطہ خوروں والا لباس پہنا کر پانی میں ڈال دیں گے۔ ویسے تیرنا تو آپ کو آتا ہو گا۔ بنگال میں تو ہر ایک کو تیرنا آتا ہے۔"

"مگر ہم کو پریکٹس نہیں ہے۔ ہم تو بچپن میں تیرا کرتے تھے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو تیرنا آتا ہے۔ جب آپ کو پانی میں پھینکیں گے تو تھوڑے بہت ہاتھ پیر مارنے کے بعد آپ کو تیرنا بھی یاد آ جائے گا۔ فکر نہ کریں، ہم آپ کو ڈوبنے نہیں دیں گے۔ ابھی تو فلم کی بہت شوٹنگ باقی ہے۔ آپ کا ڈپلیکیٹ کہاں ڈھونڈیں گے؟"

شبنم مسکرانے لگیں، بولیں آفاقی صاحب، پتا چل گیا۔ آپ جو بولتے ہیں وہ مذاق میں بولتے ہیں۔ ہم کو پتا ہے کہ پرویز صاحب ایسا نہیں کریں گے" لیجئے ساری اسکیم فیل ہو کر رہ گئی۔ ہمارا تو خیال تھا کہ وہ پرویز صاحب کے پاس جا کر پروٹیسٹ کریں گی مگر پہلے ہی راز فاش ہو گیا۔

چند دن میں شوٹنگ کا شیڈول ختم ہو گیا۔ جو ان ڈور کام باقی رہ گیا تھا اس کے بارے میں سب کا یہی خیال تھا کہ لاہور میں سیٹ لگا کر مکمل کرا لیں گے۔ دراصل لاہور والوں کو اپنے شہر سے باہر رہتے ہوئے کافی دن گزر گئے تھے، اس لئے اب وہ جلد سے جلد واپس جانا چاہتے تھے۔ ٹورنٹو اور کینیڈا کی خوب صورتی اپنی جگہ مگر لاہور پھر لاہور ہے۔ سب کو اپنا گھر یاد آ رہا تھا۔ اور وہ ہر روز پرویز صاحب سے واپسی کا تقاضا کر رہے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب سکندر اعظم کے سپاہیوں کو گھروں سے نکلے ہوئے کئی سال گزر گئے تو ان کا فتوحات اور دولت سے بھی دل بھر گیا اور انہوں نے گھر واپس جانے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ بغاوت جیسی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہاں بغاوت کی کیفیت تو نہیں تھی مگر ہر کوئی گھر واپس جانے کا اصرار کر رہا تھا۔ چنانچہ واپسی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کی خوشی میں جشن منایا گیا۔ سب نے اکٹھے مل کر کھانا کھایا۔ شوٹنگ کے دوران ہونے والے لطیفے بیان کئے گئے اور پھر اگلے دن سے واپسی کی تیاریاں اور شاپنگ شروع ہو گئی۔ جسے دیکھئے بازار جاتا اور لدا پھندا واپس آجاتا۔ شبنم تو خیر شاپنگ کے معاملے میں ایکسپرٹ ہیں۔ ہر اسٹور کا کونا کھدرا تک دیکھ ڈالتی ہیں اور اپنے مطلب کی چیزوں کی فہرست بنا لیتی ہیں۔ پھر ایک دو دن میں خریداری کر لیتی ہیں۔ ہر ایک کا یہی بیان تھا کہ میں نے تو کچھ بھی نہیں خریدا مگر ہر ایک کے سوٹ کیسوں اور بیگوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

اپارٹمنٹ بلڈنگ کے منیجر مسٹر کلنٹ ہم لوگوں کی واپسی کی خبر سے کافی اداس ہو گئے تھے اور اداسی دور کرنے کے لئے ایک دن انہوں نے اپنے اپارٹمنٹ میں شاہ جی کو مدعو کیا۔ اس وقت تک مسٹر کلنٹ کو بھی شاہ جی کی فوٹو گرافی کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ لیبارٹری والے بھی جو پہلے پہلے شاہ جی کو "یوں ہی" سمجھے تھے، رش پرنٹ دیکھنے کے بعد ان کے قائل ہو گئے تھے انہیں سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ میٹر کے بغیر

اتنی اچھی فوٹو گرافی کیسے کر لیتے ہیں۔

ہمارے دوستوں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ شوٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد ہم کچھ عرصے ان کے پاس بھی مہمان رہیں گے مگر یہ پروگرام اچانک واپسی کی وجہ سے اپ سیٹ ہو گیا۔ ادھر امریکہ میں ہمارے چند دوستوں کو اطلاع مل چکی تھی اور انہوں نے وعدہ لیا تھا کہ واپسی پر ہم امریکہ ہوتے ہوئے پاکستان جائیں گے۔ مگر ہمیں بتایا گیا کہ جس ویزا پر ہم لوگ کینیڈا گئے تھے اس میں توسیع نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ہم کینیڈا سے امریکہ جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں پاکستان واپس جا کر نیا ویزا لینا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ہمارا امریکہ جانے کا پروگرام منسوخ ہو گیا۔ امریکہ والوں نے اس پر بہت احتجاج کیا۔ شکوے کئے، برا بھلا کہا، یہاں تک کہ اقبال شہزاد جو ورجینیا میں ہمارے منتظر تھے، اتنے ناراض ہوئے کہ فون کر کے ہمیں پنجابی میں نہایت عمدہ قسم کی گالیاں بھی دیں اور پھر کہا کہ اب ٹیلی فون لبنی بھابی کو دے دو۔

ہم نے پوچھا "وہ کس لئے؟"

بولے "منہ کا مزا بدلنے کے لئے ان سے کچھ شریفانہ باتیں کروں گا۔"

ہم نے کہا "میر صاحب، آپ نے سردار جی والا لطیفہ بالکل الٹا دیا ہے۔"

پوچھنے لگے "کون سا لطیفہ، کوئی پرانا دیمک زدہ ہو گا۔ جلدی سے سناؤ۔"

ہم نے انہیں لطیفہ سنایا کہ ایک سردار جی لندن گئے۔ وہاں ان کی کار کی ایک انگریز کی کار سے ٹکر ہو گئی۔ غلطی انگریز کی تھی انہوں نے کار سے باہر نکل کر انگریزی میں برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور آخر میں وہ حیران ان کا منہ تکتا رہ گیا "مور اوور" کہنے کے بعد پنجابی میں خوب موٹی موٹی گالیاں بھی عرض کر دیں۔ ایک دوست نے پوچھا "سردار جی، انگریزی میں اتنی بہت سی گالیاں دینے کے بعد یہ "مور اوور" اور پنجابی گالیوں کی کیا ضرورت تھی؟" بولے "یار، دل ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ یہ انگریزی گالیاں تو بس ایویں ہی ہیں۔ جب تک پنجابی میں گالیاں نہ دو چین نہیں آتا۔ دل ٹھنڈا نہیں ہوتا۔"

اقبال شہزاد یہ لطیفہ سن کر خوب ہنسے اور بہت دیر تک ہنستے رہے، کہنے لگے "بہت چالاک ہو، جی خوش کر دیا۔ سارا غصہ ہی اتار دیا۔"

ہم نے کہا "مگر آپ نے پہلے پنجابی میں گالیاں دیں بعد میں مہذب ہو گئے۔ یہ تو

کوئی بات نہ ہوئی۔ یاد رکھئے آئندہ سردار جی والے اصول پر عمل کرنا۔"

اقبال شہزاد اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ وہ امریکہ میں رہنے لگے تھے مگر تقریباً ہر سال پاکستان آتے تھے اور ملاقات ضرور کرتے تھے۔ جب وہ ملنے آتے تو دور ہی سے پہلے ان کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ وہ گھنٹی بجا کر نوکر کو بلاتے اور کہتے "جاؤ، صاحب کو بولو کہ تمہارا افسر آیا ہے۔" حالانکہ اس پیغام کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ ان کی آمد کی خبران کے قہقہے ہمیں پہلے ہی پہنچا دیا کرتے تھے۔ بہت خوش مزاج اور زندہ دل آدمی تھے۔ کراچی میں ایسٹرن اسٹوڈیوز میں ساؤنڈ انجینئر تھے۔ جب انہوں نے ہندوستان سے آئی ہوئی مشہور ہیروئن ریحانہ سے شادی کر لی تھی۔ مگر یہ شادی زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ طلاق کے بعد شہزاد نے ایک گھریلو خاتون سے شادی کر لی جو کسی کالج میں لیکچرار تھیں۔ بعد میں ساری زندگی ان ہی کی ساتھ گزار دی۔ اب وہ بھی امریکہ میں ہیں۔ ریحانہ نے بھی چند سال بعد دوسری شادی کر لی تھی وہ کراچی میں مقیم ہیں۔ حال ہی میں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔

امریکہ جانے کا پروگرام کینسل ہو گیا تھا۔ ٹورنٹو میں کافی دن رہ گئے تھے' اس لئے ہم نے بھی واپسی کے لئے سیٹیں بک کرانے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ بہت رش کا زمانہ تھا۔ ٹورنٹو سے سیٹ ملنی دشوار تھی اور ہماری خواہش تھی کہ واپسی میں چند روز لندن میں بھی قیام کریں۔ پانچ چھ روز کی جدوجہد کے بعد ایک پاکستانی ٹریول ایجنٹ نے ہمیں ٹورنٹو سے لندن اور لندن سے کراچی کی سیٹیں دلا دیں۔ جب ہم نے یہ خبر اپنے کینیڈین دوستوں کو سنائی تو وہ بہت ناراض اور مایوس ہوئے۔ واجد صاحب اور شعیب کا اصرار تھا کہ ابھی تو ہمیں ایک بار نیاگرا آبشار بھی جانا ہے۔ ہم نے کہا بھائی' کتنی بار نیاگرا جائیں۔ ہمیں وہاں کا چپہ چپہ اور بوند بوند زبانی یاد ہو گئی ہے۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ چاندنی رات میں نیاگرا کا منظر ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ آپ رک جائیں۔ رات کو کھانا اور اس کے بعد نیاگرا کی سیر ہو گی۔ مگر ہم نے معذرت کر لی۔

جاوید چودھری صاحب کو موسیقی اور گلوکاری کا شوق ہے۔ پہلی بار جب ہم ان کے پاس اوٹاوہ گئے تھے تو وہ ہر رات ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے اور خوب گانے سناتے۔ اس کے بعد لطیفوں کا دور شروع ہوتا جو صبح تک جاری رہتا۔ اس بار فلم کی مصروفیات

کے باعث ایسا کوئی پروگرام نہیں بن سکا تھا مگر ہم انہیں تسلی دیتے رہتے تھے کہ شوٹنگ کے بعد وہ محفلیں سجائی جائیں گی۔ وہ تو اپنے ہارمونیم کی صفائی کر رہے تھے کہ ہم نے واپسی کی خبر سنا دی۔ بے حد ناراض ہوئے واسطے دئے' منتیں کیں' اپیلیں کیں' دھمکیاں دیں مگر بے سود ہمارا جانا ٹھہر گیا تھا۔ بے چارے صبر کر کے چپ ہو گئے۔

دوسرے دوستوں کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ پرویز صاحب ہم سے پہلے روانہ ہو گئے تھے۔ دوسرے لوگ بھی چل دئے تھے۔ اب ہم اور ہمارا مختصر سا خاندان ٹورنٹو میں باقی رہ گیا تھا۔ اپارٹمنٹ کا کرایہ ابھی باقی تھا' اس لئے ہم وہیں مقیم تھے مگر واجد صاحب کا اصرار تھا کہ چند روز ہمارے گھر چل کر رہیں۔ چنانچہ ہم اپارٹمنٹ سے ان کے ٹاؤن ہاؤس میں منتقل ہو گئے۔ ایک دو دن خوب جشن رہا۔ محفلیں' مجلس آرائیاں' فلمیں' سیر و تفریح اور ظاہر ہے کہ دعوتیں' جاوید چودھری بدستور اپارٹمنٹ میں مقیم تھے۔ اور پروڈکشن کے حساب کتاب میں مصروف تھے۔

جس شام ہمیں ٹورنٹو سے روانہ ہونا تھا واجد صاحب ہمیں الوداعی ملاقات کے لئے جاوید صاحب کے پاس لے کر گئے۔ راستے میں یکایک ہماری طبیعت خراب ہو گئی۔ سانس رک گئی۔ گھبراہٹ کے مارے جی چاہتا تھا کہ کار کے دروازے کھڑکیاں کھول کر باہر چھلانگ لگا دیں بے چارے واجد صاحب تو گھبرا گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اسپتال چلیں مگر ہم نے جاوید صاحب کے پاس جانے کو ترجیح دی۔ بہر حال' جیسے ہی ان کے پاس پہنچے' وہ ہماری شکل دیکھ کر ہی پریشان ہو گئے۔ فوراً سیون اپ میں دودھ ملا کر پیش کیا۔ ایک دو مختلف قسم کی گولیاں بھی کھلائیں۔ اس اثناء میں واجد صاحب نے فون کر کے ہماری بکنگ کینسل کرا دی۔ ان کا خیال تھا کہ کسی قریب چانس والے کو موقع مل جائے گا۔

آدھے گھنٹے بعد ہماری طبیعت سنبھل گئی اور ایک گھنٹے بعد تو ہم بالکل نارمل ہو گئے۔ مگر بکنگ کینسل ہو چکی تھی' اس لئے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جاوید صاحب نے اس مختصر سے موقع سے فائدہ اٹھا کر چند غزلیں سنا دیں اور ہم لوگ واپس ہوئے۔ گھر میں سب پیکنگ کر کے تیار بیٹھے تھے۔ الوداعی پارٹی بھی موجود تھی کہ واجد صاحب نے گھر پہنچتے ہی اپنی بیگم سے کہا "نازنین' رات کی دعوت کا بندوبست کرو۔ اس کے بعد ہم لوگ نیاگرا جائیں گے۔

وہ حیران رہ گئیں "کیا؟ مگر آج تو ان لوگوں کو سی آف کرنے ائرپورٹ جانا ہے۔"

واجد صاحب نے اعلان کیا "ان کا جانا کینسل ہو گیا۔"

پہلے تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ مگر اس کے بعد نئے سرے سے پروگرام بنائے گئے۔

رات کو ڈنر بھی ہوا اور چاندنی رات میں نیاگرا کی ایک بار پھر سیر کی گئی۔ مگر ہمیں واپسی کی بکنگ کی فکر تھی۔ پاکستانی ٹریول ایجنٹ نے تو ہینڈز اپ کروائے مگر پھر ایک کینیڈین خاتون کام آئیں اور چار دن ہماری سیٹیں ٹورنٹو سے لندن اور چار دن بعد وہاں سے کراچی کے لئے کنفرم ہو گئیں۔ چار دن بعد ہم ٹورنٹو سے طیارے میں بیٹھے تو سوچ رہے تھے کہ وہ بیماری کیا تھی اور اس کا سبب کیا تھا پھر وہ خود بخود ٹھیک کیسے ہو گئی؟ بہت سوچا۔ لبنیٰ سے بھی رائے لی مگر کوئی سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر لبنیٰ نے سوچ سوچ کر کہا "دراصل ٹورنٹو سے ہمارا آب و دانہ نہیں اٹھا تھا۔"

کہئے کیا آپ بھی آب و دانہ کی تھیوری پر یقین رکھتے ہیں؟